

Main Ne Pakistan Tot'tey Dekha

Ghalib Ahmed Yar Khan

میں نے پاکستان ٹوٹتے دیکھا

East Pakistan Secedes

Civil War Breaks Out

غالب احمد یار خان



MUJIBUR RAHMAN
... labeled a traitor

UTTO WANTS E. WING TALKS

l within
akistan
ndians must
uit first

New C-in-C: Yahya
6 others retired



Yahya hands

Must consult
my people



میں نے پاکستان ٹوٹتے دیکھا

میں نے پاکستان ٹوٹتے دیکھا

غالب احمد یار خان

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب	:	میں نے پاکستان ٹوٹتے دیکھا
مصنف	:	غالب احمد یار خان
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن ہاؤس کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	-/800 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ، 68-مزنگ روڈ، لاہور۔فون: 042-36307550-51,37249218

فکشن ہاؤس: 52-53 رابعہ سکوائر، حیدر چوک، حیدر آباد۔فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور، دوکان نمبر 5، اردو بازار، کراچی۔فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد ○

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

مراد غالب، خرم غالب

اور

عائشہ عثمان

کے نام

ترتیب

پیش لفظ

جو قوم تاریخ سے سبق حاصل نہ کرے اور اپنے ماضی کو یاد نہ رکھے وہ بار بار ماضی کی غلطیوں کا اعادہ کرتی ہے۔ ماہرین عمرانیات قوموں کے ماضی کو ان کی یادداشت سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو قوم اپنا ماضی بھول جائے وہ گویا اپنی یادداشت کھو بیٹھتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ قوم خود قصہ ماضی بن جاتی ہے۔ اسی لیے ماضی کو بہر صورت یاد رکھنا چاہیے۔

ہمارے لیے ماضی کا نہ بھولنے والا ایک سبق سانحہ مشرقی پاکستان ہے۔ یہ سانحہ اچانک رونما نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے برس ہا برس کے عوامل اور حادثات کارفرما تھے جو اس کے وقوع پذیر ہونے کا سبب بنے۔ یہ درست ہے کہ قوموں کی زندگی میں المیے اور حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں، قوموں کو فتح و شکست اور عروج و زوال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن زندہ قومیں اپنے ماضی اور اپنی شکست کو کبھی فراموش نہیں کرتیں اور اس سے سبق حاصل کرتی ہیں۔ ایسے ہی پاکستانی قوم سانحہ مشرقی پاکستان کو کبھی نہیں بھول سکتی البتہ اقتدار و اختیار کے ایوانوں میں براجمان ہمارے حکمرانوں نے اس سانحہ کو پرانا قصہ سمجھ کر ماضی کا حصہ ضرور بنا دیا ہے۔ اگر حکمرانوں نے اس سانحے کو یاد رکھا ہوتا تو آج ہمارا ملک ناگفتہ بہ حالات سے دوچار نہ ہوتا۔

قیام پاکستان کے فوری بعد مشرقی پاکستان کے عوام نے جان لیا تھا کہ جس

آزادی کی خاطر انہوں نے قربانیاں دیں وہ مغربی پاکستان کے ارباب اقتدار و اختیار کے ہاں گروی ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں خطوں کا جغرافیائی محل وقوع، معاشرتی اور سماجی ڈھانچے میں فرق، زبان کا تنازع اور صوبائی خود مختاری جیسے مسائل اندر ہی اندر چنگاری کی طرح سلگتے رہے۔ بھارت اس چنگاری کو ہوا دیتا رہا اور پھر ایک وقت آیا جب یہ چنگاری شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ مغربی پاکستان کا حکمران طبقہ ان مسائل کو سلجھانے اور سدھارنے کے بجائے ان کے الجھاؤ اور بگاڑ کا سبب بنا۔ جب یہ شعلہ بھڑکا تو سب کچھ راکھ ہو گیا۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا باعث بننے والے مسائل پیچیدہ اور لاینحل ہرگز نہ تھے مگر کوئی انہیں سلجھانے کو تیار ہی نہ تھا۔

بنیادی طور پر یہ کتاب پاکستان کی تاریخ کے ایسے واقعات کا احاطہ کرتی ہے جو بحیثیت قوم ہمارے زوال کا سبب بنے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے دولخت ہونے کے باوجود اب بھی ہمارا وہی وطیرہ ہے اور آج کے واقعات کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نصف صدی پہلے کے زمانے میں ہی جی رہے ہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں ہمیں بحیثیت قوم اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ 45 سال کا عرصہ گزرنے کے بعد آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہم نے اس سانحہ سے کیا سبق حاصل کیا؟ اور اب مزید کیا کرنا ہوگا؟ ہم سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان غلطیوں کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟ 1971ء میں ہم اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ آج بھی دشمن ہمیں اندر سے توڑنے اور کمزور کرنے کے درپے ہے۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ مشرقی پاکستان کا سانحہ پاکستانی قوم پر قرض ہے اور ہم نے یہ قرض نا صرف دفاعی اعتبار سے مضبوط ہو کر اتارنا ہے بلکہ علمی و معاشی اعتبار سے بھی طاقتور ہونا ہوگا۔ یہی اس سانحے کا سبق ہے۔

غالب احمد یار خان

E-18، ازمیر، لاہور

16 ستمبر

یہ 16 دسمبر 1971ء کی سہ پہر تھی۔

میں لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر واقع اپنے دفتر سے واپس گھر جا رہا تھا کہ بازار میں پان سگریٹ کی ایک دکان پر لوگوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں بھی اسی طرف ہو لیا۔ دکان پر بہت سے لوگ موجود تھے مگر حیرت انگیز طور پر سبھی خاموش کھڑے تھے۔ تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ یہاں ریڈیو پر کوئی خبر سن رہے ہیں۔ ساکت چہروں کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی کان ریڈیو کی جانب لگائے تو اناؤنسر کو خوشی کی خبر دیتے پایا۔ ریڈیو پر بتایا جا رہا تھا کہ لوگ بہت خوش ہیں، ایک دوسرے کو مبارک دے رہے ہیں، مسرت کے عالم میں رقص کر رہے ہیں اور مٹھائیاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔

ابتدا میں مجھے اس خبر کی نوعیت کا مطلق اندازہ نہ ہوا مگر کچھ ہی دیر میں صورتحال واضح ہونا شروع ہو گئی۔ ریڈیو پر بھارت کا احوال بیان کیا جا رہا تھا جہاں لوگ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی شکست اور بھارتی سینا کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور ذہن گویا ماؤف سا ہونے لگا۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ میں دکان سے ہٹ کر اپنی راہ ہو لیا مگر جاؤں تو جاؤں کہاں۔ دل و دماغ صدمے سے بوجھل تھے اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

یہ کیفیت محسوس کرنے والا شاید میں اکیلا آدمی نہیں تھا۔ میری طرح میرے سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں ہموطن بھی شاید اسی کیفیت میں تھے۔ سب کچھ نہایت ناقابل

یقین معلوم ہوتا تھا۔مملکت خداداد کے دولخت ہونے کا خیال ہی روح فرسا تھا۔زندگی میں دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی، دل گویا مردہ ہو گیا اور مستقل اندوہ طاری رہنے لگا۔کہیں لوگوں کو کسی موقع پر خوش ہوتے دیکھتا تو ذہن میں یہ سوال ابھرتا کہ آیا ہمیں خوشی منانے کا کوئی حق ہے؟ ایسی صورتحال میں بھی کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟ پاکستان کا دولخت ہونا ایسے ہی تھا جیسے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہو۔شاید کوئی جسمانی عضو کٹ جانے کی صورت میں اس قدر تکلیف اور دکھ نہ ہوتا جس قدر دکھ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش بننے کی صورت میں محسوس ہوا۔بے بسی، بے چارگی، ذلت اور رسوائی کا یہ احساس شاید ہی کسی کو ہوا ہوگا۔

میں ہی نہیں بلکہ اس سانحے پر ہزاروں لاکھوں آنکھیں اشک بار تھیں۔دل غم سے معمور تھے اور سینہ درد کی شدت سے پھٹا جاتا تھا۔پاکستانی کہلانے والے کروڑوں افراد چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔سقوط مشرقی پاکستان ایک ایسا دردناک اور اندوہناک واقعہ تھا جس نے پاکستانیوں کے قلوب و اذہان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔انتھک محنت اور لاکھوں قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک دولخت ہو چکا تھا۔

بلاشبہ اسے سقوط بغداد اور سقوط غرناطہ جیسے دردناک واقعات سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔ہمارے مشرقی بازو کی ہم سے علیحدگی پر اس وقت کی بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کا کہنا تھا کہ ”یہ فتح ہماری افواج کی فتح نہیں بلکہ ہمارے نظریے کی فتح ہے۔ہم نے ثابت کر دیا کہ ان کا نظریہ باطل تھا۔ہم نے ان کا نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے لیا ہے“

تمام اقوام کی زندگی میں ہزیمت کے ایسے ایام آتے ہیں، لیکن ایسے مواقع پر تمام زندہ قومیں اپنی غلطیوں کا جائزہ لے کر آئندہ انہیں نہ دہرانے کا عزم کرتی ہیں۔سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ ہماری تاریخ کا بدترین المیہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس سانحے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔44 سال بعد بھی ہم نے اس سانحے کا جائزہ لے کر اپنی

منزل کے از سر نو تعین کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہم نے بحیثیت قوم اپنے اندر اس احساس کو جنم ہی نہیں لینے دیا کہ ہماری ناکامیوں کا مداوا اور ترقی کا راز ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ملک دولخت ہونے کے بعد ہمارے سینے مسلسل سلگتے رہنا چاہیے تھے اور شکست کا داغ دھونے نیز باقی ماندہ پاکستان کو دنیا کا سب سے عظیم خطہ بنانے کے لیے ہمیں دن رات ایک کر دینا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ہم نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

حصول پاکستان کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال، عزت اور آبرو کی بے پایاں قربانیاں دی تھیں۔ مجھے تقسیم برصغیر سے قبل اپنا ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ'' اور ''بن کے رہے گا پاکستان'' کا نعرہ لگانا بھی یاد ہے جبکہ اس وقت ہم کمسنی کے عالم میں پاکستان کے مفہوم سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ تاہم جب پاکستان بن گیا اور ہم نے شعور کی منازل طے کرنے کے بعد اپنے بچپن کی اس محبت کو دیکھا اور سمجھا تو اس کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا عہد کیا۔ ہم نے پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے کیا کیا خواب نہیں دیکھے تھے، مگر وائے افسوس کہ 16 دسمبر کا دن ہمارے تمام خوابوں کو کرچی کرچی کر گیا۔

ہمارے خواب کیونکر ٹوٹے؟ ہماری نسل اور آنے والی نسلیں اس سوال کے جواب کی تلاش میں سرگرداں رہی ہیں۔ مشرقی پاکستان کا سقوط اور بنگلہ دیش کا قیام ایک مخصوص پس منظر اور لمبی تاریخ رکھتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اتنا عرصہ بیت جانے کے باوجود اس سانحے کے حوالے سے درست حقائق پاکستانی عوام کے سامنے نہیں آ سکے۔ اس سانحے کو رونما ہوئے چار دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور آج بھی وطن عزیز کے حالات دیکھتے ہوئے ہمارا دل اطمینان کے بجائے تشویش اور ملال سے بھر جاتا ہے۔ ایسے میں ہم تاریخ سے رہنمائی لینے کے لیے ماضی کی جانب پلٹتے ہیں تاکہ یہ جان سکیں کہ پاکستان کیوں ٹوٹا۔ مگر اس سوال کا جواب حاصل کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ پاکستان کیوں اور کیسے بنایا گیا تھا۔

پاکستان کیوں بنا؟

پاکستان کی بنیاد دوقومی نظریے پر رکھی گئی ہے۔ قیام پاکستان کے پس منظر میں جھانکیں تو ہمیں دوقومی نظریے کی تفصیل، تعریف اور صحیح معنوں میں افادیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ دوقومی نظریہ ہی درحقیقت نظریہ پاکستان ہے۔ یہ نظریہ وہ مطمح نظر ہے جس کی بنیاد ایک مخصوص نظریے یعنی اسلام پر رکھی گئی ہے جو اپنی تہذیب وثقافت، اقدار وروایات اور اپنا سیاسی ومعاشی نظام فکر رکھتا ہے۔

برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو اپنی شناخت اور پھر دوقومی نظریے کی بنیاد پر جداگانہ ریاست کی ضرورت یوں شدت سے محسوس ہوئی کہ ان کے ساتھ موجود ایک دوسرے نظریے کے حامل افراد جو مسلمانوں کے توحید اور انسانی مساوات کے نظریہ حیات کے برعکس بت پرستی اور ذات پات کے قائل تھے، انہیں اپنے اندر جذب کر کے اپنے نظام فکروعمل کا حصہ بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے برعکس اس خطے میں بسنے والی ملت اسلامیہ اپنے قومی تشخص اور علیحدہ شناخت کو چھوڑنے کے لیے کسی صورت تیار نہ تھی۔ یہ ملت اسلامیہ اپنے نظام فکر کو نا صرف قائم رکھنا چاہتی تھی بلکہ عملی طور پر اس کے ظہور کی بھی خواہش مند تھی۔ دونوں اقوام میں یہی امتیازی خصوصیات دوقومی نظریے کی بنیاد ہیں جو محض نظریہ ہی نہیں بلکہ روزمرہ پیش آنے والی حقیقت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے فرزندوں نے ایسے علاقوں پر مشتمل علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ ایک اللہ ایک قرآن اور ایک رسولؐ کے ماننے والے افراد ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے تھے کہ اس سے

الگ ہونا موت کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر شروع کی گئی تحریک ایک مردِ مومن کی خداداد بصیرت، انتھک محنت اور پرعزم حوصلے کی بدولت منزل مراد تک پہنچی۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کی زندگیاں بھی ان ثمرات سے بہرہ ور ہوں جو اسلامی نظام فکر کی دین ہے۔ اسلام آزادیٔ فکر و عمل، عدل و اخوت اور مساوات کا دین ہے اور جس کے نفاذ سے قرونِ اولیٰ کے مسلم معاشروں کو دنیا بھر کے مثالی معاشروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان بھی اپنی زندگیاں اس عظیم معاشرتی سانچے میں ڈھالنے کے آرزومند تھے اور یہ عظیم معاشرتی سانچہ انہیں ایک علیحدہ اسلامی ریاست کی شکل میں ہی میسر آ سکتا تھا۔

ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار، مذہب و سیاست اور تاریخ و ادبیات مسلمانوں سے یکسر مختلف تھیں۔ ان کے درمیان شادی بیاہ کا ہونا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے تھے۔ یہ دونوں قومیں دو مختلف تہذیبوں کی علمبردار تھیں جو ایک دوسرے کی ضد تھیں۔

ظاہر ہے کہ جب مسلمان اپنی جداگانہ تہذیب و اقدار اور مذہب و روایات کے لحاظ سے ایک مختلف تشخص کے حامل تھے تو انہیں اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ آئے دن کے نظریاتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی تصادم سے نجات حاصل کریں۔ یہی علیحدہ تشخص کی خواہش دراصل دوقومی نظریے کی اصل ہے۔ یعنی جنوبی ایشیا میں مسلمان ہر لحاظ سے ایک علیحدہ شناخت اور پہچان کی حامل قوم ہے جس کا کوئی انگ، ڈھنگ یا رنگ ہندوؤں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اسی دوقومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسا وطن جس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو، جو اسلامی معاشرے کی تشکیل کا محور ہو، جہاں ہندوؤں کی تنگ نظری اور معاشی استحصال کا کوئی وجود نہ ہو، جہاں پرامن فضا میں مسلمانوں کی جان و آبرو اور مال و متاع محفوظ ہو، جہاں ان کے زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں

ہندو تعصب اور تنگ نظری آڑے نہ آتی ہو۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قومیت کا مفہوم

دو قومی نظریہ کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ان تمام سوالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے معنی و مفہوم کے بارے میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا کے مطابق قومیت عام صفات اور متعدد اوصاف کا مرکب ہے جو ایک گروہ میں شامل افراد کا خاصہ ہوتے ہیں۔ ایسا گروہ جو نسل، روایات اور مشترکہ مفادات، عادات اور رسوم کا حامل ہو وہ ایک قوم کہلاتا ہے۔

مغربی مورخ ڈیوڈ رابرٹس نے قوم کو افراد کے ایسے مجموعے سے تعبیر کیا ہے جسے چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ اس کے دو عناصر ہیں جن میں نسل اور مذہب کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشترکہ لٹریچر سے دلچسپی، ماضی کے مشترکہ کارناموں اور مصائب کی یادیں، رسوم و عقائد، مقاصد اور عزائم افراد کو باہم پیوست و مربوط رکھتے ہیں، یعنی ایک قوم بناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ افراد کا وہ گروہ جس کا مقصد حیات ایک ہو، قوم کہلاتا ہے۔

دو قومی نظریہ: تاریخی پس منظر

حضرت آدم سے لے کر اب تک دنیا میں دو قسم کے انسانوں کا گروہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو دنیا میں امن و سلامتی، ترقی و استحکام کا خواہاں ہے جبکہ دوسرا گروہ شر و تباہی کا علمبردار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی بقا و اصلاح کے لیے اپنے منتخب بندوں یعنی پیغمبروں کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ اپنی سیرت و کردار سے لوگوں کی اصلاح کریں۔ جو لوگ فطرتاً اصلاح پسند تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو سمجھا اور انبیا کے

اس عظیم مشن میں ان کا ساتھ دیا لیکن شر پسند جماعت کے افراد نیک لوگوں اور ان کے مشن کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ خیر و شر کی یہ جنگ اب تک جاری ہے۔

اسلام کے عالمگیر نظریہ قومیت کی بنیاد صرف مذہب یعنی اسلام پر ہے۔ اسلام کی نظر میں نسل و زبان، علاقائیت کی بنیادیں اور تمام امتیازات باطل و غیر ضروری ہیں۔ مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست میں اگرچہ یہودی، عیسائی اور بت پرست بھی رہتے تھے مگر نبی کریمؐ نے یہاں جو قوم تشکیل دی اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی۔

دنیا بھر کے مسلمان ایک وسیع اخوت اور بھائی چارے کے احساس میں منسلک ہیں۔ وہ ایک نصب العین کو پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایک خدا کے عقیدے پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ، خون، نسل اور جغرافیائی حدود کے ایک ہونے پر نہیں ہے۔ اسلام کی دعوت کسی فرق و امتیاز کے بغیر ساری نوع انسانی کے لیے ہے۔ اسلام بنی آدم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے جو کائنات کی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ نسل یا قبیلے میں پیدائش کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں بلکہ اللہ کی نظر میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ ''کفر ملت واحد ہے'' یعنی کافر دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں وہ اسلام کے نظریات کے مخالف ہیں۔ اسلام کی عظمت، آفاقیت اور حیران کن جاذبیت سے ملت کفر ہمیشہ خائف رہی۔ اسلام سے متعلق ابہام و شکوک پیدا کرنے کے لیے تحریکیں چلیں، کتابیں، قصے اور فلمیں بنائی گئیں لیکن اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔

چونکہ مسلمانوں کی ہدایت کا واحد ذریعہ قرآن و سنت ہے، لہٰذا اس رو سے بھی دیکھا اور پرکھا جائے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے قرآن میں فرمایا ہے کہ کافروں کا

دین ان کے لیے اور مومنوں کا دین ان کے لیے ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''کہہ دیجیے کہ جسے تم پوجتے ہو اسے میں نہیں پوجتا اور جس کی عبادت میں کرتا ہوں اس کی عبادت تم نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے دوقومی نظریے کی بنیاد ازل سے ہی چلی آ رہی ہے۔

ہندومت کا نظریہ قومیت

جب آریا ہندو برصغیر میں داخل ہوئے تو ان کے مذہبی تصورات نہایت سادہ تھے۔ انہی تصورات وعقائد کو ان کی مذہبی کتابوں (ویدوں) میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے بعد جو زمانہ آیا اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ یعنی برہمنوں کی مذہبی حکمرانی قائم ہو گئی اور انہوں نے اپنی برتری کے جواز میں جو مذہبی کتابیں ترتیب دیں انہیں برہمنا کہا گیا۔ برہمنا کا بدھ مت اور جین مت کی کتابوں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں واقعات وحالات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے اور قدیم ویدی عقائد میں اس طرح ترمیم کی گئی ہے جس سے برہمنوں کی پیشوائیت کا تسلسل ثابت ہو۔

ویدوں میں ان بڑی بڑی ارواح کو الوہیت کا جامہ پہنایا گیا جو فطرت اور اس کے مظاہرہ وقویٰ کی نگران ہیں لیکن ارواح سفلی، جن سے لوگ ڈرتے تھے اور جنہیں راضی رکھنے کے لیے پوجا پاٹ کرتے تھے ان کا ویدوں میں کوئی ذکر نہیں۔ ویدک مذہب میں ہر اس شے کو معبود قرار دیا جاتا تھا جس سے انسانی ذہن پر ہیبت طاری ہو جاتی ہو یا جس سے خوف اور امید کے جذبات وابستہ ہو جائیں۔ زمین، آسمان، پہاڑ، دریا اور پودے قابل پرستش سمجھے جاتے تھے۔ گھوڑے، گائے، پرندوں اور دوسرے جانوروں سے بھی مرادیں طلب کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود انسان کی بنائی ہوئی چیزوں جیسے ہتھیار اور طبل وغیرہ کی عبادت بھی کی جاتی تھی۔

ویدمذہب کی ایک خصوصیت ارواح پرستی ہے۔ اس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ عالم

میں ایک یا بہت سی طاقتیں کارفرما ہیں۔ یہ طاقتیں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور بڑے بڑے درختوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ ان میں خیر کی نسبت شر کی صلاحیت زیادہ ہے اسی لیے انہیں راضی رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔

تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی جسے ہندوؤں کا رہنما قرار دیا جا سکے یا جسے اس مذہبی نظام میں مرکزی اہمیت حاصل ہو۔ اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو بھی کسی ایک شخصیت کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ ہندوؤں کے مذہبی نظام کی تشکیل میں لاتعداد اشخاص کا حصہ ہے اس لیے اس میں کوئی واحد عقیدہ نہیں ہے۔ مذہبی قوانین، رسوم و شعائر کی عدم یکسانیت، عقائد کی بوالعجبی، طریق عبادت سے اختلاف اور معبودوں کی کثرت کے باعث یہ مذہب ایک گنجان جنگل کی طرح ہے جس میں ہزاروں رستے ہیں لیکن کوئی راستہ صاف اور سیدھا نہیں ہے۔

سکندرِ اعظم کے عہد میں بہت سے ایرانی ہندوستان میں آ کر بس گئے تھے جو سورج کی پرستش کرتے تھے اور برہمنوں نے انہیں اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ انہی کے اثر سے ہندوستان میں سورج اور آگ کی پرستش کا آغاز ہوا۔ ہندو مذہب کی بے یقینی کی صورت حال کا صحیح پس منظر پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے سے عیاں ہے۔ وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

> ''ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں، اسی لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا''

پنڈت نہرو اپنی ایک اور کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں ہندو ازم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندو ازم بحیثیت ایک عقیدہ بالکل مبہم، غیر متعین اور بہت سے

گوشوں والا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات
مل جاتی ہے۔اس کی جامع اور مکمل تعریف ممکن نہیں۔ حتمی طور پر یہ
بھی کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں، یہ اپنی موجودہ
شکل میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے"

ہندوؤں کی کوئی تاریخ کہیں بھی محفوظ نہیں ہے اور جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ مورخین کے مطابق 1200ء سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایسی کوئی قابل ذکر کتاب نہیں ملتی جس کو تاریخ کی کتاب کہا جا سکے یا کوئی ایسی کتاب جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں اور ہندوؤں کی تاریخ کا اندازہ ہو سکے۔

ہندومت کا طبقاتی ڈھانچہ

ہندو مذہب یا دھرم کی تمام عمارت انسانی تفریق، چھوت چھات اور توہمات پر کھڑی ہے جس کا بنیادی پتھر ذات پات کا نا قابل تقسیم اور نا قابل تنسیخ نظام ہے جبکہ عقائد اس میں قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب کے مطابق یہ قوم چار ذاتوں پر مشتمل ہے جن میں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر شامل ہیں۔ ہندوؤں کے مطابق برہمن ''برہما'' کے سر سے پیدا ہوا، سر چونکہ جسم کا سب سے افضل اور بہتر حصہ ہوتا ہے، اس لیے یہ قوم پیدائشی طور پر سب انسانوں سے افضل و برتر سمجھی جاتی ہے۔ کھشتری برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوا، ویش برہما کے پیٹ سے نکلا جبکہ شودر برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا اور اچھوت کہلایا جس کی حیثیت ہندومت میں جانوروں سے بھی کمتر ہے۔

ہندوؤں نے ذات پات کی اہمیت و تعریف یوں بیان کی ہے کہ اس کے تحت معاشرہ متعدد خود کفیل اور مکمل طور پر الگ الگ ذاتوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان ذاتوں کے

باہمی تعلقات مذہب کی رو سے مرتبے کے فرق کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ ہندو مذہب میں چھوت چھات کا کس قدر عمل دخل ہے، اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ہی قوم کے چوتھے درجے کے ہندو یعنی شودر (دلت) کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

ہندوؤں کا شودروں، غیر ہندوؤں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ انداز معاشرت اور ہندو مذہب کی تاریخ اور مخصوص سوچ کے بارے میں مزید وضاحت البیرونی کی مشہور کتاب ''کتاب الہند'' کے ایک اقتباس کی روشنی میں بہتر انداز میں ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں دو قومیں آباد تھیں جن کو بالآخر دو قومی نظریے کی بنیاد پر الگ الگ وطن کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔

البیرونی لکھتے ہیں کہ:

> ''مسلمانوں کو یہ ملیچھ (ناپاک) کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ مسلمانوں سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، قریب رہنا، مل کر بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کسی مجبوری کے تحت ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ ملانا پڑ جائے تو اپنے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دل میں نفرت کا جولا وا پک رہا تھا، یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے، ذلیل و خوار کرنے، نفرت سے دور رکھے اور قتل و غارت سے نیست و نابود کرنے کو ایک اہم مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں''

درحقیقت اسلام کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اس کی توحید پر ہے۔ جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہو یا جن الہامی مذاہب میں انسانوں نے ذاتی مفاد کی خاطر تحریف کر دی ہو ان میں خدا کا تصور انسانی ذہن کا تراشیدہ ہوگا اور چونکہ ذہن انسانی محسوسات سے

آگے نہیں بڑھ سکتا اس لیے ان کا تخلیق کردہ خدا بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوگا۔

دوقومی نظریے کا ارتقا

1761ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا جس سے ان کی بقا اور سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ اسلامی حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کردیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں مرکزیت ختم ہونے کے سبب ان کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ روہیل کھنڈ، جنوبی ہند، حیدرآباد، بنگال، اڑیسہ اور پنجاب میں چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں جبکہ مرکزی حکومت کا دائرۂ عمل صرف دہلی کے لال قلعے تک محدود تھا۔

ان حالات میں ایک مرد خدا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلمانوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے ملکی حالات کا جائزہ لیا اور یہاں کے حکمرانوں میں جہاد کی صلاحیت نہ پاکر احمد شاہ ابدالی کو مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ اگرچہ اس جنگ میں مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل ہوئی لیکن برصغیر کے مسلم حکمرانوں نے اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھایا اور نہ ہی باہمی یگانگت اور اتحاد و سلامتی کی کوئی مربوط کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کے اس دورِ زوال میں بہت سے مجاہدین نے ان کی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ تیتو میر شہید کی فرائضی تحریک کے ساتھ ساتھ شاہ اسماعیل اور سید احمد بریلوی نے جہاد کا آغاز کیا۔ یہ تحریکیں جذبہ جہاد سے معمور اور انگریزوں اور سکھوں کے خلاف تھیں۔ دوسری جانب نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان شہید نے غیر ملکی و غیر مسلم سامراج کے خلاف جرات و بہادری سے دادِ شجاعت دی۔ اسی عزمِ جہاد نے ثابت کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اپنا قومی تشخص انہیں جان سے پیارا ہے۔ مغلوں کے زوال کے بعد اصلاحی تحریکوں اور مسلم ریاستوں کے نوابوں نے مشرکین سے

جہاد کیا۔ اس سے ملت اسلامیہ کے تصور قومیت اور اتحاد کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہی وہ محرکات تھے جو جداگانہ اسلامی تشخص سے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے جداگانہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے مشعل راہ بنے۔

انگریز سامراج 1600ء میں تجارت کے لیے برصغیر آیا اور ڈھائی سو سال کے عرصہ میں پورے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ابتدا میں انگریز برصغیر میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو یہاں کی دولت سمیٹ کر برطانیہ لے جانے کی کوشش میں تھا۔ اس نے کہیں سے تاوان کی صورت میں دولت سمیٹی تو کہیں سے جرمانے عائد کر کے اور کبھی دھونس دھاندلی سے مال کمایا۔ اس دوران وہ مسلمانوں سے خائف بھی رہا۔ انگریز سمجھتا تھا کہ برصغیر میں اسے مسلمانوں سے ہی زک پہنچ سکتی ہے، اس لیے کہ اس نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ انگریز یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ ہندوؤں کی سرشت میں چالاکی، عیاری، بغض، کینہ پروری، دھوکا دہی سمیت سب کچھ شامل تھا جس کا انہوں نے ہر موقع پر اظہار کیا۔ انہیں جب مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا تو انگریز کے خلاف ہو جاتے اور جب انگریز کو بلیک میل کرنا ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو بھڑکاتے اور اپنا مفاد حاصل کر لیتے تھے۔

انگریز ہندوؤں کی اس خوشامد سے پوری طرح واقف تھا۔ اسلامی حکومت کے خاتمے نے مسلمانوں میں سیاسی فوقیت، اخلاقی عظمت اور معاشی حالت کو انتہائی کمزور کر دیا تھا۔ اس سانحے نے مسلمانوں کو حقیقی طور پر متاثر کیا۔ ہندو تو شروع سے ہی غلامی کے عادی تھے اس لیے انہیں اس کا قطعاً کوئی احساس نہ ہوا۔

مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ شاندار ماضی اور اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں اور تہذیبی اقدار کو بھول جائیں۔ اس عالم مایوسی میں اللہ تعالیٰ نے سرسید احمد خان

جیسی شخصیت کو منتخب کیا جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا۔ انہوں نے علی گڑھ میں دینی و دنیاوی تعلیم کا اکٹھے آغاز کیا۔ آپ کی تحریک نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چالوں اور انگریزوں کے حملوں سے محفوظ رکھا اور مسلمانوں میں سیاسی و تعلیمی شعور بیدار کیا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمان تحریک پاکستان کے قائدین بنے جنہوں نے ہندو مہاسبھا نامی متعصب ہندو جماعت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اسی دوران انگریزوں نے مغربی جمہوریت کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے متعارف کرایا اور یوں ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ برصغیر میں دیگر اقلیتوں کے مقابلے میں وہ اکثریت میں ہیں۔ لہٰذا حکمرانی کا پہلا حق بھی انہی کا ہے۔ ہندوؤں کو یہ بات پوری طرح سمجھا دی گئی کہ عددی اکثریت کے بل بوتے پر وہ انگریزوں کے توسط سے ہی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پالیسی کا مرکز برصغیر میں حصول اقتدار کو ہی بنایا اور وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے حصول کے لیے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ ہندوؤں کو مسلمان حکمرانوں کی ہزار سال پر محیط تمام مہربانیاں ظلم و ستم لگنے لگیں اور انہوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں انہیں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی جس کا ثبوت دیگر تنظیموں اور تحریکوں کے علاوہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا قیام بھی تھا جسے حکومت برطانیہ کے ایما پر ایک انگریز لارڈ ہیوم نے ہندوؤں کے مفادات کے حصول کے لیے قائم کیا تھا۔

ہندوستان میں جتنی بھی ہندو تحریکیں شروع ہوئیں وہ سوراج (آزادی) کے حصول سے زیادہ مسلمانوں کو شدھ کرنے کی تحریکیں تھیں۔ ہندو مہاسبھا، دیو سماج، آریہ سماج، شدھی اور سنگھٹن کے علاوہ ودیا مندر اور واردھا سکیم جیسی تعلیمی تحریکوں کا مقصد بھی برصغیر کے مسلمانوں کو ہندومت میں شامل کرنا تھا۔ کانگرس رہنماؤں کے بیانات کہ مسلمان بدیسی ہیں، اس لیے یا تو وہ ہندوستان سے نکل جائیں یا دوبارہ ہندومت میں شامل ہو

جائیں ،اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام تحریکوں کا پس منظر محض اس بات میں پوشیدہ تھا کہ ہندو اس ملک کی آزادی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہندوؤں اور ان کے بڑوں کے نزدیک مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد تھے یا وہ لوگ تھے جن کے اجداد کبھی ہندو تھے لیکن بعد میں وہ مسلمان ہو گئے۔ اس لیے انہیں ساتھ ملانے کے لیے تین طریقے مناسب سمجھے جاتے تھے جن میں مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر کے ہندو دھرم میں لانا، مسلمانوں کو واپس عرب بھیج دینا اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو انہیں غلام بنا کر رکھنا شامل ہیں۔

مسلمانوں سے ہندوؤں کے ناروا سلوک کی ایک جھلک کانگرسی حکومتوں کے ادوار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی کانگرسی وزارتوں نے مسلمانوں کے خلاف تعصب اور تنگ نظری کی انتہا کر دی تھی۔ اس دوران کانگریس کے ترنگے کو قومی پرچم کی حیثیت دے دی گئی۔ بندے ماترم کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی، ہندی اردو تنازعے کو ابھارا گیا اور اردو کا تشخص ختم کرنے کے لیے ہندی کی سرپرستی کی گئی۔

اس سے پہلے 1867ء میں بھی بنارس میں ہندوؤں کی جانب سے ہندی زبان مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اب موقع ملتے ہی ہندوؤں نے پوری قوت سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کر دیا۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا گیا۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تعلیم کے حصول کو واردھا سکیم کا نام دیا گیا اور سکولوں کا نام ودیا مندر رکھ دیا گیا۔ سکولوں میں گاندھی کی مورتی پوجا کے لیے رکھی گئی۔ مسلمانوں کو بھی اس مورتی کے آگے جھکنا پڑتا تھا۔ مساجد کے باہر ناقوس اور ڈھول بجائے جاتے تھے۔ مسلم تہواروں خصوصاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فسادات کی آگ بھڑکائی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے مقدس مزارات اور قرآن مجید کی بے حرمتی ہونے لگی اور معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

گئی۔ مسلمان پہلے ہی معاشی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ معاشی اعتبار سے مسلمان جن شعبہ جات سے منسلک تھے ان پر بھاری محصولات اور ٹیکس عائد کر دیے گئے۔ یہ ٹیکس اور محصولات جبری وصول کیے جاتے تھے۔ نتیجتاً مسلمان روز بروز کمزور ہونے لگ گئے جبکہ ہندوؤں پر نوازشات کی بارش جاری رہی۔

برصغیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے الگ الگ ملک کا تصور بہت سے لوگوں نے پیش کیا تھا جن میں سلطان شہاب الدین غوری، جان برائٹ، سرسید احمد خان، ولفرڈ سکوون بلنٹ، بدرالدین طیب جی، مولانا عبدالحلیم شرر، ولایت علی، چودھری رحمت علی، خیری برادران، سر آغا خان، نادر علی، سردار گل محمد خان، بھائی پرمانند، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، لالہ لاجپت رائے، نواب سر قاضی عزیز احمد بلگرامی، مولانا اشرف علی تھانوی، مرتضیٰ احمد خان میکش، ذوالفقار علی خان، فضل کریم درانی، علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر سید ظفرالحسن، ڈاکٹر افضال احمد قادری، میجر کفایت علی، ڈاکٹر عبداللطیف، سر سکندر حیات خان، چودھری خلیق الزماں، سر عبداللہ ہارون اور سر فیروز خان نون نمایاں ہیں۔ تاہم ان میں علامہ محمد اقبال کے تصور پاکستان کو زیادہ شہرت ملی اور اسی تصور کو قیام پاکستان کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کے الگ وطن کی بابت کہا تھا کہ ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس سے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی''

اس سے پہلے انہوں نے دو قومی نظریے کے حوالے سے دوٹوک انداز میں بات کرتے ہوئے کہا کہ ''مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں صرف

ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال وافعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہوسکتا جو ایک نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے"

علامہ اقبال کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کا علیحدہ تشخص ہو اور مسلمان ایک قابل قدر قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کے نزدیک سب سے بہترین حل یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو جہاں وہ اپنے دین اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

علامہ اقبال 1931ء اور 1932ء میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا یعنی مسلمان ایک علیحدہ تشخص کے حامل ہیں اس لیے ایک الگ سرزمین ہی ان کی بقا کی ضامن ہوسکتی ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کی قائداعظم کے ساتھ بھی خط وکتابت رہی۔ 1937ء میں قائداعظم کے نام خط میں علامہ اقبال نے لکھا کہ "ہندوستان کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ملک کو ایک سے زیادہ خودمختار ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے"

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی الگ قومیت کے نظریے کو اجاگر کیا جو مسلمانوں کے لیے آزاد اور خودمختار مملکت کے حصول کی بنیاد قرار پایا۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "جہاں تک دوقومی نظریے کا تعلق ہے تو یہ محض ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ دیگر باتوں سے قطع نظر اس حقیقت کی تصدیق حکومت ہندوستان کے اس اقدام سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے پاکستان سے ہندوؤں کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں صرف ایک قوم رہتی ہے۔ کچھ دیگر حالات وواقعات بھی اس حقیقت کی تصدیق

کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مملکت خالصتاً ایک ہندو مملکت ہے"

تحریک پاکستان کے سلسلے میں یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ صوبے جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اوران کو یہ یقین تھا کہ ان کے علاقے پاکستان کا حصہ نہیں بن سکیں گے ، انہوں نے بھی دوسرے مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ دوقومی نظریہ تحریک پاکستان کی روح اور قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔ قائداعظم پاکستان کواسلام کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے تا کہ پاکستان اتحاد عالم اسلام کا داعی بنے اور مسلم ممالک کومتحد کرے۔

پاکستان کیسے بنا؟

1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد برصغیر میں خاص طور پر مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔ چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اور جنگ آزادی میں بھی مسلمان ہندوؤں کے ساتھ پیش پیش تھے اس لیے انگریزوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی نظر مذکور کر لی۔ ہزاروں مسلمانوں کو بے دردی سے پھانسی دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور حکومتی پالیسیاں کچھ اس انداز میں بنائی گئیں کہ مسلمانوں کا کاروبار تباہ ہونے لگا۔ وہ مسلمان جو عالیشان زندگی گزارتے تھے وہ اب افلاس کا شکار ہو گئے۔ انگریز نے ملک میں انگریزی تعلیم رائج کر دی۔ چونکہ مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم نہیں دلوانا چاہتے تھے اس لیے وہ کاروبار زندگی میں ہندوؤں سے مزید پیچھے رہ گئے۔

انگریزوں نے سکولوں سے عربی و فارسی ختم کر کے انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے خلاف کئی مزید ایسے اقدامات کیے گئے جن سے ان کی معاشی حالت مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی جذبات بھی مجروح ہونے لگے۔ انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں ملتی تھی۔ قصہ مختصر اس وقت ہندوستان کے مسلمان تعلیمی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی طور پر زوال پذیر تھے اور دوسری جانب ہندو قوم انگریز کی چاپلوسی کر کے اور راجہ رام موہن رائے جیسے رہنما کی بدولت انگریزی تعلیم پا کر انگریز حکمرانوں کی منظور نظر بن گئی۔

اسی دوران کٹھ پتلی حزب اختلاف اور ہندو مفاد پرست جماعت کی تشکیل کے لیے انگریز قانون دان لارڈ ہیوم نے آل انڈیا کانگریس بنائی جو بظاہر تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت تھی مگر حقیقت میں وہ صرف ہندومت کی نمائندگی کرتی تھی اور اس کے سرکردہ ہنماؤں کا مقصد انگریز کی واپسی کے بعد ہندوستان میں ہندو راج قائم کر کے مسلمانان ہند کو اپنا غلام بنانا تھا۔ ایسے ہی اقدامات کے ردعمل میں مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے 1906ء میں ڈھاکا کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی۔

مسلم لیگ کا قیام ڈھاکا میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے اختتام پر عمل میں آیا۔ اس اجلاس کے میزبان ڈھاکا کے نواب سلیم اللہ خان تھے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی جائے۔ نواب وقارالملک کی صدارت میں ہونے والے اس اجلاس میں نواب محسن الملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور حکیم اجمل خان سمیت بہت سے اہم مسلم اکابرین موجود تھے۔ مسلم لیگ کا پہلا صدر سر آغا خان کو چنا گیا جبکہ مرکزی دفتر علی گڑھ میں قائم ہوا۔ تمام صوبوں میں اس جماعت کی شاخیں قائم کی گئیں جبکہ لندن میں بھی دفتر کھولا گیا جس کے صدر سید امیر علی تھے۔ اس سے قبل سر سید احمد خان کی علمی تحریک کی بدولت مسلمان سیاسی شعور سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ سر سید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے محض نصیحت ہی نہیں کی بلکہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولیات بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے، سائنس، جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔ سر سید نے انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے زینہ قرار دیا تا کہ وہ ہندوؤں کے مساوی معاشرتی درجہ حاصل کر سکیں۔

سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ تحریک

سرسید نے زیادہ زور جدید تعلیم پر دیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ جدید تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل بالکل تاریک ہے۔ سرسید کی دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی نے جو رخ اختیار کر لیا ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے انہوں نے تمام توجہ جدید تعلیم کے فروغ پر مرکوز کر دی۔ سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد ہی اہم اپنے ہم وطنوں کو جدید علوم سے روشناس کرانا تھا۔ سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ یورپ جس راستے پر جا رہا ہے اور جو تعلیم حاصل کر رہا ہے وہی راستہ اور تعلیم مستقبل کی ترقی کی گارنٹی ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ درسگاہیں کیسی ہیں اور ان کا نظام تعلیم کیا ہے۔ اسی لیے وہ خود برطانیہ گئے اور وہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھا، تعلیمی اداروں میں رہے، اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ انگلستان کی ہر چیز نے انہیں متاثر کیا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے اس خیال سے دور دراز سفر اختیار کیا کہ اس قوم کا احوال دیکھوں جو ہماری نسبت کہیں آگے ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ دیکھنے کے لائق تھا۔ میں نے جب بھی کوئی عمدہ چیز دیکھی، عالموں کو دیکھا، علمی مجلسیں دیکھیں، عمدہ مکانات دیکھے اور ہر شے میں سلجھاؤ دیکھا تو مجھے اپنا ملک اور قوم یاد آئی اور رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں''

انگلستان سے واپسی پر سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی جس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کے قیام پر کام شروع کیا۔ اس کمیٹی کو محمڈن کالج کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی نے ایک فنڈ کمیٹی قائم کی جس نے ملک کے طول و عرض سے کالج کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ اس سلسلے میں حکومت سے بھی امداد کی درخواست کی گئی۔

علی گڑھ کالج

بالائی سطور میں بیان کیا گیا ہے کہ 1875ء میں انجمن ترقی مسلمانان ہند نے علی گڑھ میں ایم اے او ہائی سکول قائم کیا۔ اس ادارے میں جدید اور مشرقی علوم پڑھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ 1877ء میں اس سکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا جس کا افتتاح لارڈ لٹن نے کیا۔ یہ رہائشی کالج تھا جہاں تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ سرسید کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلا دیں۔ یہ کالج سرسید احمد خان کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرسید احمد خان نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اقدامات کرنا تھا۔ اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ کانفرنس نے تعلیم کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر جلسے کیے۔ ہر شہر اور قصبے میں اس کی ذیلی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس کانفرنس کی کوششوں سے مسلمانوں کے اندر تعلیمی جذبہ اور شوق پیدا ہوا۔ اس کانفرنس نے ملک کے ہر حصے میں اجلاس منعقد کیے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس کانفرنس کے سربراہوں میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی جیسی ہستیاں شامل تھیں۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ مختلف شہروں میں ہوتا تھا جہاں مقامی مسلمانوں سے مل کر تعلیمی ترقی کے اقدامات پر غور کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے تجارتی، تعلیمی، صنعتی اور زرعی مسائل زیرِغور آتے تھے۔ قصہ مختصر علی گڑھ تحریک قیام پاکستان کی تحریک کا آغاز تھی۔ اس ادارے سے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مستقبل میں مسلمانوں کے

علیحدہ وطن کے قیام کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا اور سرسید کے اس خواب کی تکمیل کا ذریعہ ثابت ہوئے جو انہوں نے کئی دہائیاں پہلے دیکھا تھا۔

تحریک خلافت

پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ ترکی کی جنگ میں شمولیت سے ہندوستان کے مسلمان پریشان ہوئے کہ اگر انگریز کامیاب ہو گیا تو ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کے لیے وزیراعظم برطانیہ لائیڈ جارج سے وعدہ لیا کہ جنگ کے دوران مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی نہیں ہوگی اور جنگ کے بعد مسلمانوں کی خلافت محفوظ رہے گی۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست اور برطانیہ کو فتح ہوئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اپنی فوجیں بصرہ اور جدہ میں داخل کر دیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کو وعدے یاد دلانے کے لیے اور خلافت کے تحفظ کے لیے ایک تحریک شروع کی جسے ''تحریک خلافت'' کا نام دیا گیا۔

1919ء میں خلافت کے مسئلے پر رائے عامہ کو منظم کرنے اور متفقہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کر دی گئی جس کے صدر سیٹھ چھوٹانی تھے۔ تحریک خلافت کے بڑے مقاصد کچھ یوں تھے:

ترکی کی خلافت برقرار رکھی جانی چاہیے۔

مقامات مقدسہ (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) ترکی کی تحویل میں رہیں۔

ترکی سلطنت کو تقسیم نہ کیا جائے۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس 1919ء میں دہلی میں ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان انگریز کے جشن فتح میں شریک نہیں ہوں گے اور اگر ان کے مطالبات منظور نہ ہوئے

تو وہ حکومت سے عدم تعاون کریں گے۔اس اجلاس میں ہندوؤں سے تعاون کی اپیل بھی کی گئی تھی۔آل انڈیا کانگرس نے پہلے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر مہم شروع کر رکھی تھی۔اسی دوران آل انڈیا کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے جہاں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔

1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد نے برطانیہ، اٹلی اور فرانس کا دورہ کیا تاکہ برطانوی وزیراعظم اور ان کے اتحادیوں کو ان کے وعدے یاد دلائے جائیں۔وفد نے برطانیہ پہنچ کر وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کی لیکن اس کا جواب یہ ملا کہ ''آسٹریلیا اور جرمنی سے خوفناک انصاف ہو چکا ہے، ترکی اس سے کیونکر بچ سکتا ہے''۔

چنانچہ سرتوڑ کوششوں کے باوجود اس وفد کی کہیں شنوائی نہ ہو سکی۔ وفد ابھی برطانیہ میں ہی تھا کہ برطانیہ اور دیگر عالمی طاقتوں نے ترکی پر ''سیورے معاہدہ'' مسلط کر دیا گیا جس کے نتیجے میں تمام بیرونی مقبوضات ترکی سے بزور طاقت چھین لیے گئے۔ترکی پر فضائی فوج رکھنے پر سخت پابندی لگا دی گئی اور اس کے اہم علاقے درہ دانیال پر اتحادیوں کی بالادستی قائم ہوگئی۔خلافت وفد کی ناکام واپسی اور معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کے خلاف خلافت کمیٹی نے 1920ء میں تحریک ترک موالات کا فیصلہ کیا اور گاندھی کو اس تحریک کا رہنما مقرر کیا گیا۔اس تحریک کے اہم پہلو کچھ یوں تھے:

حکومت کے خطابات واپس کر دیے جائیں۔

کونسلوں کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جائے۔

سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔

تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں۔

مقدمات سرکاری عدالتوں کے بجائے ثالثی عدالتوں میں پیش کیے جائیں۔

انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

تحریک میں شامل بعض رہنماؤں (مولانا عبدالباری، مولانا عبدالکلام آزاد، علی برادران) نے برصغیر کو دارالحرب قرار دے کر یہاں سے ہجرت کا حکم دیا جس پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی۔ یہ ہجرت حکومت افغانستان کے عدم تعاون سے ناکام ہوگئی اور مسلمانوں کو کافی جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ کی انتظامیہ سے سرکاری امداد نہ لینے کی اپیل کی۔ کالج انتظامیہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں مولانا محمد علی جوہر نے بہت سے طلبہ کو ساتھ ملا کر جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ 1925ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ 1922ء میں تحریک خلافت کی حمایت میں لوگوں نے مشتعل ہو کر اتر پردیش کے ایک گاؤں چورا چوری میں ایک تھانے کو آگ لگا دی جس میں بائیس سپاہی جل مرے۔ اس واقعے کو آڑ بنا کر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ چونکہ یہ تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہی اس لیے اسے ختم کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد سطحی، جذباتی اور وقتی تھا۔ دونوں قوموں کو حکومت کے خلاف نفرت نے عارضی طور پر اکٹھا کر دیا تھا لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جلد ہی اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور تحریک خلافت کمزور ہونا شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کی تحریک خلافت سیاسی فائدے کے بجائے مذہبی جوش و خروش پر مبنی تھی۔ ہندو اس سے سیاسی فائدہ تلاش کر رہے تھے جو تحریک خلافت کی کامیابی سے ملنا مشکل تھا۔ چنانچہ جب تحریک خلافت کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھی تو گاندھی نے اسے ختم کرنے کا اعلان کر کے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔

گاندھی نے اس تحریک کو اس وقت ختم کرنے کا اعلان کیا جب مسلمانوں کے تمام رہنما جیل میں تھے اور تحریک کی قیادت سنبھالنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ اس سے تحریک بھی ختم ہوگئی اور مسلمانوں کا اپنے قائدین سے اعتماد بھی اٹھ گیا۔ گاندھی جی ہندوؤں کے مہاتما بن گئے اور مولانا محمد علی جوہر گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔

1924 میں ترکی کے رہنما اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے علاقے آزاد کرا کے جمہوریہ کے قیام اور اپنی صدارت کا اعلان کر دیا اور ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی سازش کی۔ اس لیے ترک حکومت خلافت کی سابقہ حدود کو بحال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی دوران شریف مکہ نے سعودی عرب کو ترکی سلطنت سے علیحدہ کر لیا تھا جس پر عبدالعزیز ابن سعود نے سعودی عرب کے نام سے الگ مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا جس سے تحریک خلافت ماند پڑ گئی۔ تحریک خلافت جیسی عوامی تحریک کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ تحریک اپنی مقاصد کے حصول میں ناکام رہی لیکن اس نے ہندوستان کی سیاست اور مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ اس سے مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار ہوا اور اس میں پہلی مرتبہ پرجوش قیادت ابھری نیز علما اور طلبہ بھی سیاست میں داخل ہوئے۔

کانگرسی وزارتیں

تحریک خلافت کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی سیاسی قیادت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لیے یکے بعد دیگرے تین گول میز کانفرنسیں بلائیں جن میں ہندوستان کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ تاہم ان کانفرنسوں میں بھی ہندوستان کو حق خود اختیاری، مستقبل کے سیاسی نظام اور آزادی کے حوالے سے کسی بات پر اتفاق رائے پیدا نہ ہو سکا۔

تیسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں حکومتی ڈھانچہ قائم کرنے کے لیے 1935ء میں ایک مسودہ قانون کی منظوری دے دی۔ اس قانون کو "قانون ہند مجریہ 1935ء" کہا جاتا ہے۔ یہ قانون وفاقی اور صوبائی حصوں پر مشتمل تھا۔ اس کے مطابق مرکزی سطح پر تمام صوبوں اور ریاستوں کے باہمی

اشتراک سے آل انڈیا فیڈریشن کا قیام عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا جبکہ باہمی صوبائی سطحوں پر رائج الوقت دوعملی نظام حکومت کو ذمہ دار حکومت سے تبدیل کر دیا گیا۔ اڑیسہ کو نیا صوبہ بنا دیا گیا جبکہ صوبہ سرحد کو مکمل صوبائی درجہ مل گیا۔ جہاں تک اس قانون کے وفاقی حصے کا تعلق تھا تو آل انڈیا نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے مسترد کر دیا جبکہ ریاستوں کی جانب سے بھی اس پر کافی اعتراضات کیے گئے۔ دوسری جانب اس قانون کے صوبائی حصے کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے قبول کر لیا جس کے تحت 1937ء میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں انتخابات منعقد ہوئے۔ نتائج کے مطابق کانگرس کو پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہوگئی جن میں مدراس، متحدہ صوبہ جات، مرکزی صوبہ جات، بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔ کانگرس کی قیادت نے ان صوبوں میں مخلوط حکومت بنانے سے انکار کر دیا اور یوں ان صوبوں میں واحد پارٹی کی حکومتیں بن گئیں۔ چند دنوں کے بعد کانگرس نے بمبئی اور سرحد میں بھی اقلیتی پارٹیوں کی حمایت سے حکومتیں قائم کر لیں اور یوں گیارہ میں سے سات صوبہ جات میں کانگرسی وزارتیں بن گئیں۔ 1937 کے انتخابات میں کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں ہیں، ایک انگریز اور دوسری کانگرس۔ اس موقع پر قائداعظم نے نہرو کو چیلنج کرتے ہوئے یاد دلایا کہ ہندوستان میں ایک تیسری قوت یعنی مسلمان بھی موجود ہیں جنہیں کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کانگرس کی ان وزارتوں کو سوا دو سال تک کام کرنے کا موقع ملا۔ 1939ء میں کانگرس اور انگریز کے درمیان دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کی شمولیت کے سوال پر اختلافات کی وجہ سے وزارتوں کو مجبوراً مستعفی ہونا پڑا۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر یوم نجات منایا۔ کانگرسی وزارتوں کی کارکردگی نے مسلم لیگ کی سیاست کا محور تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پہلے مغل دربار کے دوران اور بعد میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں کو اقتدار نصیب ہوا۔ انہوں نے اپنی

ذہنیت، سیاست، تنگ نظری اور انتہا پسندی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

کانگرسی وزارتوں کے دوران صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں کارروائی کا آغاز بندے ماترم سے ہوتا تھا۔ یہ بات مسلمان ارکان کے لیے ناقابل قبول تھی۔ تمام تعلیمی اداروں میں پڑھائی کا آغاز بھی بندے ماترم سے کیا جاتا تھا جس سے مسلمان طلبہ میں بے چینی اور اضطراب پھیل گیا۔ گائے کا ذبیحہ ممنوع قرار دیا گیا۔ دوران اذان مساجد کے سامنے متعصب ہندو ڈھول باجے بجایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کے لیے ملک گیر سطح پر تحریک شروع کر دی گئی۔

انہی وجوہات کی بنا پر مسلمانان ہند بوکھلا گئے اور انہیں نا صرف اپنا جداگانہ تشخص خطرے میں نظر آنے لگا بلکہ ایسے حالات پیدا ہوتے دکھائی دیے جہاں انہیں ہندوؤں کی مستقل غلامی پر مجبور ہونا پڑ سکتا تھا اور مسلمان یہ صورتحال کسی طور قبول نہیں کر سکتے تھے۔ 1937ء کے انتخابات مسلمانوں کے لیے تازیانے سے کم نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خان، بنگال کے فضل الحق اور آسام کے سعد اللہ خان بیک وقت مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قائداعظم محمد علی جناح کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہوئے ان کے مشن پر لبیک کہا۔

1937ء کے انتخابات کے تجربے سے گزرنے کے بعد مسلم زعما جان گئے کہ ہندوستان میں محض ان کے حقوق کا تحفظ کافی نہیں ہے بلکہ مکمل خود ارادیت سے ہی ان کے خدشات اور احساس محرومی کا مداوا ہو سکتا ہے۔ اس قدر بڑی تبدیلی کے بعد اب آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما اس قابل تھے کہ اپنی چونتیس سالہ سیاست کا ثمر مسلمانوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ یہ ثمر اور یہ منزل مقصود ہم قرارداد پاکستان کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کی منظوری آل انڈیا مسلم لیگ نے مارچ 1940ء میں لاہور میں دی تھی۔

ستمبر 1939ء میں برطانوی وزیر اعظم نوئل چیمبرلین نے نازی جرمنی کے خلاف

جنگ کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وائسرائے ہند وکٹر ہوپ نے ہندوستانی سیاست دانوں کو خاطر میں لائے بغیر جنگ میں برطانیہ کا بھرپور ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے بعد وائسرائے نے یہ موقف اختیار کیا کہ جنگ کی وجہ سے خود مختار ہندوستانی حکومت کا معاملہ معطل کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ نے جنگ میں برطانیہ کی متحرک طور پر حمایت کی اور نہ ہی اس کے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا کی۔

جب مسلمان انگریزوں سے مکمل تعاون کرنے لگے تو وائسرائے نے جناح سے حکومتی خودمختاری سے متعلق مسلم لیگ کی رائے پوچھی۔ اس موقع پر لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اپنی سفارشات میں کہا کہ ''مسلم اکثریتی علاقوں میں آزاد ریاست قائم ہو اور یہ معاملات سیدھے برطانیہ کے انتظام میں مکمل ہوں'' قائداعظم نے وائسرائے کو آگاہ کیا کہ مسلم لیگ 1935ء کے ایکٹ پر چلتے ہوئے وفاق کے ماتحت تقسیم کا مطالبہ پیش کرے گی۔

قرارداد پاکستان

قائداعظم اپنی سیاسی زندگی میں طویل عرصہ تک ہندو مسلم اتحاد کے داعی رہے ہیں۔ 1922ء تک وہ بدستور نیشنلسٹ متحدہ ہندوستان کے حامی تھے۔ کانگرس کے ناگ پور اجلاس میں ان کی توہین کی گئی اور انہیں خطاب کا موقع دینے کے بجائے بار بار بیٹھ جانے کو کہا گیا۔ جناح کے خلاف یہ رویہ گاندھی جی کے کہنے پر اختیار کیا گیا تھا۔

اسی دوران تحریک خلافت کے اختتام پر ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ قائداعظم کو کہنا پڑا کہ ''اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ فرقہ واریت اس ملک میں موجود ہے اور محض جذبات اور امتداد زمانہ سے رفع نہیں ہو سکتی''۔ اسی دوران نہرو رپورٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

1928ء میں کلکتہ میں منعقدہ آل پارٹیز کانفرنس میں قائداعظم نے اپنے چودہ

نکات پیش کیے جنہیں انتہا پسند ہندوؤں نے رد کر دیا۔ اس موقع پر قائداعظم کو تنقید و تشنیع کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ یہ وہ موقع تھا جب ان کا دل ہندوؤں سے بیزار ہو گیا اور انہوں نے کلکتہ سے روانہ ہوتے ہوئے مشہور پارسی صنعت کار جمشید جی نوشیرواں جی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ ''اب جدائی کا آغاز ہے''۔

بالآخر قائداعظم لندن چلے گئے اور 1932ء میں جب وہاں تیسری گول میز کانفرنس ہوئی تو لندن میں رہتے ہوئے بھی قائداعظم اس میں شریک نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو ذہن اور ہندو رویے نے مجھے اتحاد کے حوالے سے بالکل مایوس کر دیا ہے۔ 1920ء میں کانگریسی وزرا کے طرز عمل سے جس مایوسی کا آغاز ہوا تھا وہ 1938ء تک پختہ ہو چکی تھی۔ اس وقت تک قائداعظم تقسیم برصغیر کے قائل نہیں تھے۔

23 مارچ 1940ء کا دن برصغیر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنے ستائیسویں اجلاس (منعقدہ لاہور) میں ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا تاکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ اس اجلاس سے چار روز قبل لاہور میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ خاکسار تحریک نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا تو پولیس نے شرکاء پر اندھا دھند فائرنگ کر دی جس سے متعدد خاکسار شہید ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد شہر میں کشیدگی پھیل گئی۔ چنانچہ قائداعظم کو اجلاس ملتوی کرنے کا مشورہ دیا گیا مگر قائداعظم نے ان کی رائے سے عدم اتفاق کرتے ہوئے مقررہ تاریخ پر جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اجلاس کی صدارت قائداعظم نے کی اور فی البدیہہ خطبہ صدارت دیا۔ اپنی طویل تقریر میں قائداعظم نے ملک کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیا اور کانگریسی لیڈروں سے اپنی گفتگو اور مفاہمت کی کوششوں کی تفصیلات بتائیں۔ اس دوران انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندو اور

مسلمان فرقے نہیں بلکہ دو قومیں ہیں۔ اسی لیے ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسائل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی نوعیت کے ہیں"۔

قائداعظم نے فرمایا کہ:

> "ہندوستان کے مسلمان آزادی چاہتے ہیں، لیکن ایسی آزادی نہیں جس میں وہ ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں۔ یہاں مغربی جمہوریت نافذ نہیں ہوسکتی کیونکہ ہندوستان میں صرف ایک قوم نہیں بستی۔ چونکہ یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اس لیے کسی بھی نوعیت کے آئینی تحفظ سے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ ان مفادات کا تحفظ صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے۔ ہندو مسلم مسئلے کا صرف یہی حل ہے۔ اگر مسلمانوں پر کوئی اور حل ٹھونسا گیا تو وہ اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کریں گے"

قائداعظم کی اس تقریر سے اگلے روز یعنی 23 مارچ کو شیر بنگال مولوی فضل الحق نے وہ تاریخی قرارداد پیش کی جسے قرارداد لاہور کہا جاتا ہے جو آگے چل کر قیام پاکستان کی بنیاد قرار پائی۔ اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ "کوئی بھی دستوری خاکہ مسلمانوں کے لیے اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوگا جب تک ہندوستان کے جغرافیائی اعتبار سے متصل و ملحق یونٹوں پر مشتمل علاقوں کی حد بندی اور ضروری علاقائی ردوبدل نہ کیا جائے اور یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں خودمختار ریاستیں قرار دیا جائے۔ ان یونٹوں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے صلاح مشورے سے دستور میں مناسب و موثر اور واضح انتظامات رکھے جائیں اور ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان

اقلیت میں ہیں وہاں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے صلاح مشورے سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کی ضمانت دی جائے''

کانگرسی رہنماؤں نے قرارداد پاکستان پر شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا اور جواہر لال نہرو نے مطالبہ پاکستان کو جناح کی ''تخیلاتی پرواز'' قرار دیا۔ اسی طرح راج گوپال اچاریہ نے تقسیم برصغیر کی تجویز کو ''ذہنی بیماری کی علامت'' کہا۔

1940ء میں قائداعظم کی وائسرائے سے ملاقات ہوئی اور اسی دوران ونسٹن چرچل وزیراعظم بنے۔ انہوں نے کانگرس اور لیگ دونوں کو یقین دہانی کرائی کہ جنگ میں تعاون کے صلے میں وائسرائے ہندوستانی راہنماؤں کو برطانیہ کے سامنے اپنی تجاویز رکھنے کی اجازت فراہم کرے گا۔ وائسرائے نے ان نمائندوں سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا اور کسی بھی بڑی آبادی کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ اگرچہ کانگرس اور لیگ کو ان وعدوں پر اعتبار نہیں تھا مگر یہ پہلا موقع تھا جب انگریزوں نے قائداعظم کو کھلے ذہن کے ساتھ مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کیا۔ اس موقع پر قائداعظم پاکستان کی سرحدی حد بندی اور برطانیہ کے بقیہ برصغیر سے تعلق کے حوالے سے تجاویز دینے کے معاملے پر تذبذب کا شکار تھے کہ کہیں اس سے مسلم لیگ میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔

1941ء میں جاپان نے امریکی بندرگاہ پرل ہاربر پر حملہ کر کے امریکا کو جنگ میں کودنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اسی دوران جاپانی فوجوں نے جنوب مشرقی ایشیا کی جانب پیش قدمی شروع کی تو برطانوی کیبنٹ نے ایک مشن ہندوستان بھیجا جس کی قیادت سر سٹیفورڈ کرپس کر رہے تھے۔ اس مشن کا مقصد ہندوستانی رہنماؤں سے جنگ کے لیے بھرپور تعاون مانگنا تھا۔ کرپس نے کچھ صوبوں کو یہ تجویز بھی دی کہ وہ اپنی مرضی سے خودمختار رہنے یا کسی مستقبل میں کسی ملک میں ضم ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ مسلم لیگ مشرقی بنگال کے ہندو علاقوں میں ووٹ نہیں لے سکتی تھی اس لیے جناح نے یہ تجویز مسترد کر دی۔

کانگرس نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی اور فوری مراعات دینے کا مطالبہ کیا جس کے لیے کرپس تیار نہیں تھے۔ اس کے باوجود جناح اور لیگی رہنماؤں نے کرپس مشن کو پاکستان کے بنیادی مطالبے کو تسلیم کیے جانے سے تشبیہ دی۔

کرپس مشن ناکام ہونے کے بعد کانگرس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک چلائی اور ملک کی آزادی تک ستیہ گرہ مہم دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر برطانیہ نے کانگرسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جو جنگ کے اختتام تک قید رہے۔ گاندھی کو سر آغا خان کے محل سے گرفتار کر کے نظر بند رکھا گیا مگر طبیعت خراب ہونے کے سبب انہیں 1944ء میں رہا کر دیا گیا۔ کانگرسی رہنماؤں کی سیاسی منظرنامے سے گمشدگی کے دوران قائداعظم نے بھرپور انداز میں پاکستان کی مہم چلائی۔ اس دوران انہوں نے مسلم لیگ کو صوبوں میں بھی سیاسی اعتبار سے مضبوط کر دیا۔ قائداعظم نے 1940ء میں دلی سے انگریزی اخبار ڈان جاری کیا جس میں مسلم لیگ کے خیالات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ بعدازاں یہ جریدہ پاکستان کا سب سے بڑا اخبار بن گیا۔

1944ء میں گاندھی نے اپنی رہائی کے بعد بمبئی میں قائداعظم سے ملاقات کی۔ دو ہفتے چلنے والی اس ملاقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ قائداعظم کا اصرار تھا کہ انگریزوں کی واپسی سے قبل ہی برصغیر کو تقسیم کیا جانا چاہیے اور ان کے انخلا کے فوری بعد ہی پاکستان کو آزادی مل جانی چاہیے جبکہ گاندھی کا موقف تھا کہ انگریزوں کے انخلا کے بعد تقسیم کے لیے استصواب رائے سے کام لیا جائے۔ 1945ء میں جنگ کے اختتام پر لیاقت علی خان اور کانگرسی رہنما بھولا بھائی ڈیسائی میں ملاقات ہوئی جس میں اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ ایک قائم مقام حکومت بنائیں گی اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں دونوں جماعتوں کے ارکان کی تعداد برابر ہوگی۔ جب 1945ء میں کانگرس کے دیگر ارکان جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے ڈیسائی کے عمل کی مخالفت کی اور کہا کہ انہوں نے اپنے

اختیار سے بڑھ کر کام کیا ہے۔ اس سے قبل 1943ء میں لارڈ ویول نے وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھالا تھا۔ انہوں نے 1945ء میں تمام سیاسی جماعتوں کے معروف رہنماؤں کو شملہ میں مدعو کر کے ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس موقع پر انہوں نے لیاقت اور ڈیسائی کے فارمولے پر ایک عارضی حکومت کی تجویز دی۔ لیکن وہ اس بات پر رضامند نہیں تھے کہ مسلمانوں کے لیے مختص نشستوں پر صرف مسلم امیدوار کھڑے کیے جائیں گے۔

تمام رہنماؤں نے اپنی اپنی جماعت کے امیدواروں کی فہرست وائسرائے کو جمع کرائی۔ لیکن وائسرائے نے حکومت سازی کا عمل کچھ دیر کے لیے روک دیا۔ 1945ء میں لیبر پارٹی کے کلیمنٹ اٹیلی برطانوی وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اٹیلی اور ان کے مشیر برائے ہندوستان لارڈ پیتھک لارنس نے ہندوستانی حالات کے ازسرنو جائزے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے برطانوی حکومت کی تبدیلی پر کوئی تبصرہ دینے کے بجائے اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا جس میں انہوں نے ہندوستان کے لیے نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔ اس وقت مسلم لیگ صوبائی سطح پر اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی نیز جناح کا خیال تھا کہ وہ اپنے دیگر اتحادیوں کے ساتھ انتخابات میں مسلم علاقوں کی نشستوں میں اکثریت حاصل کر کے اپنے مسلم اقوام کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کے اس دعوے کو سچ ثابت کر سکے گی۔ وائسرائے نے لندن میں اپنے حکام سے مشاورت کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور اس کے فوری بعد صوبائی اور مرکزی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ برطانیہ کا یہ عمل اس بات کا اشارہ تھا کہ قانون بننے کا عمل ووٹنگ کے بعد ہی شروع کیا جائے گا۔

مسلم لیگ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ صرف پاکستان کے مطالبے پر ہی انتخابی مہم چلائے گی۔ دسمبر 1945ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مختص تمام نشستیں جیت لیں جبکہ صوبوں میں اسے 75 فیصد سے زیادہ نشستوں پر کامیابی ملی۔ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو صرف پانچ فیصد نشستیں

ملی تھیں۔انتخابات میں مسلم لیگ کی واضح کامیابی نے مسلمانوں کے مطالبہ آزادی کو مضبوط تر بنادیا۔کانگرس اگرچہ اب بھی اسمبلی میں اکثریت لیے ہوئے تھی مگر اب کے اس کی چار نشستیں کم ہوگئی تھیں۔

فروری 1946ء میں برطانوی کابینہ نے ایک وفد ہندوستان بھیجا جس کا مقصد یہاں کے رہنماؤں سے مذاکرات کرنا تھا۔اس کابینہ مشن پلان میں لارڈ کرپس اور پیتھک لارنس بھی شامل تھے۔اس اعلیٰ سطحی وفد نے دہلی پہنچ کر مذاکرات میں جمود ختم کرنے کی کوشش کی۔ برطانوی حکومت نے ایک منصوبہ بھی جاری کیا جس کے تحت مذہب کی بنیاد پر کچھ صوبوں کے گروپ بنانے کی بات بھی شامل تھی۔اس منصوبے میں ہندوستان کو اندرونی خودمختاری دینے اور دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کو مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رکھنے کی تجویز بھی موجود تھی۔ جناح اور ان کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان نے اس منصوبے کو جون میں قبول کرلیا لیکن وہ اس سوال پر اٹک گئے کہ قائم مقام حکومت میں لیگ اور کانگرس کے نمائندوں کی تعداد کیا ہوگی۔علاوہ ازیں وہ اس بات پر بھی پریشان تھے کہ کانگرس نے اپنے ارکان میں ایک مسلم نمائندے کی موجودگی کا اعلان بھی کر رکھا تھا۔اس وفد نے برطانیہ واپس روانگی سے قبل یہ بات بھی کہی کہ اگر ایک جماعت اس فیصلے سے متفق نہ ہو تو اس صورت میں بھی دوسری جماعت کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی جائے گی۔

کانگرس نے جلد ہی ہندوستانی وزارت میں شمولیت اختیار کرلی۔البتہ لیگ نے اس معاملے میں سستی کا مظاہرہ کیا اور اکتوبر 1946ء سے پہلے وہ اس میں شامل نہ ہوئی۔ لیگ کی حکومت میں شامل ہونے کی رضامندی کے سبب جناح کو کانگرس سے برابری اور مسلم معاملات میں ویٹو کے مطالبے سے دستبردار ہونا پڑا۔اس نئی وزارت کی بنیاد مختلف فسادات خصوصاً یوم راست اقدام کے منظرنامے میں رکھی گئی۔ کانگرس چاہتی تھی کہ وائسرائے قانونی اسمبلی کو سمن جاری کر کے قانون بنانے کا کہے نیز وہ محسوس کرتے تھے کہ

لیگ کے وزرا کو اس معاملے میں ان کا ساتھ دینا چاہیے یا مستعفی ہو جانا چاہیے۔صورتحال کو قابو میں رکھنے کے لیے وائسرائے نے جناح، لیاقت علی خان اور نہرو کو لندن روانہ کیا۔ مذاکرات کے آخر میں یہ اعلامیہ جاری کیا گیا کہ قانون کو ہندوستان کے کسی بھی علاقے کی منشا کے بغیر نافذ نہیں کیا جائے گا۔

کانگرس نے بعض معاملات کی وجہ سے اختلاف رائے پر لندن مذاکرات کی توثیق کردی لیکن لیگ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور قانونی اجلاس میں شرکت نہ کی۔ قائداعظم اس وقت ہندوستان سے مشترکہ دفاع اور آمدورفت جیسے معاملات پر غور کررہے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خودمختار پاکستان کے مطالبے پر بھی زور دینا شروع کر دیا۔لندن معاہدے کی ناکامی کے بعد جناح کو مذاکرات کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ وقت کے ساتھ وہ غیر منقسم پنجاب اور بنگال کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔لیکن ان دولت مند، بڑے اور گنجان علاقوں کے بعض حصوں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور یہی ان کے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ تھی۔اٹیلی حکومت نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ برطانیہ ہندوستان سے جلد انخلا کی خواہش رکھتا ہے۔ دسمبر 1946ء میں برطانیہ نے وائسرائے کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور ویول کی جگہ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے لے لی جو جنگی رہنما اور ملکہ وکٹوریہ کے پوتے ہونے کے سبب کنزرویٹو کے ہاں مقبولیت رکھتے تھے۔اس کے ساتھ اپنے سیاسی نظریات کی بدولت وہ لیبر پارٹی میں بھی برابر مقبول تھے۔

تقسیم ہندوستان

فروری 1947ء میں لارڈ اٹیلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے مقرر ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ برطانیہ جون 1948 سے پہلے ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے کا عمل شروع کردے گا۔اسی دوران کانگرس تقسیم کے معاہدے پر غور کرنے لگی۔ پنڈت نہرو

کے مطابق ''ہم تھکے ماندے تھے اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ تقسیم کا منصوبہ ہی واحد راستہ تھا لہٰذا ہم نے اسے اپنا لیا'' کانگرس جدا جدا مسلم صوبوں کے پیچھے پڑے رہنے کے بجائے وفاق میں زیادہ بااختیار اسمبلی کے لیے کوشش کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ اگر پاکستان آزاد ہو تو بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی حکومتی بریفنگ میں قائداعظم محمد علی جناح کے بارے متنبہ کرتے ہوئے انہیں ''سخت ترین فریق'' قرار دیا اور کہا کہ ''اس ملک میں کوئی بھی ان کے دماغ میں نہیں جھانک سکا'' وائسرائے کے زیر قیادت حکومتی ٹیم اور ہندوستانی رہنماؤں میں چھ ملاقاتیں ہوئیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن قائداعظم سے مثبت طور پر متاثر نہیں تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سے بھی اس بابت مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ دراصل ماؤنٹ بیٹن قائداعظم کی جانب سے پاکستان پر کیے گئے اصرار سے بیزار ہو گئے تھے۔ قائداعظم کو خوف تھا کہ برطانیہ ہندوستان میں اپنے آخری ایام میں اختیارات کو کانگرس کی جانب موڑ سکتا ہے جس سے مسلمانوں کے خودمختاری کے مطالبے کو نقصان پہنچے گا۔ قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے برطانوی ہندی فوج کو آزادی سے قبل تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا جس میں ایک سال کا وقت درکار ہوتا۔ وائسرائے نے اس تقسیم کو آزادی کے بعد کرنے کا سوچا تھا مگر قائداعظم آزادی سے قبل اس پر اصرار کر رہے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے ملاقات کے بعد لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور جو نتائج اخذ کیے وہ برطانوی وزیراعظم لارڈ ایٹلی کو ارسال کیے۔ دو جون کو وائسرائے نے تقسیم کا منصوبہ ہندوستانی رہنماؤں کے سامنے پیش کیا اور بتایا کہ 15 اگست 1947ء کو حکومت برطانیہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گی۔ صوبائی اسمبلیوں کو اختیار ہو گا کہ وہ مرکزی اسمبلی کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہیں گی۔ بنگال اور پنجاب بھی اس سوال پر ووٹ ڈالیں گے کہ وہ تقسیم ہونا چاہتے ہیں اور کس اسمبلی کا ساتھ دیں گے۔ ایک سرحدی کمیشن دو ملکوں کی سرحد کا فیصلہ

کرے گا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور آسام کے مسلم اکثریتی علاقے سلہٹ (جو کہ مشرقی بنگال سے متصل تھا) میں بھی عوام سے رائے لی جائے گی۔

تین جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو، قائداعظم اور سکھ رہنما بلدیو سنگھ نے ریڈیو پر اس منصوبے کا رسمی طور پر اعلان کیا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر کے اختتام پر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا جو کہ ان کی تقریر کے مسودے میں شامل نہیں تھا۔ چند ہفتوں کے بعد پنجاب اور بنگال میں ووٹنگ ہوئی جس میں ان صوبوں کی تقسیم کا فیصلہ ہوا جبکہ آسام کے علاقے سلہٹ اور صوبہ سرحد نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ سنایا۔ سندھ اور بلوچستان کی اسمبلیوں نے بھی پاکستان کے حق میں رائے دی۔

جولائی 1947ء میں لیاقت علی خان نے قائداعظم کی جانب سے وائسرائے سے کہا کہ وہ برطانوی بادشاہ جارج ششم سے انہیں پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کی سفارش کریں۔ اس بات نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو سیخ پا کر دیا جو کہ دونوں ملکوں میں بیک وقت یہ عہدہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ دونوں ملکوں کی آزادی پر ان کا سب سے پہلا گورنر جنرل کہلائے جانے کے خواہش مند تھے لیکن قائداعظم کا خیال تھا کہ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل بنے تو نہرو سے قربت کے باعث وہ ہندو اکثریت کا ساتھ دیں گے۔ مزید براں گورنر جنرل کو ابتدائی طور پر طاقتور اختیارات کا مالک بنایا گیا تھا اور جناح اس سے متفق نہیں تھے کہ کوئی دوسرا اس دفتر کو سنبھالے۔

تقسیم سے قبل ہی بڑی تعداد میں ہجرت شروع ہوگئی اور کئی علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے۔ قائداعظم نے بمبئی میں اپنی کوٹھی بیچنے کا منصوبہ بنایا اور کراچی میں رہائش گاہ خرید لی۔ سات اگست کو قائداعظم، ان کی بہن فاطمہ جناح اور خاص ملازمین دلی سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے جہاز میں کراچی روانہ ہوگئے جہاں انہوں نے اپنی تخلیق کردہ نئی ریاست کا انتظام سنبھالنا تھا۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے لارڈ ریڈ کلف کی سربراہی میں کمیشن قائم کیا گیا تھا جس نے اپنا کام مکمل کر کے رپورٹ 12 اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھجوا دی۔ وائسرائے نے ریڈ کلف کے تیار کردہ نقشے اور رپورٹ 17 اگست تک اپنے پاس رکھے۔ چونکہ پہلے ہی فسادات پھوٹ پڑے تھے اس لیے ریڈ کلف رپورٹ سامنے لانے سے افراتفری اور فسادات میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ ریڈ کلف نے لکھا کہ دونوں جانب سے لوگ اس تقسیم پر خوش نہیں ہوں گے، لہٰذا انہوں نے اپنے کام کا معاوضہ لینے سے انکار کردیا۔ ریڈ کلف کے مشیر بیومونٹ کا کہنا تھا کہ تقسیم پنجاب کے دوران پانچ سے دس لاکھ افراد کے قتل کی ذمہ داری لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی اپنے سر لینی چاہیے۔ اس موقع پر ایک کروڑ 45 لاکھ لوگوں نے سرحد کے آر پار ہجرت کی۔ قائداعظم نے پاکستان میں داخل ہونے والے 80 لاکھ لوگوں کی آبادکاری کے لیے جو کچھ ممکن ہوا کیا۔ قائداعظم کی عمر 70 برس تھی اور وہ پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا تھے تاہم اس کے باوجود انہوں نے مغربی پاکستان میں مہاجر کیمپوں کا دورہ کیا۔ پاکستان نے عوامی املاک کو پاکستان اور بھارت کے مابین تقسیم کرنے والے کمیشن میں لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ پاکستان نے ان سرکاری املاک میں سے چھٹا حصہ لینا تھا۔ نئی بھارتی حکومت املاک کی تقسیم میں سستی دکھا رہی تھی اور اسے امید تھی کہ نوزائیدہ پاکستانی حکومت کسی بھی وقت ناکام ہوسکتی ہے۔ انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس کے کچھ ہی لوگوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا پاکستان میں عملے کی کمی بھی سامنے آئی۔ پاکستان میں اس وقت مشینری کی بھی کمی تھی اور حکومت کو نئے آنے والے مہاجروں کے مسئلے سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ خوراک محفوظ رکھنے کا کام بھی کرنا تھا۔ ان دگرگوں حالات میں سیکیورٹی کا نظام بھی بنالیا گیا اور جیسے تیسے بنیادی خدمات فراہم کی گئیں۔ اگرچہ پاکستان کی تخلیق بحرانوں اور خونریزی میں ہوئی تھی مگر تقسیم کے بعد اس کا وجود صرف لوگوں کی قربانیوں اور قائدین کی بے غرض

کوششوں سے ہی برقرار رہ پایا۔

برطانیہ نے ہندوستان سے انخلا کے وقت نوابی ریاستوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے پاکستان یا بھارت میں شمولیت کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔ بیشتر ریاستوں نے آزادی سے قبل ہی اپنی شمولیت ظاہر کر دی تھی لیکن کچھ بڑی ریاستوں کا معاملہ لٹکا رہا۔ ہندو رہنما جناح سے اس بات پر خائف تھے کہ انہوں نے جودھ پور، ریاست بھوپال اور اندور کے شہزادوں کو پاکستان میں شمولیت پر رضامند کر لیا تھا۔ ان ریاستوں کی سرحدیں پاکستان سے متصل نہیں تھیں اور ان کی آبادی میں بھی مسلمان اکثریت میں نہیں تھے۔ جونا گڑھ کی ہندو اکثریتی ریاست نے ستمبر 1947ء میں پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس ریاست کے حکمران دیوان کی موجودگی میں ریاستی وزیر اعظم سر شاہ نواز بھٹو نے پاکستان سے الحاق کے کاغذات قائداعظم کے حوالے کیے۔ نومبر میں بھارتی فوجوں نے اس علاقے میں داخل ہو کر شاہ نواز بھٹو کو پاکستان جانے پر مجبور کر دیا۔

ان تمام تنازعوں میں ریاست جموں و کشمیر کا تنازع سب سے بڑا تھا۔ اس ریاست کی آبادی میں مسلمان اکثریت میں تھے جس پر ایک ہندو مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت تھی اور اس نے الحاق کا فیصلہ تعطل میں رکھا ہوا تھا۔ مقامی آبادی نے پاکستانی جنگجوؤں کی مدد سے بغاوت کر دی جسے دیکھتے ہوئے مہاراجہ نے بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ قائداعظم نے اس عمل کی مخالفت کرتے ہوئے پاکستانی فوجوں کو کشمیر میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ پاک فوج کے اس وقت کے انگریز سربراہ جنرل ڈگلس گریسی نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ گریسی کا کہنا تھا کہ برطانیہ سے کوئی حکم آنے تک وہ وہ کشمیر پر حملہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ قائداعظم نے اپنے احکامات واپس لے لیے۔ یہ معاملہ اقوام متحدہ میں گیا جہاں بھارت کی خواہش پر ریاست میں استصواب رائے کا فیصلہ ہوا مگر اس پر آج تک عمل نہیں ہو سکا۔ بھارتی حکومت کی جانب سے پاکستان کو اس کے حصے میں آنے

والے اثاثے دینے میں لیت ولعل سے کام لیا جانے لگا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس اقدام کے خلاف تادم مرگ بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ گاندھی کے دباؤ پر بھارت نے پاکستان کے اثاثے جاری کر دیے۔ چند دنوں کے بعد ایک ہندو قوم پرست نتھو رام گاڈسے نے گاندھی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ کٹر ہندو قوم پرست گاندھی کو مسلمانوں اور پاکستان کا حمایتی قرار دیتے تھے۔

قائداعظم 1930ء سے تپ دق کا شکار چلے آ رہے تھے اور یہ بات ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور چند دیگر ساتھیوں کو ہی معلوم تھی۔ قائداعظم نے عوام کو اپنی بیماری سے بے خبر رکھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے انہیں سیاسی طور پر نقصان ہو سکتا ہے۔ پاکستان بننے سے کئی سال بعد ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ اگر انہیں جناح کی خرابی صحت کی خبر ہوتی تو وہ ان کی موت تک انتظار کرتے، یوں تقسیم سے بچا جا سکتا تھا۔ فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ ''جناح اپنی کامیابیوں کے دور میں بھی سخت بیمار تھے۔ وہ پاکستان کو سہارا دینے کے لیے جنون کی حد تک کام کرتے رہے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی صحت کو مکمل نظرانداز کر دیا تھا۔ 1948ء کے وسط میں قائداعظم کوئٹہ روانہ ہوئے جہاں کی آب و ہوا کراچی کے مقابلے میں بہتر تھی۔ وہاں بھی آرام کرنے کے بجائے انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کے افسروں سے خطاب سمیت متعدد سرکاری تقریبات میں شرکت کی۔ کوئٹہ سے کراچی واپسی پر انہوں نے سٹیٹ بینک آف پاکستان سے خطاب کیا اور کینیڈا کے تجارتی کمیشن کی تقریب میں شرکت کی جو ان کی آخری عوامی تقریب ثابت ہوئی۔

جولائی 1948ء میں قائداعظم بحالی صحت کی غرض سے کوئٹہ سے قریب زیارت گئے جہاں ان کا طبی معائنہ بھی کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے قائداعظم کے پھیپھڑوں میں ٹی بی اور سرطان کی نشاندہی کی۔ اسی دوران انہیں نمونیا نے آ گھیرا۔ اب ڈاکٹروں نے انہیں کراچی جانے کا مشورہ دیا جہاں ان کا بہتر علاج ممکن تھا۔ گیارہ ستمبر کو قائداعظم کراچی روانہ ہوئے۔

ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد انہیں ایمبولینس میں منتقل کیا گیا جو راستے میں خراب ہوگئی۔ اس دوران قائداعظم اور ان کے رفقاء متبادل ایمبولینس کا انتظار کرتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد ایمبولینس پہنچی اور یوں قائداعظم کو سرکاری رہائش گاہ پر منتقل کیا گیا جہاں کچھ دیر کے بعد وہ انتقال کر گئے۔ بعض مورخین نے قائداعظم کی ایمبولینس خراب ہونا اور متبادل ایمبولینس کی تاخیر سے روانگی کو سازش سے تعبیر کیا ہے تاہم آزاد ذرائع سے ان دعووں کی تصدیق نہیں ہوسکی۔

خوابوں کی سرزمین

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں قیام پاکستان ایک ایسا منفرد واقعہ ہے جس کے خمیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی واضح جھلک پائی جاتی ہے۔ مسلمانان ہند کی حق خود ارادیت کی تحریک کا مرکزی خیال یہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے ایک ایسی اسلامی مملکت کی تشکیل کی جائے جہاں مسلمان اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت اور عقیدے کے مطابق آزاد زندگی بسر کر سکیں۔ تحریک پاکستان کا مزاج اپنی ہیئت کے اعتبار سے اسلامی، جمہوری اور فلاحی تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد یہی تین بنیادی ستون اس ملک کی ترقی و استحکام کے لیے لازم قرار پائے۔

تحریک پاکستان ایک ہمہ گیر نظریاتی تحریک تھی۔ یہ مسلمانان ہند کی ایک ایسی با مقصد جدوجہد تھی کہ جس کا مطمح نظر انسانی اخوت اور معاشرتی عدل کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک خود مختار فلاحی ریاست کا قیام تھا۔ اس حوالے سے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مملکت پاکستان کی بنیاد کن اصولوں پر قائم ہونی چاہئے تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں قائداعظم محمد علی جناح کے افکار کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ قائداعظم اور علامہ محمد اقبال ایسی دو محسن شخصیات ہیں جن کی فکری اور عملی راہنمائی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو نا صرف ایک منزل کی راہ دکھائی بلکہ قوم کو اس منزل پر پہنچا کر دم لیا۔ لہٰذا پاکستان کے بنیادی خدوخال سمجھنے کے لیے ہمیں قائداعظم کے اقوال زندہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو آج بھی ہمارے لیے اسی طرح مشعل راہ ہیں جس طرح آج سے ستر سال قبل تھے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ پاکستانی قوم کے لیے جو نصب العین مقرر کیا گیا تھا اس پر عملدر آمد کے لیے کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ اگر پاکستان اپنے بانی کے تصورات کا آئینہ دار ہوتا تو ان تصورات کا زبانی تذکرہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس کے بجائے ہم اپنے ملک کے سیاسی احوال سے براہ راست استنباط کرتے۔ اپنے گردو پیش پر نظر ڈالتے اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے کہ یہی بانی پاکستان کے تصورات کی تصویر اور ان کی عملی تعبیر ہے۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی قومی آزادی اور تہذیبی تحفظ کے حوالے سے اسلامی نظریہ حیات کے اصولوں پر مبنی ریاستی اور سماجی ڈھانچے کی تشکیل کی جائے جس سے ایک اسلامی مملکت کے فلاحی نتائج سامنے آئیں اور دوسرے بھی اسلام کی ابدی صداقت سے مستفید ہوں۔ 1945ء میں سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس سے خطاب میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ:

> ''پاکستان کا منشا صرف آزادی اور خودمختاری کا حصول نہیں بلکہ وہ اسلامی نظریہ حیات ہے جو ایک بیش قیمت عطیے اور خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے نا صرف قائم رکھنا ہے بلکہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کے حصول اور فوائد میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں گے''

اسی طرح قیام پاکستان سے چند ماہ قبل نئی مملکت کے سول اور فوجی اہلکاروں سے خطاب میں قائداعظم کا کہنا تھا کہ ''پاکستان کا قیام، جس کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے لیکن ہمارا منشا اپنے لیے ایک آزاد مملکت کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ اصل منشا ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں، جہاں ہمیں معاشرتی عدل کے اسلامی اصولوں کے نفاذ کے آزادانہ مواقع حاصل ہوں اور جہاں اسلام کے معاشرتی

انصاف کے اصول جاری و ساری ہوں"

1948 میں اسلامیہ کالج پشاور میں قائد اعظم نے فرمایا کہ:

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں"

قائد اعظم اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کوئی پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کے پاس تیرہ سو سال سے قرآن پاک کی شکل میں ایک مکمل پروگرام موجود ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "قرآن پاک میں ہی ہماری اقتصادی، تمدنی، معاشرتی اصلاح و ترقی کے علاوہ سیاسی پروگرام بھی موجود ہے۔ میرا اس قانون الٰہیہ پر ایمان ہے اور جو میں آزادی کا طالب ہوں وہ اسی کلام الٰہی کی تعلیم ہے"

قائد اعظم معیشت کو بھی اسلامی فلاحی سانچے میں ڈھالنے کے خواہش مند تھے۔ پاکستان کا معاشی پہلو ان کی نظر سے مخفی نہیں تھا۔ 1948ء میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر میں ان کا کہنا تھا کہ:

"میں اشتیاق اور دلچسپی سے معلوم کرتا رہوں گا کہ آپ کی مجلس تحقیق بینکاری کے ایسے طریقے کیونکر وضع اور اختیار کرتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات کے مطابق ہوں کیونکہ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی تعلقات کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔ ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمانوں کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیں گے"

قائداعظم بلاشبہ ایک مدبر شخصیت تھے۔ وہ ایک انتہائی قابل سیاست دان اوراعلیٰ درجے کے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادی معاملات سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھے۔ وہ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کوقطعاً ناپسند کرتے تھے۔ 1943ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک اجلاس سے خطاب میں آپ نے فرمایا:

''میں سرمایہ داروں کواس حوالے سے متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے۔اپنی مقصد براری کے لیےعوام کا استحصال کرنے کی خوئے بدان کے خون میں رچ بس گئی ہےاور وہ اسلامی احکامات بھول چکے ہیں''

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قائداعظم پاکستان کو معاشی طور پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے خواہش مند تھےاور پاکستان کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی اقتصادی ترقی بھی تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران آپ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ''مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر بنانا وقت کی اہم ضرورت ہےاوراس کے لیےانہیں انگریزوں اور ہندوؤں کے چنگل سے آزاد کرانا ہوگا'' قیام پاکستان کےمحرکات میں ہندوؤں کی اقتصادی اجارہ داری اور مسلمانوں سے ناانصافی کا طویل سلسلہ بھی شامل تھا۔اس پس منظر میں مسلمانان ہند کے لیےعلیحدہ وطن بنائے بغیر اپنی اقتصادی ترقی اور ہندوؤں کی معاشی غلامی اوراستحصال سے نجات کی کوئی صورت نظرنہیں آتی تھی۔لہٰذاان کا مطالبہ پاکستان جہاں زورآوراکثریتی قوم کے سیاسی غلبے سے نجات کا راستہ دکھائی دیتا تھا وہیں ان کو پاکستان کے مطالبے میں استحصال سے پاک اقتصادی مساوات کا پیغام بھی ملتا تھا۔ویسے بھی جب ہم نظریہ پاکستان کے معاشی پہلو پرنظر ڈالتے ہیں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ قیام پاکستان کا ایک پہلو مسلمانوں کومعاشی ترقی اور ہندوؤں کی اقتصادی غلامی اوراستحصال سے نجات دلانا بھی تھا۔ قائداعظم کے تصورمملکت میں ایک بنیادی نقطہ نظر یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ آپ کے

نزدیک قائم ہونے والے پاکستان میں غرباء کے لیے معیار معیشت بلند ہونا تھا۔ 1942ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ:

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل ہمیشہ غربا کے ساتھ ہے اور ان کے لیے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، غرباء محسوس کرتے جائیں گے کہ میں ان کا خادم ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو اس امر سے کمال مسرت ہو گی اور یہ میرے لیے ایک انعام ہو گا کہ غرباء کا معیار زندگی بلند ہو جائے گا۔ ہم پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ اگر اس حکومت میں انسانوں کے لیے مساوات نہیں تو یہ حکومت کس کام کی؟ اگر حکومت غربا کو ضروریات زندگی مہیا کرنے سے قاصر رہی تو اس کے قیام اور وجود سے کیا حاصل؟ ہماری جدوجہد کی غایت یہی ہے کہ ہم غرباء کی بہبود کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں''

قائداعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے سماجی انصاف اور ان کے سیاسی وجمہوری حقوق کے حصول کے لیے متحدہ ہندوستان کے پس منظر میں بھی تگ ودو کی اور اسے یقینی بنانے کے لیے ہی علیحدہ مملکت کی تجویز پیش کی تھی۔ سماجی انصاف کے ضمن میں قائداعظم کے خیالات میں ذرہ برابر بھی ابہام موجود نہیں۔ 1926ء میں اس حوالے سے قائداعظم کا کہنا تھا کہ ''اس حقیقت کے علاوہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بہر حال انصاف ہونا چاہیے میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ مسلمانوں کا مقصد اور مسلمانوں کی ترقی خود ہندوستان کا مقصد ہے۔ اگر ہم سوراج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کسی بھی گروہ کو پسماندہ رہنے کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو آگے بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا پسماندہ رہنا نا صرف ان کے نقطہ نظر سے مضر ہے بلکہ یہ قومی نقطہ نظر سے بھی

ایک رکاوٹ اور نقصان دہ چیز ہے“

سماجی انصاف کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے 1934ء میں قائداعظم نے کہا تھا کہ ”ہندو اور مسلمان ایک جسم کے دو بازو ہیں مگر ایسا جسم کس کام کا جس کا ایک بازو فالج زدہ ہو۔ مفلوج شدہ ہاتھ کو مضبوط کرنے کے لیے آپ جسم کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔ آپ ہندو مسلم اتحاد اس وقت تک قائم نہیں کر سکتے جب تک مسلمان سماجی، تعلیمی اور سیاسی طور پر اپنی موجودہ پسماندہ صورتحال سے دوچار ہیں“

پاکستان کا مطالبہ سامنے آنے کے بعد قائداعظم نے مسلمانوں کی مجوزہ مملکت کے حوالے سے مختلف مواقع پر جو بیانات دیے ان میں سماجی انصاف کا موضوع تکرار کے ساتھ سامنے آیا۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ مستقبل میں جن علاقوں میں پاکستان کا قیام عمل میں آنا تھا وہاں جاگیرداری نظام اور وڈیرہ ازم اپنی بدترین شکل میں روبہ کار تھا۔ اس لیے یہاں کے عوام نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا کیونکہ انہیں یہ آس بندھ چلی تھی کہ آئندہ پاکستان میں انہیں سماجی انصاف مل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی طالع آزماؤں کے مقابلے میں سماجی انصاف کے متلاشی مظلوم عوام نے قائداعظم کا کھل کر ساتھ دیا تھا۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ پاکستان کے قیام کی صورت میں عوام کے معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس امر کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پاکستان کا حصول مسلمانوں کے لیے معاشی استحصال کا تدارک نہیں کر سکتا تو پھر ایسے پاکستان کے لیے جدوجہد کس کام کی؟ یہ حوالہ لامحالہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کے غلبے کے حوالے سے تھا جنہوں نے عوام کو معاشی طور پر غلام بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس استحصالی طبقے کو بروقت وارننگ بھی دی۔ چونکہ ان کے خیال میں پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سدھرنے کا امکان تھا لہٰذا ان کے نزدیک پاکستان کا قیام معاشی نقطہ نظر سے مسلمانان ہند کے لیے بے حد ضروری تھا۔

قیام پاکستان سے قبل قائداعظم نے ایک انگریز صحافی بیورلے نکولس کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے معاشی تصور اور اقتصادی مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا تھا اور دشمنوں کے اس پروپیگنڈے کو رد کر دیا کہ پاکستان معاشی طور پر خود کفیل ہونے کے بجائے غریب اور پسماندہ ہوگا۔ قائداعظم کی رائے میں پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کی اخلاقی فلاح اور مادی ترقی کی راہ نکلتی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کا جو معاشی استحصال کیا جارہا تھا اس کے بارے میں قائداعظم اکثر غور و خوض کرتے رہتے تھے۔ بہت پہلے 1918ء میں بھی آپ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ مسلمانان ہند کی اقتصادی آزادی اور ثقافتی اقدار کے تحفظ کے مسائل بلاشبہ انتہائی اہم اور سنگین ہیں اور میں ہمہ وقت ان کے مناسب حل کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں''

اگست 1948ء میں پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قائداعظم نے اپنے پیغام میں پاکستان کی معاشی صورتحال پر یوں اظہار خیال کیا:

''ہمارے دشمنوں نے پاکستان کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر مار دینے کی کئی طریقے سے کوششیں کیں اور ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ چنانچہ مایوس ہو کر انہوں نے سمجھا کہ معاشی سازشوں سے وہ مقصد باآسانی حاصل ہو جائے گا جو ان کے دل کے بہت قریب ہے۔ انہوں نے پیش گوئی کی کہ پاکستان بہت جلد دیوالیہ ہو جائے گا اور یوں دشمن کی بھڑکتی ہوئی آگ جو مقصد حاصل نہ کر سکی وہ مملکت کے بگڑے ہوئے اور تباہ شدہ حالات سے بخوبی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن ان جھوٹے نجومیوں کو زبردست مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہمارا پہلا بجٹ اللہ کے فضل و کرم سے فاضل بجٹ ہے۔ تجارت کا توازن ہمارے حق میں ہے اور معاشی میدان کے ہر شعبے میں ترقی صاف دکھائی دیتی ہے''

قائداعظم کی تقریر کے اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے معاشی محرکات اور اقتصادی مسائل کو انہوں نے آخری دم تک بہت اہمیت دی۔ درحقیقت وہ ملک کو اقتصادی طور پر خود کفیل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلامی جمہوری فلاحی مملکت ہی پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد تھا۔ 11 اگست 1947 کی مشہور تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ''اگر اہم اس عظیم مملکت کو خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی پوری توجہ لوگوں اور بالخصوص غریب طبقے کی فلاح و بہبود پر مرکوز کرنا پڑے گی''

یہ عیاں ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی جو اسلامی معاشرتی انصاف اور مساوات کے اصولوں پر قائم ہو گی۔ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے، انہوں نے 1945ء میں کہا تھا کہ ''سیاسی طور پر پاکستان ایک جمہوری ریاست ہو گی۔ یہ ایک مسلمان ریاست ہو گی جس میں کسی فرقے کے مابین کوئی معاشرتی، سماجی دیواریں حائل نہیں ہوں گی''

قائداعظم نے پاکستان میں تھیوکریسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ان کے نزدیک عوام کا معاشی استحصال بھی قابل گرفت تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل ہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو سخت الفاظ میں تنبیہ کر دی تھی کہ وہ غریب عوام کے خون پسینے پر اپنے محلات تعمیر کرنے سے باز آ جائیں۔ انہوں نے استحصالی طبقے کی سرزنش کرتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''کیا یہی تہذیب اور ترقی ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کروڑوں کا استحصال کیا گیا ہے۔ اب ان کے لیے دن میں ایک وقت کا کھانا حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر پاکستان کا حصول اس میں تبدیلی نہیں لا سکتا تو میں اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں''

قائداعظم نے یہ بات 1943ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قیام پاکستان سے چار سال قبل

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو وارننگ دے رہے تھے اور اس امر کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ اگر ہم پاکستان میں عوام کی فلاح و بہبود کا بندوبست نہیں کریں گے تو پھر ایسی ریاست کے قیام کا کوئی فائدہ نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظم کا کہنا تھا کہ ''جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تعمیر سماجی انصاف اور اسلامی انصاف کی مضبوط بنیادوں پر ہونی چاہئے جن میں اخوت و مساوات پر زور دیا گیا ہے تو آپ میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے جذبات ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ سب کے لیے مساوی مواقع مانگتے اور ان کی تمنا کرتے ہیں تو آپ میرے ہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ترقی کے ان مقاصد کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اسی لیے کیا تھا، اس کی خاطر جدوجہد کی تھی اور اسے حاصل بھی کیا تھا کہ اپنے معاملات کو اپنی روایات اور اپنے دل و دماغ کے مطابق انجام دینے میں جسمانی اور روحانی طور پر آزاد ہوں۔ اخوت، مساوات اور حریت ہمارے مذہب اور تہذیب کے بنیادی نکات ہیں۔ ہم نے حصول پاکستان کی خاطر اس لیے جنگ کی کہ برصغیر میں ان کے انسانی حقوق کے پامال ہونے کا خدشہ تھا۔ ہم نے اعلیٰ اصولوں کی تمنا کی کیونکہ ہم غیر ملکی حکمرانوں اور ذات پات پر قائم ایک سماجی نظام کی دہری حاکمیت کا شکار رہے تھے''

قائداعظم نے نا صرف ملک کے اسلامی، سیاسی اور معاشی نظام کی وضاحت کی بلکہ استحکام پاکستان کے حوالے سے بھی رہنمائی دی۔ اس حوالے سے صوبائی عصبیت، انداز حاکمیت، آئین کی پاسداری اور ملک سے وفاداری جیسے اہم پہلوؤں کو بھی زیر بحث لاتے رہے اور ہر موقع پر قوم کو درست راہ عمل دکھاتے رہے۔ انہوں نے امیر اور غریب کے حوالے سے بھی اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا تھا تا کہ یہ امر واضح رہے کہ یہ ملک جاگیرداروں یا وڈیروں کے لیے نہیں بنا تھا۔ قائداعظم نے قیام پاکستان کے بعد کہا تھا کہ ''پاکستان میں

کسی ایک طبقے کی لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کی اجازت نہیں ہو گی۔ پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کو ترقی کے برابر موقع میسر ہوں گے۔ پاکستان امیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوابوں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے نہیں بنایا گیا۔ پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے بنا ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیار زندگی اتنا بلند کیا جائے گا کہ غریب اور امیر میں کوئی تفاوت باقی نہیں رہے گا۔ پاکستان کا اقتصادی نظام اسلام کے غیر فانی اصولوں پر ترتیب دیا جائے گا اور ان اصولوں پر جنہوں نے غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا"

قائداعظم پاکستان کو ایسی مملکت کی حیثیت سے دیکھتے تھے جس میں کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے۔ ان کے تصور میں ایسی ریاست تھی جہاں مساوی تقسیم دولت کا اصول کارفرما ہو اور جو اقتصادی نظام اسلام کے لافانی اصولوں کی بنیاد پر قائم ہو۔

قیام پاکستان سے تین دن قبل 11 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں قائداعظم نے دوررس نتائج کا حامل خطاب کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے اقلیتوں کے تحفظ اور جمہوریت کے حوالے سے پر مغز باتیں کی تھیں۔ قائداعظم کا کہنا تھا کہ:

"حکومت پاکستان میں آپ کو اپنے مندروں اور پرستش گاہوں میں جانے کی آزادی ہے۔ آپ کسی بھی مذہب کے مقلد ہوں یا آپ کی ذات اور عقیدہ کچھ بھی ہو، اس سے پاکستان کی حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری ریاست کسی تمیز کے بغیر قائم ہو رہی ہے۔ ایک فرقے یا دوسرے فرقے میں کوئی تمیز نہیں ہو گی اور نہ ہی ذات اور عقیدوں کی تمیزیں ہوں گی۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم ایک ریاست کے باشندے اور مساوی باشندے ہیں۔ ہمیں اپنا مطمح نظر بنا لینا چاہیے اور پھر کچھ عرصہ بعد آپ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان مسلمان نہیں

رہے گا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے مذہب مٹ
جائیں گے۔ مذہب کو ماننا ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے جبکہ میرا اشارہ
سیاسی تمیز کی جانب ہے یعنی ہندو، مسلمان اور تمام مذاہب کے ماننے
والے ایک قوم ہو جائیں گے"

اس تقریر سے قبل قائداعظم کئی مرتبہ اقلیتوں کو یہ یقین دلا چکے تھے کہ نئی قائم ہونے والی مملکت میں ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ 1944ء میں اپنے خطاب میں قائداعظم نے اقلیتوں کو انصاف کا یقین دلاتے ہوئے کہا تھا کہ "جب مسلمانوں کی حکومت تھی تو اس وقت فوج اور نظم و نسق کے اعلیٰ افسر ہندو اور سکھ ہوا کرتے تھے۔ اب خواہ کتنا ہی گمراہ کن پروپیگنڈہ کیوں نہ کیا جائے، آخر کار سچائی کی فتح ہو گی۔ ہماری حکومت میں مسلمانوں کا ضمیر ان کو کسی غیر مسلم سے ناانصافی کرنے کی اجازت نہیں دے گا"

1946ء میں آسام میں تقریر کے دوران قائداعظم نے پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں کہا کہ "میرا ایمان ہے کہ ایسی حکومت کو قائم رہنے کا کوئی حق نہیں جو اقلیتوں سے ناانصافی کرے اور انہیں خوف زدہ کرے۔ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ ہو گا اور انہیں تمام جائز مراعات حاصل ہوں گی۔ اس سے متعلق کسی قسم کے خوف یا بدگمانی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ پاکستان کے ایسے ہی آزاد شہری ہوں گے جیسے کسی اور ملک کے ہو سکتے ہیں"

قیام پاکستان سے ایک ماہ قبل قائداعظم نے ایک مرتبہ پھر اقلیتوں کو یقین دلایا کہ "اس نئی مملکت میں ان کے مذہب، کلچر، زندگی اور جائیداد کی پرامن حفاظت یقینی بنائی جائے گی۔ وہ پاکستان کے مکمل شہری ہوں گے اور اس سلسلے میں کسی سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا"

قائداعظم کے مطابق قیام پاکستان کا مقصد محض ایک نئی مملکت کا حصول نہیں تھا بلکہ یہ اصل مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ تھا۔ یہ اصل مقصد ایک ایسی ریاست کا قیام

تھا جہاں مسلمان اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں اور جہاں عدل و انصاف اور مساوات کے اصولوں کو آزادی سے برسر عمل آنے کا موقع حاصل ہو۔

قائداعظم پاکستان کو اسلامی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے کے خواہش مند تھے۔ وہ جمہوریت کے علمبردار ہونے کے ناطے جمہوری اصولوں کے مطابق باہمی مشاورت پر پختہ یقین رکھتے ہوئے قومی معاملات کو افہام و تفہیم سے حل کرنے پر زور دیتے تھے۔ قائداعظم کرپشن کی مکمل طور پر بیخ کنی کے داعی تھے اور ان کا مقصد اسلامی اقدار پر مبنی معاشرے کی تعمیر تھا۔

بانی پاکستان ملک میں انصاف اور مساوات پر مبنی نظام رائج کرنے کے حق میں تھے۔ انہیں جاگیردارانہ نظام سے نفرت تھی اور وہ غریبوں کی محنت کے بل بوتے پر پلنے والے مقتدر طبقے کی عیش و عشرت کے سخت خلاف تھے۔

قائداعظم پاکستان میں مساوی انسانی حقوق کا ایسا شفاف نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس سے غریبوں کو باآسانی ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔ وہ غریب کو غریب تر اور امیر کو امیر تر بنانے والے نظام کو ناپسند کرتے تھے۔

قائداعظم مساوات پر مبنی معاشی نظام کے علمبردار تھے۔

بانی پاکستان ملکی دستور کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق پر زور دیا اور وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی روا نہ رکھی جائے۔

قائداعظم پاکستان کے اقتصادی اور مالیاتی نظام کو اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصولوں پر رائج کرنا اور معاشی استحصال ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد پاکستان کو جدید اسلامی، جمہوری ریاست کے طور پر ڈھالنا تھا جس میں معاشرتی اور سماجی اعتبار سے کوئی تفریق نہ ہوتی۔ قائداعظم انسانی مساوات کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد انہوں نے نئی مملکت کے لیے یہی اصول مدنظر رکھے۔

کھوٹے سکے

قائداعظم کی وفات ایسے وقت میں ہوئی جب پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی قومی بقا کے دشوار ترین مراحل میں ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے نوزائیدہ پاکستان کی بنیادی ہلا دیں۔ بھارت نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدرآباد دکن پر ہلہ بول دیا جس سے پاکستان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں ہزاروں اندیشے جنم لینے لگے۔ اس موقع پر غیر ملکی مبصرین کا یہاں تک کہنا تھا کہ ''معمار کی وفات سے وہ مکان قائم نہیں رہ سکے گا جو اس نے تعمیر کیا تھا''

قائد ملت

ان تشویشناک حالات میں نوابزادہ لیاقت علی خان نے عزم و استقلال سے قوم کے آزردہ دلوں کو سنبھالا دینے اور لاتعداد مسائل کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں ناقابل فراموش کردار سرانجام دیا۔ انہوں نے خود اعتمادی، تندہی، لگن اور تدبر سے اندرون و بیرون ملک پاکستان کی ساکھ نہ صرف قائم رکھی بلکہ اس میں اضافہ کیا۔ چودھری محمد علی کے الفاظ میں ''لیاقت علی خان نے قومی رہنما کی حیثیت سے غیر متوقع بلندیوں کو چھو لیا''

لیاقت علی خان 1896ء میں مشرقی بنگال کے ضلع کرنال میں ایک بڑے زمیندار نواب رستم خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایران کے مشہور بادشاہ نوشیرواں عادل کی نسل سے تھا۔ نواب رستم علی خان کی زمینیں اتر پردیش اور پنجاب میں

پھیلی ہوئی تھیں۔ان کے ہاں نواب کا خطاب پشتی تھا۔لیاقت علی خان کا بچپن اتر پردیش میں گزرا جو اس وقت مسلم ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی جس کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے بی اے کیا۔لیاقت علی خان کے اہل خانہ انہیں انڈین سول سروس میں بھیجنا چاہتے تھے مگر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے جہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون اور بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔

حصول تعلیم کے بعد 1923 میں انہوں نے ہندوستان واپس آکر آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور باقاعدہ سیاست کا آغاز کیا۔1926ء میں وہ اتر پردیش سے قانون ساز کونسل کے رکن بھی منتخب ہوئے۔یہ نشست مسلسل 14 سال ان کے پاس رہی۔ اس دوران وہ چھ سال صوبائی مجلس قانون ساز کے نائب صدر بھی رہے۔

1928ء میں وہ نہرو رپورٹ پر بحث کے لیے کلکتہ میں منعقدہ قومی کانفرنس میں شریک مسلم وفد کے رکن تھے۔اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے سفیر محمد علی جناح سے گہری وابستگی کے باعث لیاقت علی خان بھی ہندو مسلم اتحاد کے خواہش مند تھے مگر نہرو رپورٹ اور ہندو انتہاپسندوں کے دباؤ پر اس کی منظوری کے بعد وہ ہندوؤں سے مایوس ہو گئے۔

1940ء میں انہیں دوبارہ مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا اور وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر بن گئے۔اب ان کا شمار قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں ہونے لگا جس کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ قائداعظم نے مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے انہیں اپنا دست و بازو قرار دیا تھا۔1943ء میں انہیں دوبارہ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ پاکستان مسلم لیگ کے قیام تک یہ عہدہ لیاقت علی خان کے پاس ہی رہا۔

1946ء میں انہیں مسلم لیگ کی جانب سے وائسرائے کی کونسل میں شامل کیا گیا اور وہ عبوری حکومت میں وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔اس وقت عام خیال یہی تھا کہ وزارت خزانہ جیسی مشکل اور اہم ذمہ داری نبھانا کسی مسلمان یا نواب کے بس کا روگ نہیں۔تاہم

لیاقت علی خان نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے سماجی انصاف کے اصولوں پر مبنی جو تاریخ ساز بجٹ پیش کیا اسے آج بھی غریب آدمی کے بجٹ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بجٹ سے ہندو سرمایہ دار حیرن و پریشان رہ گئے اور اس کی بھرپور مخالفت کی۔

قیام پاکستان کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش کے برعکس جب قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو اپنے ساتھ بطور وزیراعظم لیاقت علی خان کا انتخاب کیا۔ قائداعظم کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی۔ بابائے قوم کی وفات کے بعد لیاقت علی خان کو جن مسائل کا سامنا تھا ان میں فرقہ وارانہ فسادات اور مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ آپ خود مہاجر کونسل کے چیئرمین تھے اور شب و روز آبادکاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے حکومت ہند اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور نہرو کے ساتھ متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ لیاقت علی خان متحدہ ہندوستان میں عبوری دور حکومت میں ہی ثابت کر چکے تھے کہ وہ اقتصادی و مالیاتی امور سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ چنانچہ وزارت عظمٰی کا منصب سنبھالنے کے بعد انہوں نے آزاد معیشت کے لیے ملکی برآمدات پر زور دیا اور پہلے ہی سال بظاہر ناگفتہ بہ حالت اور اثاثوں کی غیر منصفانہ تقسیم کے باوجود متوازن بجٹ پیش کر کے ملک کے مستحکم مالی حالات کی نشاندہی کی۔ انہی کے دور میں لاہور میں سکے ڈھالنے کے لیے ٹکسال قائم کی گئی۔ 1949ء میں انہیں اقتصادی حوالے سے ایک اور کڑے امتحان سے گزرنا پڑا جب برطانیہ سمیت کئی ممالک نے اپنی معاشی بدحالی کے سبب عالمی سطح پر کرنسی کی قدر میں کمی کا فیصلہ کیا تھا۔ تاہم پاکستان اور بھارت کے درمیان ڈیڑھ سال تک معاشی سرد جنگ جاری رہی۔ بالآخر 1951ء میں بھارت نے پاکستانی سکے کی نئی شرح تبادلہ کو تسلیم کر لیا۔ لیاقت علی خان نے نیشنل بینک آف پاکستان قائم کیا۔ کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت کے لیے کراچی میں ملک کا پہلا سٹاک ایکسچینج بھی قائم ہوا۔ انہی کے دور میں پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ

کارپوریشن قائم کی گئی جس کا مقصد سرکاری سطح پر صنعتیں قائم کر کے انہیں نجی شعبے کو منتقل کرنا تھا۔کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔تیل کی تلاش شروع ہوئی جس کے نتیجے میں سوئی گیس دریافت ہوئی۔سیلاب کی تباہ کاریوں کی روک تھام کے لیے فلڈ کمیشن قائم کیا گیا۔اسی کمیشن کی تجویز پر بی آر بی نہر بنائی گئی جس نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں لاہور کی حفاظت میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ممکنہ طور پر بہت سے پاکستانی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوں گے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بھی لیاقت علی خان کے دور میں بنایا گیا تھا۔قائد ملت کی دوررس نگاہ نے آنے والے وقت میں ملک کو درپیش مسائل کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔چنانچہ انہوں نے اس وقت کے ماہرین اور انجینئرز کی مشاورت سے کالا باغ کے مقام پر ڈیم تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا جس سے مستقبل میں پاکستان کو پانی اور توانائی کی مد میں بھرپور فوائد متوقع تھے۔مگر بدقسمتی سے آنے والی حکومتوں نے یہ منصوبہ سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا جس کی ہمیں بھاری قیمت چکانا پڑ رہی ہے۔قرارداد مقاصد کی منظوری لیاقت علی خان کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ یہ قرارداد پاکستانی دستور کی اساس ہے جس میں مملکت کے رہنما اصول متعین کر دیے گئے ہیں۔لیاقت علی خان کے عہد میں خارجہ پالیسی نے بھی واضح شکل اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ بھارت کے ساتھ تنازعات کو پرامن طریقے سے طے کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے اور اسلامی ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات کو فروغ ملا۔

قائداعظم کی طرح لیاقت علی خان نے بھی پاکستان کو ہی اپنا سرمایہ، اپنا خاندان اور اپنا سب کچھ سمجھا۔ وہ ہندوستان میں ہزار ایکڑ جاگیر کے مالک تھے مگر پاکستان آ کر انہوں نے اپنی زمین کے بدلے میں کوئی کلیم داخل نہ کیا۔لیاقت علی خان نے اپنے اور اپنے اہلخانہ کے لیے کوئی بینک بیلنس جمع کیا اور نہ ہی کوئی منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اقتدار کو قوم کی امانت سمجھتے رہے۔قائداعظم کے بعد ملک کی قیادت اور خدمت کے لیے ان

کی موجودگی بلاشبہ عوام کا حوصلہ بلند رکھنے کا باعث ثابت ہوئی۔

قائداعظم نے لیاقت علی خان کو اپنا دست و بازو قرار دیا تھا جبکہ چند ایک کے سوا دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کھوٹے سکے ہیں۔ قائد کی وفات کے بعد نوزائیدہ مملکت کا انتظام و انصرام لیاقت علی خان کے کندھوں پر تھا۔ سیاسی قیادت میں صائب افراد کی کمی کے باعث انہیں بہت سے مشکل مراحل سے تن تنہا نبردآزما ہونا پڑا۔ اسی دور میں اٹھائے گئے بعض اقدامات اور ملکی و بین الاقوامی حوالے سے قائد ملت کے بعض فیصلوں پر تنقید بھی کی جاتی ہے تاہم تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام فیصلے حالات کے مطابق اور نیک نیتی سے کیے گئے تھے جن میں بعض کے منفی اثرات بھی سامنے آئے۔ تاریخ میں تمام بڑے رہنماؤں کے بعض فیصلے تنقید کا نشانہ بنتے ہیں تاہم ان فیصلوں کے پیچھے اس وقت کی ضروریات ہی ہوتی ہیں۔ لیاقت علی خان کے دور حکومت میں چند فیصلوں اور ان سے جڑی غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔

لیاقت علی خان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے ابتدائی ایام میں انہوں نے روس کے بجائے امریکا کے دورے کی دعوت قبول کر کے ملک کو امریکی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اگر تاریخی کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ روس نے لیاقت علی خان کو دورے کی دعوت ہی نہیں دی تھی بلکہ یہ دعوت حاصل ہوگئی تھی۔ 1949ء میں امریکی صدر ٹرومین نے بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو کو امریکا کے دورے پر مدعو کیا۔ پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان کا جھکاؤ مغربی م لک کی جانب سمجھا جاتا تھا اس کے بجائے نہرو بائیں بازو کے سوشلسٹ رہنما کے طور پر [illegible] تھے چنانچہ ان کا امریکی دورہ قدرے حیران کن بات تھی۔

پاکستان کو سفارتی اعتبار سے طاقتور ممالک کے قریب لانے کے لیے سینئر مسلم لیگی رہنما راجہ غضنفر علی خان نے کوششیں کیں اور ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ راجہ غضنفر ایران

میں پاکستان کے سفیر تھے۔ اس موقع پر روسی سفارت کاروں اور لیاقت علی خان میں ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے روس کے دورے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جون 1949ء میں انہیں روس کے دورے کی دعوت موصول ہوگئی اور اس سے چند روز بعد لیاقت علی خان نے یہ دعوت قبول کرلی۔

پاکستان کی امریکا زدہ افسر شاہی کے لیے یہ بات ناقابل قبول تھی جبکہ برطانوی اور امریکی بھی اس صورتحال پر نالاں تھے۔ پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر سر لارنس سمتھ نے پاکستانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دورہ امریکی اور برطانوی شہریوں کے اذہان میں شکوک وشبہات پیدا کرے گا۔ چنانچہ یہ دورہ منسوخ ہوگیا۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ روس اور امریکا دونوں کی جانب سے لیاقت علی خان کو بیک وقت دورے کی دعوت دی گئی تھی لیکن حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ روسی دورے کی منسوخی اور امریکی دورے کی قبولیت کا الزام بھی لیاقت علی خان کے سر ہے مگر اس میں بھی کوئی سچائی نہیں کیونکہ روس کے دورے کی دعوت لیاقت علی خان کی جانب سے حاصل کی گئی تھی۔ تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ پاکستان نے ابتدائی طور پر یہ تجویز کیا تھا کہ لیاقت علی خان 20 اگست 1949ء کو ماسکو پہنچیں گے جبکہ روسیوں کی رائے تھی کہ وہ 15 اگست کو ماسکو پہنچیں۔ پاکستان کا موقف یہ تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ 14 اگست کو وزیراعظم یوم آزادی کی تقریبات میں مصروف ہوں گے۔ روسی حکام نے تجویز کیا کہ دورہ دو ماہ بعد نومبر میں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصرار تھا کہ دورے سے قبل ایلچیوں کی تعیناتی بھی ضروری ہے لیکن وہ اکتوبر کے اختتام تک پاکستان میں سفیر کی تعیناتی میں بھی ناکام رہے۔ حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ لیاقت علی خان روس کا دورہ کرنا چاہتے تھے لیکن روسی حکام نے انہیں دعوت نامہ بھیجنے کے باوجود 20 اگست کے بجائے 15 اگست کی تاریخ رکھ دی جبکہ اس تاریخ پر دورہ ممکن نہیں تھا۔ تقسیم ہند کے بعد روس کی ہمدردیاں بھارت کے ساتھ تھیں کہ

روسی سیاست دانوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ مستقبل میں بھارت ہی ان کا قدرتی اتحادی ہو گا۔ بعض مورخین کے مطابق ممکنہ طور پر بھارت نے بھی لیاقت علی خان کا دورہ روس منسوخ کرانے کے لیے چالبازیاں کی تھیں۔

لیاقت علی خان کے دور حکومت میں پاکستان کا آئین تشکیل نہ پا سکا جس پر انہیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو اپنی تخلیق کے ابتدائی چند برس میں پے در پے مسائل کا سامنا رہا اور لیاقت علی خان نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کیں جبکہ انہیں آئین سازی کے لیے خاطر خواہ وقت ہی نہ مل پایا۔ تاہم لیاقت علی خان نے اس سمت میں بھی کام کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان کے آئین میں قرآن اور اسلام کو اساس کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ انہوں نے علماء اور سیاست دانوں کے مشورے سے آئین کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا جسے آئین ساز اسمبلی نے منظور کیا۔ آئین کا یہ ڈھانچہ قرارداد مقاصد کے نام سے مشہور ہوا جو آج بھی پاکستان کے آئین کا دیباچہ ہے۔

لیاقت علی خان پر مہاجر نوازی کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ میرٹ اور حقائق مدنظر رکھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے عملے کے انتخاب میں بھی انتہائی محتاط تھے۔ جب کار حکومت میں اضافہ ہوا تو انہیں اپنے ذاتی عملے میں ایک اور افسر کا اضافہ کرنا پڑا چنانچہ انہوں نے اپنے ڈپٹی پرائیویٹ سیکرٹری کی تعیناتی کا فیصلہ کیا۔ اس افسر کے انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ وزیراعظم کو تین افراد کے نام پیش کیے گئے جن میں انہوں نے میاں منظور احمد (ایم ایم احمد) کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ اس کا تعلق مغربی پنجاب سے تھا جبکہ دیگر دو افراد اتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے جبکہ وزیراعظم کے رشتہ دار بھی اتر پردیش میں مقیم تھے۔ لیاقت علی خان کے اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کو تخلیق پائے زیادہ عرصہ نہیں گزرا

تھا۔ وزیراعظم ہاؤس میں نہایت اہم اور خفیہ دستاویزات موجود ہوتی تھیں چنانچہ ایسے آدمی کے انتخاب کو ترجیح دی گئی جس کا بھارت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ جن لوگوں کے رشتہ دار بھارت میں موجود تھے انہیں دشمن ملک اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بطور وزیراعظم وہ کسی ایسے اردو بولنے والے پر اعتماد کے لیے تیار نہ تھے جس کے رشتہ دار بھارت میں بستے ہوں۔

قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد بھارت نے فوجی کارروائی کر کے حیدرآباد دکن پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر لیاقت علی خان نے بھارت کو متنبہ کیا۔ 1950ء میں بھارت نے اپنی فوجیں پاکستان کی مشرقی سرحد پر تعینات کر دیں۔ اس موقع پر بھی لیاقت علی خان نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر صلح پسندی کا ثبوت دیا۔ تاہم صلح جوئیانہ جذبات کے ساتھ ساتھ وہ دفاع پاکستان سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے برملا فرما دیا تھا کہ اگر بھارت نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ اسی موقع پر انہوں نے اپنا تاریخی مکا لہرایا تھا۔ 1951ء میں یوم پاکستان کے موقع پر کراچی میں ایک اجلاس میں دفاع پاکستان کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ:

> ''میرے پاس امراء نہیں ہیں، میرے پاس جائیدادیں بھی نہیں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں کیونکہ یہ انسان کے یقین کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ میرے پاس صرف میری زندگی ہے اور وہ بھی میں پاکستان کے نام وقف کر چکا ہوں۔ میں اس کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر پاکستان کے دفاع کے لیے قوم کو خون بہانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو لیاقت کا خون بھی اس میں شامل ہوگا''

اس بیان سے قریباً دو ماہ بعد لیاقت علی خان نے اپنا خون وطن کی نذر کر دیا۔

لیاقت علی خان کی شہادت

یہ 16 اکتوبر 1951ء کی شام تھی۔ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کو کمپنی باغ راولپنڈی میں مسلم لیگ کے جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ اس شام لیاقت علی خان جلسہ گاہ میں پہنچے تو ان کے استقبال کے لیے مسلم لیگ کا کوئی مرکزی یا صوبائی رہنما موجود نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے مقامی رہنماؤں نے انہیں خوش آمدید کہا اور سلامی پیش کی۔

مقامی لیگی رہنماؤں کے خطبہ استقبالیہ کے بعد وزیراعظم مائیک پر آئے۔ انہوں نے اپنا خطاب شروع کرنے سے پہلے ''برادران ملت'' کے الفاظ ہی ادا کیے تھے کہ پستول کے دو فائر سنائی دیے۔ یہ گولیاں مجمع میں اگلی صف میں ڈائس کے قریب بیٹھے افغان باشندے سید اکبر نے چلائی تھیں۔ پہلی گولی وزیراعظم کے سینے اور دوسری پیٹ میں لگی۔ وزیراعظم گر گئے۔ اس زمانے کے اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی رپورٹس کے مطابق گولیاں چلتے ہی موقع پر موجود پولیس کے ایس پی نجف خان نے پشتو میں کہا ''دا چا ڈزے اوکڑے؟ اولہ۔۔۔'' یعنی ''گولی کس نے چلائی؟ مارو اسے۔۔۔''

چند سیکنڈ کے بعد پستول سے دوبارہ فائر ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے ریوالور کے تین فائر سنائی دیے۔ چند سیکنڈ تک فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ اس وقت تک قاتل کے اردگرد موجود لوگوں نے اسے دبوچ کر اس کا پستول قبضے میں لے لیا تھا۔ اگرچہ قاتل گرفت میں آچکا تھا مگر نجف خان کے حکم پر انسپکٹر شاہ محمد نے سید اکبر پر سرکاری پستول سے یکے بعد دیگرے پانچ گولیاں چلا کر اسے قتل کر دیا۔ لیاقت علی خان شدید زخمی حالت میں جلسہ گاہ سے باہر لائے گئے۔ اس وقت وزیر برائے امور کشمیر نواب مشتاق احمد گورمانی کی گاڑی جلسہ گاہمیں داخل ہو رہی تھی۔ وزیراعظم کو اسی گاڑی میں ملٹری ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے۔

لیاقت علی خان کا قتل پاکستان کی تاریخ کے پراسرار ترین واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ قتل وہ نکتہ ہے جہاں پاکستان کی قیادت سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ سے نکل کر سول اور فوجی اہلکاروں اور ان کے کاسہ لیس سیاست دانوں کے ہاتھ میں پہنچی۔ بظاہر قتل کے محرکات، سازشیوں کے نام اور واقعات کا تانا بانا شکوک وشبہات کی گہری دھند میں لپٹے ہوئے ہیں، مگر تاریخی واقعات کے مطالعے اور تجزیے کے ساتھ ان برسوں میں اخبارات میں اس حوالے سے شائع ہونے والی خبروں کا جائزہ لے کر مجھ سمیت تاریخ کا ہر طالب علم اس واقعے کے محرکات اور پس پردہ عناصر کے بارے میں ضرور اندازہ قائم کر سکتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس واقعے کے پس پردہ عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہے جس نے آغاز سفر میں ہی ہماری قوم کی راہ کھوٹی کر دی تھی۔

لیاقت علی خان کی سیاسی تنہائی

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی سیاست میں مقامی اور غیر مقامی عناصر کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ جناح اور لیاقت علی خان سمیت مسلم لیگ کے بیشتر مرکزی رہنما مسلم اقلیتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں میں موجود سیاسی رہنماؤں کا قد کاٹھ زیادہ بلند نہیں تھا لیکن ان کے مفادات کی جڑیں گہری اور عزائم بلند تھے۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کو بن بلائے مہمان سمجھا جا رہا تھا۔ دوسری جانب مسلم لیگ کے غیر عوامی مزاج اور کمزور جمہوری رویوں کے باعث سرکاری اہلکار خود کو اقتدار کا حقیقی سرچشمہ سمجھنے لگے تھے۔

قائداعظم کے بعد لیاقت علی خان بہت تنہا رہ گئے تھے۔ ان کے واحد با اعتماد ساتھی سردار عبدالرب نشتر تھے جو اپنی وضع داری کے باعث اقتدار کی کھینچا تانی میں زیادہ موثر نہیں تھے۔ لیاقت علی خان عوام میں بے حد مقبول تھے لیکن قائد کی وفات کے بعد ان

کے اور اہم سیاسی رہنماؤں نیز سرکاری اہلکاروں میں فاصلہ بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ پنجاب میں نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کی کشمکش میں لیاقت علی خان دولتانہ کے حامی تھے۔ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لیے انتخاب میں لیاقت علی خان نے میاں عبدالباری کے مقابلے میں یوسف خٹک کی حمایت کی تھی چنانچہ پنجاب مسلم لیگ ان سے خفا تھی۔ نواب مشتاق گورمانی کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ''مشتاق گورمانی جلیبی کی طرح سیدھا ہے'' یوسف خٹک کے مطابق لیاقت علی خان وزیراعلیٰ سرحد قیوم خان سے بھی سخت نالاں تھے۔ سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کے بارے میں بھی لیاقت علی خان اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا میں بھی لیاقت علی خان کے خلاف مہم چل رہی تھی جس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ لیاقت علی خان کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت کے پردہ نہ کرنے پر انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح بھی پردہ نہیں کرتی تھیں مگر قائداعظم کی سیاسی قامت سے خائف مولویوں نے صرف لیاقت علی خان کو ہی نشانہ بنائے رکھا۔ 16 اکتوبر 1951ء کی اس شام لیاقت علی خان راولپنڈی کے شہریوں سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے تو وہ سیاسی طور پر تنہا ہو چکے تھے اور سازش کا خاکہ مکمل تھا۔

کمپنی باغ میں کیا ہوا؟

اس شام کمپنی باغ راولپنڈی میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں لیاقت علی خان کے قتل کو ایک انفرادی جرم قرار دینا مشکل ہے۔ وزیراعظم پر قاتلانہ حملے کے فوری بعد کمپنی باغ میں ہونے والے واقعات پر ان گنت سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔

وزیراعظم کے جلسے میں صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ اور آئی جی پولیس تو موجود تھے مگر پنجاب کے وزیراعلیٰ ممتاز دولتانہ، آئی جی پولیس اور سی آئی ڈی کے اعلیٰ حکام غائب

تھے۔ جلسہ گاہ میں فرائض منصبی پر مامور پولیس کا اعلیٰ ترین عہدیدار راولپنڈی کا ایس پی نجف خان تھا۔ گولی کی آواز سنتے ہی نجف خان نے پشتو میں چلا کر کہا "اسے مارو"

یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ نجف خان نے راولپنڈی (پنجاب) کے جلسے میں پنجابی کے بجائے پشتو زبان کیوں استعمال کی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ قاتل افغانی ہے؟ نجف کے حکم پر سید اکبر کو ہلاک کرنے والا انسپکٹر شاہ محمد بھی پشتو بولنے والا تھا۔ کیا پولیس کا ضلعی سربراہ اضطراری حالت میں یاد رکھ سکتا ہے کہ اس کے درجنوں ماتحت تھانیدار کون کون سی زبان بولتے ہیں؟ کیا تجربہ کار پولیس افسر نجف خان کو معلوم نہیں تھا کہ وزیراعظم پر حملہ کرنے والے کو زندہ گرفتار کرنا ضروری ہے؟ جب انسپکٹر شاہ محمد نے سید اکبر پر ایک دو نہیں بلکہ پانچ گولیاں چلائی۔ کیا انسپکٹر شاہ محمد قاتل پر قابو پانے کے بجائے اسے ختم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا؟

لیاقت علی خان کے صاحبزادے اکبر لیاقت کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ سید اکبر کو خواہ مخواہ نشانہ بنایا گیا، اصل قاتل کوئی اور تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ لیاقت علی خان کو گولی عقب سے ماری گئی تھی۔ جلسہ گاہ میں موجود مسلم لیگ کے گارڈز سید اکبر پر ٹوٹ پڑے اور بھالوں سے اس کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وزیراعظم کے قریب مسلح افراد موجود تھے جس سے ناقص حفاظتی انتظامات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

لیاقت علی خان کی شہادت سے کئی سال بعد ملک کے ایک سابق وزیر داخلہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اس دوران انہوں نے جو انکشافات کیے اس سے شہید وزیراعظم کے صاحبزادے کی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ کسی کام کے سلسلے میں میرا افغانستان جانا ہوا۔ اس سے قبل میں پشاور میں ایک منی چینجر کے ہاں گیا جہاں مذکورہ سابق وزیر بھی موجود تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے انکشاف کیا کہ لیاقت علی خان کی شہادت کے وقت وہ کراچی میں تھے۔ جونہی

انہیں اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ ایئرفورس کے جہاز سے راولپنڈی پہنچے جہاں فضائیہ کی ایک جیپ انہیں سی ایم ایچ لے گئی۔ سابق وزیر کے مطابق جب انہوں نے ہسپتال پہنچ کر شہید وزیراعظم کا جسد خاکی دیکھا تو ان کے سینے پر گولی کا بہت بڑا جبکہ پشت پر یہ سوراخ چھوٹا تھا۔ اس کا واضح طور پر یہ مطلب ہے کہ وزیراعظم کو گولی سامنے کے بجائے عقب سے ماری گئی اور قاتل سید اکبر نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔ یہ انکشاف کرنے والے سابق وزیر پٹھان تھے، ان کا کہنا تھا کہ گولی کو ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے، لیاقت علی خان کو لگنے والی گولی کمر سے جسم میں داخل ہوئی اور دل کے راستے باہر نکل گئی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سینے پر زخم کا نشانہ پشت کے نشان سے بڑا تھا۔

جب لیاقت علی خان زخمی ہو کر سٹیج پر گر گئے تو نجف خان کے حکم پر حفاظتی گارڈز نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی جس سے جلسہ گاہ میں افراتفری پھیل گئی یوں زخمی وزیراعظم کو طبی امداد پہنچانے میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اس ہوائی فائرنگ کا مقصد بھی واضح نہیں ہو سکا۔ ایس پی نجف خان نے انکوائری کمیشن کو بتایا کہ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو ہوائی فائرنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس حوالے سے انکوائری کمیشن کے سامنے نجف خان کے بیانات اور سرکاری کاغذات میں بھی تضاد اور ردوبدل پایا گیا جس سے نجف خان کے سازش میں ملوث ہونے یا کم ازکم پیشہ وارانہ بددیانتی کا پختہ ثبوت ضرور مل جاتا ہے۔

انکوائری کمیشن کے مطابق نجف خان نے ایک ذمہ دار پولیس افسر کے طور پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تھی۔ عدالتی رائے کی روشنی میں نجف خان کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی مگر انہیں باعزت طور پر بحال کر دیا گیا۔ وزیراعظم کے جلسے میں ممکنہ ہنگامی صورتحال کے لیے طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں تھا حتیٰ کہ کسی زخمی کو ہسپتال لے جانے کے لیے ایمبولینس تک موجود نہیں تھی۔ چاروں طرف اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں اور چند افراد اس بھگدڑ میں سید اکبر کو ختم کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ ایک وزنی آرائشی

گملا اٹھا لائے اور اسے سید اکبر پر دے مارا جس سے اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اس افراتفری میں سید اکبر پر حملہ کرنے والوں کا اطمینان حیران کن تھا۔ سید اکبر نے زرد رنگ کی شلوار قمیص پر اچکن پہن رکھی تھی۔ یہ خاکسار تحریک کی وردی نہیں تھی تاہم حیران کن طور پر قاتل کے خاکسار ہونے کے بارے میں خبریں پھیلا دی گئیں اور صوبہ بھر میں خاکساروں کی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ کیا یہ عوام کے اشتعال کو کسی خاص سمت میں موڑنے کی سوچی سمجھی کوشش تھی؟ اس وقت خواجہ ناظم الدین نتھیا گلی جبکہ غلام محمد راولپنڈی میں ہی تھے تاہم دونوں جلسے میں شریک نہ ہوئے۔ تاہم جب وزیراعظم کے قتل کی خبر پہنچی تو یہ اصحاب فوراً اصلاح مشورے کے لیے جمع ہو گئے۔ مشتاق گورمانی کی گاڑی اس وقت پہنچی جب نیم مردہ وزیراعظم کو جلسہ گاہ سے باہر لایا جا رہا تھا۔

اس سازش کے ڈانڈوں پر غور و فکر کیا جائے تو تین اہم کردار راولپنڈی سے بیک وقت دور دکھائی دیتے ہیں۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے وقت سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کراچی میں ٹینس کھیل رہے تھے۔ فوج کے سربراہ ایوب خان لندن میں تھے جبکہ سیکرٹری خارجہ اکرام اللہ ایک خاص مشن پر ہالینڈ میں بیٹھے اگلے احکامات کے منتظر تھے۔

سید اکبر کون تھا؟

لیاقت علی خان کا مبینہ قاتل سید اکبر پاکستانی شہری نہیں بلکہ افغان تھا۔ 1944ء میں برطانوی حکومت کی ایماء پر افغانستان میں سیاسی گڑبڑ کی ناکام کوشش کے بعد اس کا خاندان صوبہ سرحد میں آباد ہو گیا تھا۔ اسے اور اس کے بھائی کو برطانوی حکومت سے وظیفہ ملتا تھا جو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ کیا سید اکبر حکومت پاکستان کا تنخواہ دار خفیہ کارندہ تھا؟ اس نے راولپنڈی کے ہوٹل میں اپنا پیشہ سی آئی ڈی پنشنر لکھوایا تھا۔ صوبہ سرحد میں ایسے خفیہ معاملات کے ضمن میں سکندر مرزا کا بہت شہرہ تھا جو قبائلی علاقوں میں

پولیٹیکل ایجنٹ رہنے کے علاوہ پشاور کے ڈپٹی کمشنر کے طور پر فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ سیکرٹری دفاع کے طاقتور عہدے تک پہنچ گئے۔ لیاقت علی خان قتل کے بارے میں سرکاری نقطہء نظر یہی تھا کہ یہ ایک مذہبی جنونی اور ذہنی مریض سید اکبر کا انفرادی فعل تھا جس میں کوئی سازش کارفرما نہیں تھی۔

درحقیقت روزمرہ زندگی میں سید اکبر مذہبی آدمی تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا اور زکواۃ ادا کرتا تھا۔ اس نے شراب اور جوئے کے خلاف ایک کتاب کی کئی جلدیں خرید کر مفت تقسیم کی تھیں۔ سید اکبر قائداعظم سے شدید عقیدت رکھتا تھا اور ہر وقت کشمیر میں جہاد اور بھارت پر حملے کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ تحقیقاتی رپورٹس کے مطابق اس نے اپنے گھر میں الٹے سیدھے جنگی نقشے بھی لٹکا رکھے تھے اور وہ ایبٹ آباد کے مولویوں سے تقاضا کیا کرتا تھا کہ وہ عوام پر جہاد کی اہمیت واضح کریں۔ 14 اکتوبر کو ایبٹ آباد سے راولپنڈی جاتے ہوئے سید اکبر نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے کچھ ہی عرصہ پہلے جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار کرایا تھا۔

سید اکبر کے مکان کی تلاشی لی گئی تو وہاں اخبارات کے متعدد ایسے تراشے ملے جن میں بیگم لیاقت علی خان کے خلاف رسوا کن اداریے تحریر تھے۔ ان دنوں بعض اخبارات میں وزیراعظم اور ان کی اہلیہ کے خلاف گھٹیا مہم چلائی جا رہی تھی جس میں سید اکبر کو گہری دلچسپی تھی۔ دوسری جانب سید اکبر کے بھائی کا کہنا ہے کہ وہ مذہبی جنونی نہیں تھا بلکہ کبھی کبھار وہ اپنی بیوی اور بیٹے کو سینما دکھانے بھی لے جاتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ایبٹ آباد میں جدید یورپین سکول میں داخل کروایا تھا۔ مرنے کے بعد سید اکبر کی جیب سے 2041 روپے برآمد ہوئے۔ 450 روپے ماہانہ سرکاری وظیفہ پانے والے اس مبینہ قاتل کے گھر سے 7650 روپے کے نوٹ اور ''منی لال چمن لال اینڈ کمپنی بمبئی'' کی تیار کردہ نقلی سونے کی 138 اینٹیں بھی ملیں۔

سید اکبر پراسرار طور پر کچھ لوگوں سے ملتا جلتا تھا۔ وزیراعظم کے قتل سے دو روز قبل راولپنڈی پہنچ کر اس نے کسی سے استخارے کی درخواست کی تھی۔ قتل سے ایک روز قبل اسے تحریری جواب ملا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ ''بہشت میں حوریں تمہاری منتظر ہیں، تم ہماری خوشنودی پاؤ گے''

ایبٹ آباد میں سی آئی ڈی کے اہلکار تین سال سے سید اکبر کی نگرانی کر رہے تھے۔ 14 اکتوبر کو سی آئی ڈی راولپنڈی کو پیغام ملا کہ سید اکبر کی ''معمولی نگرانی'' کی جائے۔ وزیراعظم کی آمد کے موقع پر ایسے مشکوک کردار کے بارے میں ان احکامات کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ سید اکبر کی پشت پناہی کر رہے تھے۔

قتل کی تفتیش

مبینہ قاتل سید اکبر کو گرفتار کر لیا جاتا تو تمام سازش کا تانا بانا سامنے آ جاتا۔ قاتل کے اردگرد موجود لوگوں نے اسے قابو کر کے اس کا پستول چھین لیا تھا لیکن اسے پولیس نے موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔ دنیا بھر میں سیاسی قتل چھپانے کا یہ معروف طریقہ ہے کہ کسی شخص کو لالچ اور ترغیب دے کر قتل پر آمادہ کیا جائے اور پھر جائے واردات کی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قاتل کو ختم کر دیا جائے تاکہ اصل سازش کا سراغ نہ مل سکے۔

وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے اس قتل کی تفتیش انسپکٹر جنرل پولیس اعتزاز الدین کے سپرد کی۔ اعتزاز نے بیگم لیاقت علی خان کو بتایا کہ وہ اصل مجرموں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اگست 1952ء میں وہ لیاقت علی کیس کی تحقیقات کے لیے ایئر فورس کے طیارے میں پشاور جا رہے تھے کہ جہلم کے قریب جہاز کو آگ لگ گئی۔ اس حادثے میں اعتزاز الدین سمیت تمام مسافر ہلاک ہو گئے جبکہ جہاز میں موجود لیاقت علی خان قتل کیس سے متعلق اہم کاغذات بھی نذر آتش ہو گئے۔

لیاقت علی خان کے قاتل سید اکبر کو جائے واردات پر سرکاری پستول سے ہلاک کرنے والا انسپکٹر محمد شاہ مختصر عرصے میں ہی بے حد مالدار ہو گیا۔ اس نے پولیس کی ملازمت سے برطرفی کے بعد لائل پور میں کپڑے کا کارخانہ قائم کرلیا۔ چند برس بعد ایوب خان کے دور حکومت میں اسے گجرات کے ایک گاؤں میں اسی کی زیر تعمیر فیکٹری میں بیٹی سمیت پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ اس وقت کے اخبارات میں اس قتل کی خبر دبا دی گئی تھی اور میڈیا کے بعض حصوں میں چند سطری خبر ہی شائع ہو پائی۔ انسپکٹر محمد شاہ کے قتل کی خبر میں سید اکبر پر گولی چلانے کا تناظر بیان کرنے پر اعلیٰ سرکاری افسروں نے ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین کو دھمکیاں دیں۔ یہ تمام حقائق ریکارڈ پر موجود ہیں۔

اس حوالے سے یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مغربی پاکستان کے ایک وزیر غلام نبی پٹھان نے چیف سیکرٹری سید فدا حسین کو فون کیا کہ لیاقت علی خان کے قتل کی فائل انہیں بھیج دی جائے۔ فدا حسن نے ٹال مٹول سے کام لیا تاہم غلام نبی پٹھان کے اصرار پر فائل انہیں بھیجی گئی تو اس میں کوئی کاغذ نہیں تھا۔ فدا حسن کے مطابق غلام محمد کے دور حکومت میں مشتاق گورمانی (گورنر مغربی پاکستان) نے یہ فائل منگوائی تھی جو واپس آئی تو خالی تھی۔ 1958ء میں ازالہ حیثیت عرفی کا مشہور مقدمہ گورمانی بنام زیڈ اے سلہری لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ ایک نکتے کی تصدیق کے لیے عدالت نے اٹارنی جنرل کو حکم دیا کہ لیاقت علی خان کے قتل سے متعلق پولیس کی تفتیشی فائل عدالت کو مہیا کی جائے۔ اس حکم پر سی آئی ڈی نے عدالت کو بتایا کہ تلاش کے باوجود اس فائل کا پتا نہیں چل سکا لہٰذا حکومت اسے پیش کرنے سے معذور ہے۔

16 اکتوبر 1951ء کی شام ریڈیو پاکستان نے کمپنی باغ راولپنڈی سے وزیراعظم لیاقت علی خان کی تقریر براہ راست نشر کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ریڈیو کے نشریاتی آلات سٹیج پر رکھے ایک میز پر نصب تھے۔ وزیراعظم کے قتل کے بعد یہ میز الٹ گئی

مگر ریکارڈنگ کا عمل جاری رہا۔ ایک منٹ اور 43 سیکنڈ کی اس ریکارڈنگ میں مختلف گولیوں کی آواز اور بھگدڑ کا احوال محفوظ ہو گیا۔ یہ ریکارڈنگ انکوائری کمیشن میں متعدد مواقع پر پیش کی گئی۔ ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ میں لیاقت علی خان کی بہت سی تقاریر محفوظ ہیں مگر پاکستان کے کسی ریڈیو سٹیشن پر پونے دومنٹ کی یہ اہم ریکارڈنگ موجود نہیں۔

انسپکٹر جنرل پولیس اعتزازالدین کی ہلاکت کے بعد لیاقت علی خان کے قتل کی تفتیش ڈی آئی جی سرحد اے بی اعوان کے سپرد کی گئی۔ اے بی اعوان کے مطابق جب اس تفتیش کی مکمل رپورٹ محمد علی بوگرہ کو پیش کی گئی تو انہوں نے اس پر کوئی توجہ دیے بغیر نہایت بے رخی سے صرف اتنا کہا کہ حکومت اس ضمن میں سکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ محمد علی بوگرہ نے برطانوی سکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک افسر کو لیاقت علی قتل کیس کی تفتیش کے لیے وزارت داخلہ میں ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس کا عہدہ دے کر افسر بکار خاص مقرر کیا۔ انہوں نے سات ماہ تک تحقیقات کرنے کے بعد 1955ء میں وزیر داخلہ سکندر مرزا کو رپورٹ پیش کر دی۔ یہ رپورٹ کبھی منظر عام پر نہیں آسکی۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کے ریکارڈز آفیسر کے مطابق نیو سکاٹ لینڈ یارڈ کے ریکارڈ میں لیاقت علی قتل کی انکوائری سے متعلق کوئی مواد موجود نہیں ہے۔

لہو کا سراغ

حال ہی میں سامنے آنے والی خفیہ دستاویزات میں کراچی میں امریکی سفیر کا اپنے وزیر خارجہ کے نام ایک تار شامل ہے جو 7 ستمبر 1951ء کی شام بھیجا گیا۔ اس روز شدید بیمار غلام محمد نے امریکی سفیر سے ملاقات کی تھی (یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ ملاقات خفیہ تھی یا نہیں) اس معنی خیز پیغام کا آخری حصہ قابل غور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''غلام محمد (وزیر خزانہ) کہتا ہے کہ وہ پاکستان کی تعمیر تیز مسلم دنیا کو کمیونزم کے

خلاف منظم کرنے کا نصب العین پورا کیے بغیر مرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ وہ خود، ظفر اللہ اور مشتاق احمد گورمانی بھارت کی چھیڑ خانی کو جنگ میں تبدیل نہیں ہونے دیں گے۔ غلام محمد دسمبر میں امریکا کا دورہ کرے گا اور اس موقع پر آپ سے ملنا چاہے گا"

لیاقت علی خان کے قتل سے پانچ ہفتے قبل بھیجے گئے اس پیغام میں وزیر اعظم کا ذکر سرے سے غائب ہے۔ گویا مستقبل کی منصوبہ بندی میں لیاقت علی خان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ پاکستانی حکومت وزیر خزانہ غلام محمد کو شدید علالت کے باعث وزارت سے سبکدوش کرنے جا رہی تھی جبکہ وہ دسمبر میں امریکا کا دورہ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ گویا انہیں معلوم تھا کہ وہ دسمبر میں بھی نا صرف حکومت کا حصہ ہوں گے بلکہ امریکی وزیر خارجہ سے بھی ملاقات کر سکیں گے۔ امریکی وزیر خارجہ وزیر خزانہ سے تو ملاقات نہیں کرتا۔ غلام محمد کس حیثیت میں مسلم دنیا کو کمیونزم کے خلاف منظم کرنے کے منصوبے باندھ رہے تھے؟ بھارت کے خلاف جنگ روکنا یا شروع کرنا اور پاکستان کی تعمیر جیسے قائدانہ لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا پاکستان کی قیادت سنبھالنے کی تیاری بھی مکمل کر لی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پیغام میں امریکی ترجیحات تسلیم کرنے کا ٹھیک ٹھیک اشارہ دیا گیا ہے۔ بھارت سے متعلق آئندہ پالیسی بیان کرتے ہوئے جن تین اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں پنجابی اور سرکاری ملازمت کا پس منظر رکھتے تھے۔ تینوں لیاقت علی کے قتل کے بعد مقتدر ٹولے میں شامل تھے۔ اس اہم معاملے میں لیاقت علی خان کا ذکر تک نہیں۔ گویا لیاقت علی خان کا منظر سے ہٹنا طے ہو چکا تھا۔

لیاقت علی خان کے قتل پر ملکی یا غیر ملکی تجزیوں یا تبصروں میں کسی ذمہ دار ذریعے نے کبھی یہ الزام عائد نہیں کیا کہ اس المیے میں سوویت یونین، بھارت یا افغانستان کی حکومتوں کا ہاتھ تھا۔ حتیٰ کہ ماسکو میں امریکی سفارت خانے نے بھی اس معاملے میں سوویت یونین کے

ملوث ہونے کی تردید کی تھی۔ برطانیہ کولیاقت علی کے قتل میں اس بنیاد پر ملوث کرنے کی کوئی قابل یقین شہادت نہیں ملتی کہ اسے لیاقت علی کے برطانیہ کے بجائے امریکا کی جانب جھکنے پر کوئی ناراضگی تھی۔ لیاقت علی خان کے منظرعام سے ہٹنے کے بعد سامنے آنے والی قیادت تو ممکنہ طور پر برطانیہ کی جانب لیاقت علی خان سے بھی کم مائل تھی۔

لیاقت علی خان کے صاحبزادوں کے مطابق شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے بیگم رعنا لیاقت علی کو بتایا تھا کہ ان کی ایجنسیوں کے علم میں ہے کہ یہ قتل پاکستان کی اندرونی سیاست کا شاخسانہ ہے۔ لیاقت علی خان جیسے مقبول عام رہنما کی موجودگی میں ان فوجی اور سول اہلکاروں کی دال نہیں گل سکتی تھی جو پاکستان پر بلاشرکت غیرے حکومت کرنا چاہتے تھے۔ لیاقت علی کے سوا کسی سیاسی رہنما کا قدوقامت ایسا نہیں تھا کہ ان دھانسو سرکاری اہلکاروں کے آڑے آتا۔ غلام محمد نے مشہور برطانوی مورخ ''رش بروک ولیمز'' کو بتایا تھا کہ پاکستان کو ایسی مضبوط قیادت کی ضرورت ہے جو جماعتی وابستگیوں سے آزاد ہونے کے سبب قومی مفادات کے سوا ہر مصلحت کو نظرانداز کر سکے۔ دوسری طرف ''محدود جمہوریت'' کے حامی سکندر مرزا کا خیال تھا کہ پارلیمانی نظام اپنانے سے پاکستان تباہ و برباد ہو جائے گا جبکہ ایوب خان کو اعتماد تھا کہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے طاقت کی اصل کنجی ان کے پاس تھی۔ بالالفاظ دیگر غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کے حصول کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سکندر مرزا اس جتھے کا دماغ اور غلام محمد افسر شاہی کو قابو میں رکھنے کا وسیلہ تھے۔ سکندر مرزا کو اعتماد تھا کہ ایوب خان اس کا ساتھ دے گا۔ نئے سیاسی بندوبست کے خارجی ترجمان کی حیثیت سے انگریز راج کے تجربہ کار خدمت گزار ظفراللہ خان دستیاب تھے۔

1949ء کے اوائل میں لیاقت علی خان نے دورہ روس کی دعوت مسترد کر کے امریکا کا دورہ کیا تھا۔ مجوزہ دورہ روس کے ممکنہ وفد میں بیگم شاہنواز کا نام بھی شامل تھا۔ وہ

لکھتی ہیں کہ غلام محمد اور ظفر اللہ خان نے دورہ روس کی شدید مخالفت کی تھی۔ تاہم لیاقت علی خان متعدد مواقع پر اعلان کر چکے تھے کہ پاکستان کو بڑی طاقتوں کا دم چھلہ نہیں بننے دیا جائے گا۔ ان کا بھارت کو مکا دکھانا بھی بہت سی طاقتوں کو ناراض کر گیا۔ بہر حال لیاقت علی خان کے قتل سے بیرونی طاقتوں سے زیادہ اقتدار کے بھوکے اندرونی عناصر کو فائدہ پہنچنا تھا۔ لیاقت علی کے قتل کی سازش سے متعلق تفصیلات شاید کبھی سامنے نہ آسکیں تاہم اس قتل سے جن لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا انہی کے ہاتھ خون سے رنگے دکھائی دیتے ہیں۔

اقتدار کی میوزیکل چیئر

قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت اور لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پاکستان کے سیاسی منظر پر غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین دو بڑے سیاسی کردار بن کر ابھرے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد انہوں نے وزیراعظم کا منصب سنبھالا جبکہ گورنر جنرل کا عہدہ غلام محمد کے پاس چلا گیا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان مشرقی و مغربی پاکستان کے علاقوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے مگر اپنے سیاسی قد و قامت اور عظیم خدمات کی بنا پر تمام صوبوں کے لیے قابل قبول تھے۔ خواجہ ناظم الدین کا تعلق بنگال اور غلام محمد کا پنجاب سے تھا۔ دونوں مزاج اور کردار کے اعتبار سے مختلف تھے۔ خواجہ ناظم الدین ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مذہب سے جڑے ہوئے شریف انسان تھے جنہیں سبھی حلقوں میں پسند کیا جاتا تھا۔ غلام محمد برطانوی دور میں انڈین سول سروس کی آڈٹ برانچ سے منسلک تھے۔ تقسیم برصغیر کے وقت وہ ریاست حیدرآباد کے وزیر خزانہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کا تحریک پاکستان میں کوئی کردار نہیں تھا البتہ سرکاری امور کے حوالے سے ان کا قائداعظم سے قریبی رابطہ رہتا تھا، اسی بنا پر وہ پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ غلام محمد نے چالاکی اور

ہوشیاری بلکہ عیاری سے کام لے کر سول ملٹری بیوروکریسی کا ایک گروپ تیار کرلیا تھا اور وہ سیاست دانوں کو کمزور اور تقسیم کرنے کی خفیہ سازشیں کرتے رہتے تھے۔ خرابی صحت کے باعث ان کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ گورنر جنرل کی حیثیت میں ملک کے علامتی سربراہ ہوں گے مگر اس کے باوجود انہوں نے سیاست میں سرگرم اور فعال کردار ادا کر کے سیاسی حلقوں کو حیران کردیا۔ فالج کے باعث معذور ہونے کی بناپر وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر امور مملکت انجام دیتے تھے۔ جب انہیں گورنر جنرل کا عہدہ ملا تو انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مکروفن کا ہر حربہ استعمال کیا۔ خواجہ ناظم الدین شریف انسان تھے اس لیے وہ اپنی اہمیت منوانے میں ناکام رہے۔ یہی ہماری سیاست کا المیہ رہا ہے کہ شرافت جڑ نہ پکڑ سکی، شریف لوگ الگ تھلگ ہوگئے اور چالاک لوگوں نے سیاسی میدان پر قبضہ جمالیا۔ جب خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر وزیر اعظم بنایا گیا تو انہیں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ یہ اقدام ایک سازش ہے۔ اسی طرح اپریل 1953ء میں غلام محمد نے گورنر جنرل کی حیثیت میں وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ طلب کرلیا۔ خواجہ ناظم الدین اس بارے میں لکھتے ہیں کہ ''گورنر جنرل نے مجھے اور میرے رفقاء کو گورنر ہاؤس بلایا اور ہمارے استعفے طلب کیے۔ میں نے گورنر جنرل کو بتایا کہ وہ محض آئینی سربراہ ہیں لہٰذا آئینی اعتبار سے انہیں استعفے طلب کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ مجھے دستور ساز اسمبلی اور عوام کا اعتماد حاصل ہے۔ اسمبلی نے اکثریتی ووٹ سے بجٹ منظور کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت آئین اور قانون کے مطابق چل رہی ہے، اس لیے میں اور میرے رفقاء مستعفی ہونے سے انکار کرتے ہیں''

خواجہ ناظم الدین کی وضاحت کے باوجود غلام محمد نے کابینہ کو معطل کردیا اور یوں جمہوریت پٹڑی سے اتر گئی۔ ناظم الدین نے اپنے گھر پہنچ کر ملکہ برطانیہ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان کے فون کی تاریں کاٹ دی گئیں۔ 1935ء کے انڈیا ایکٹ کے

مطابق ملکہ برطانیہ کو گورنر جنرل تبدیل کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ خواجہ ناظم الدین ملکہ کو مشورہ دینا چاہتے تھے کہ گورنر جنرل نے غیر آئینی قدم اٹھایا ہے لہٰذا اسے عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ اس موقع پر پولیس نے وزیر اعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔ خواجہ ناظم الدین اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بلا سکتے تھے مگر اس اقدام کی صورت میں فوجی ایکشن کی دھمکی دی گئی۔ خواجہ ناظم الدین ملکی مفاد میں خاموش ہو گئے۔ انہوں نے قوم کو پر امن رہنے، روزہ رکھنے اور خدا سے رجوع کرنے کی اپیل کی۔ امریکی سفیر نے غلام محمد کے فیصلے کو تاریخ کا مقبول ترین ''کو'' قرار دیا۔

غلام محمد نے امریکا میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کو نیا وزیر اعظم مقرر کیا۔ ان کا تعلق بنگال سے تھا اور تحریک پاکستان کے دوران ان کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا۔ اس فیصلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد امریکا نے پاکستان میں گہرا اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا۔ سول اور ملٹری افسر شاہی امریکی سفیر کے مشورے سے فیصلے کرتی تھی۔ اسمبلی ارکان نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے بوگرہ کی نامزدگی قبول کر لی۔ غلام محمد نے ٹیکنو کریٹس پر مشتمل نئی کابینہ تشکیل دی۔ انہوں نے فوج کے کمانڈر انچیف ایوب خان کو وزیر دفاع، سکندر مرزا کو وزیر داخلہ اور چودھری محمد علی کو وزیر خزانہ مقرر کیا۔ آرمی چیف کو کابینہ میں شامل کر کے پہلی مرتبہ سیاست میں فوج کی بالادستی کو تسلیم کر لیا گیا۔ قیام پاکستان سے قبل صوبہ سرحد میں کانگرس کے وزیر اعلیٰ رہنے والے ڈاکٹر خان صاحب بھی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین تھے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ انہوں نے گورنر جنرل کے غیر آئینی اقدام کو سندھ چیف کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ رٹ دائر کرنے کے لیے مولوی تمیز الدین برقع پہن کر سائیکل رکشے پر عدالت گئے۔ سندھ چیف کورٹ نے مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ دیا اور دستور ساز اسمبلی کی بحالی اور نئی کابینہ کی منسوخی کا حکم جاری کر دیا۔

اس فیصلے پر ملک بھر میں خوشیاں منائی گئیں اور لوگوں کو جمہوریت کی بقا کے امکانات روشن دکھائی دینے لگے۔ تاہم گورنر جنرل نے سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کو فیڈرل کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ اس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں وفاقی عدالت نے سندھ کورٹ کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے گورنر جنرل کے اقدام کو جائز قرار دے دیا۔ اس کیس میں جسٹس منیر کی مصلحت کوشی کو آج تک ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔

جسٹس منیر نے عہدے سے سبکدوش ہوتے وقت اپنے فیصلے کا یہ کہہ کر دفاع کیا تھا کہ اگر وہ حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیتے تو ملک میں افراتفری اور نراجیت پھیلنے کا خطرہ تھا۔ غالباً انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ ان کے اس فیصلے سے جمہوریت کے مستقبل پر کس قدر مہلک اثرات مرتب ہوں گے اور ملک فوجی آمریت کے ایسے چنگل میں پھنسے گا جس سے نکلنا محال ہو جائے گا۔ بہرحال یہ پاکستانی عدلیہ کی مصلحت اندیش روایات کی شروعات تھی جس سے عدلیہ پر عوام کا اعتماد اور اعتبار متزلزل ہو کر رہ گیا۔ چیف جسٹس محمد منیر کے گورنر جنرل کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین مقدمے کی سماعت کے دوران چیف جسٹس اور گورنر جنرل کے درمیان خفیہ پیغام رسانی کرتے رہے۔ بنچ کے رکن جسٹس اے آر کارنیلیس نے اختلافی نوٹ لکھ کر سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے سے اتفاق کیا۔ جسٹس منیر نے جسٹس کارنیلیس سے پوچھا ''کیا آپ نے فیصلے پر غو[illegible] ہے؟'' جسٹس کارنیلیس نے جواب دیا ''میں نے بہت کوشش کی مگر آپ کے فیصلے سے متفق نہیں ہو سکا''

تاریخ نے جسٹس منیر کے فیصلے کی [illegible] ور ندمت کی [illegible] جسٹس کارنیلیس کو آج بھی اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔ گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کے لیے جس طرح فوج کا سہارا لیا اس کے نتیجے میں ملک کی سیاست میں فوج کی دخل اندازی کے دروازے کھل گئے اور براہ راست ملک کے اقتدار پر فوج کے تسلط جمانے کی راہ ہموار ہو گئی

پاکستان میں جمہوریت پر یہی پہلا کاری وار تھا جس نے پاکستان کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔

سول اور فوجی افسر شاہی کی کابینہ میں شمولیت قائداعظم کے نظریہ سیاست و حکومت کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ پاکستان کے سیاست دانوں کا فرض تھا کہ وہ متحد ہو کر سرکاری ملازمین کی کابینہ میں شمولیت کو چیلنج کرتے اور مزاحمتی تحریک چلاتے۔ مگر بدقسمتی سے مسلم لیگ منتشر اور غیر منظم تھی لہٰذا پاکستان کی تاریخ کا پہلا سول ملٹری انقلاب کامیاب ہو گیا اور اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یہ انقلاب ایک سویلین مارشل لا تھا جس کی قیادت کمانڈر انچیف (ایوب خان) کے ہاتھ میں تھی۔ گورنر جنرل اور وزیراعظم سویلین بیوروکریٹس تھے مگر کلیدی فیصلے کمانڈر انچیف اور وزیر دفاع (ایوب خان) کی منظوری سے ہوتے تھے۔ گو فوج نے بالواسطہ اقتدار پر قبضہ جما لیا تھا۔ ایوب خان نے وزیر دفاع کی حیثیت میں کابینہ میں شمولیت کے بارے میں کہا تھا کہ "میں نے دفاع کی وزارت اس لیے قبول کی کیونکہ میں سیاست دانوں اور فوج کے درمیان پل بننا چاہتا تھا"

جنرل ایوب کے وزیر دفاع بننے سے اونٹ کا سر خیمے میں آ گیا اور رفتہ رفتہ پورا اونٹ خیمے میں داخل ہو گیا۔ ایوب خان کو وزیر دفاع کی حیثیت سے فوج میں افسروں کی تعیناتی، تبادلے، ترقی اور ریٹائرمنٹ کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ مورخین حیران ہیں کہ قیام پاکستان کے صرف چار سال بعد ہی مسلم لیگ نے بیوروکریسی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ امریکا سے تعلق کی وجہ سے سول اور فوجی بیوروکریسی بھی مضبوط ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ جی ایچ کیو نے پاکستان کے خارجہ امور پر بھی مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ فوج خود ہی خارجہ پالیسی تشکیل دیتی اور اس کا دفاع کرتی رہی۔ اس ایوبی نظریے کی بنا پر پاکستان کی ریاست، سیاست اور جمہوریت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ پاکستان کے سویلین سیاست دانوں کے بارے میں ایوب خان کے خیالات ابتدا ہی سے اچھے نہیں تھے اور وہ عسکری و دفاعی امور میں انہیں ہرگز اعتماد میں نہیں لیتے تھے۔

سردار عبدالرب نشتر اپنی تصنیف ''آزادی کی کہانی میری زبانی'' میں رقم طراز ہیں کہ ''پاکستان کی فوج کو سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان کی بری فوج کے سربراہ ایوب خان سیاست میں دلچسپی لے رہے ہیں اور انہوں نے کئی جگہوں پر کہا ہے کہ سویلین حکومت نہیں چلا سکتے۔ ایوب خان کی یہ سوچ نادانی پر مبنی ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ وہ آج جو کچھ بھی ہے پاکستان کی بدولت ہے۔ پاکستان سویلینز نے اپنے خون سے حاصل کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان کی فوج نے کبھی سیاست میں آنے کی کوشش کی تو اس دن سے پاکستان کی فوج اور ملک کا زوال شروع ہو جائے گا۔ ملک کے پیچیدہ معاملات فوجی افسر نہیں چلا سکتے۔ ان کی تربیت زندگی کی شاہراہ پر نہیں ہوتی۔ جس دن فوج سیاست میں داخل ہو گئی، اسی دن پاکستان ٹوٹنے کا عمل شروع ہو جائے گا۔

نیک نام اور دوربین سیاست دان کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور آج اسی بنا پر پاکستانی ریاست ہر لحاظ سے کمزور ہو چکی ہے۔ حکومت میں فوج کا پہلا عملی کردار 1953ء میں دیکھنے کو ملا جب لاہور میں تحریک ختم نبوت سے نمٹنے کے لیے مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ا ہور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان تھے جنہیں فوجی سربراہ ایوب خان اور کابینہ کے سیکرٹری سکندر مرزا کی جانب سے مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ گولی چلی اور لاہور میں سیکڑوں افراد خون میں نہلا دیے گئے جن میں یونیورسٹی کے طلبہ کی بڑی تعداد شامل تھی۔ میں ان واقعات کا عینی شاہد ہوں۔

قبل ازیں، جنرل اعظم خان مشرقی پاکستان میں تعینات تھے جہاں سیلاب کی تباہ کاریوں میں فوج نے بڑھ چڑھ کر عوام کی مدد کی۔ یہی وجہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام میں فوج خصوصاً جنرل اعظم خان کے لیے بے حد احترام پایا جاتا تھا۔ اعظم خان کی عوامی مقبولیت سے خائف ہو کر ایوب خان نے انہیں مغربی پاکستان بلا لیا۔ جب اعظم خان واپس جانے لگے تو بنگالی دھاڑیں مار کر روئے۔ اگر اس وقت کے اخبارات دیکھے جائیں

تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اعظم خان عوام دوست اقدامات کی بنا پر بنگال میں کس قدر مقبول تھے۔ ان کی واپسی پر مشرقی پاکستان کے باسیوں نے ''اعظم مت جاؤ، اعظم مت جاؤ'' کی دہائی دی مگر اعظم خان کو مغربی پاکستان بلا لیا گیا اور ایک متنازع اقدام کا حکم دیا گیا جو انہیں بجالانا تھا۔ لاہور میں فسادات سے نمٹنے کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کی غرض سے کابینہ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ دوران اجلاس کابینہ کے سیکرٹری سکندر مرزا وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی اجازت کے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ دس منٹ کے بعد جب وہ اجلاس میں واپس آئے تو پرسکون انداز میں شرکاء کو بتایا کہ وہ اس حوالے سے پریشان نہ ہوں کیونکہ انہوں نے کمانڈر انچیف ایوب خان اور کور کمانڈر اعظم خان سے بات کر لی ہے۔ اگلی صبح شہر میں مارشل لا لگ جائے گا۔ اس کے بعد بحث ختم ہو گئی۔ وزیر اعظم سمیت کسی شخص نے سکندر مرزا کے من مانے فیصلے اور گستاخانہ رویے کو چیلنج نہ کیا۔

جب سویلین حکومتیں فوج پر انحصار کرنے لگتی ہیں تو فوج اقتدار کو ایک سے دوسرے فرد اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کو منتقل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں یہی تماشا ہوتا رہا اور بعد میں اس روایت نے مستقل شکل اختیار کر لی۔ فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد غلام محمد نے عام انتخابات سے گریز کیا تا کہ سیاست دان بالادستی حاصل نہ کرنے پائیں۔ اس کے بجائے صوبائی اسمبلیوں نے متناسب نمائندگی کے اصول پر دوسری دستور ساز اسمبلی منتخب کر لی جو 80 ارکان پر مشتمل تھی جس میں مسلم لیگ کے صرف 25 ارکان منتخب ہو سکے۔

غلام محمد، ایوب خان اور سکندر مرزا پر مشتمل تین کے ٹولے کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ 1954ء میں وزیر اعظم محمد علی بوگرہ امریکا کا دورہ اچانک ادھورا چھوڑ کر کراچی واپس آئے تو ہوائی اڈے سے انہیں پولیس کے کڑے پہرے میں عملی طور پر ایک قیدی کی طرح سیدھا گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا جہاں غلام محمد، کمانڈر انچیف ایوب خان اور اس وقت

مشرقی پاکستان کے گورنر سکندر مرزا صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ بوگرہ کو فوجی افسروں اور پولیس کی معیت میں ریڈیو پاکستان کے سٹوڈیو لے جایا گیا جہاں ان سے ملک میں ہنگامی حالت کے نفاذ اور پہلی دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کا اعلان کروایا گیا۔ یہ اعلان اس وقت ہوا جب دستور ساز اسمبلی نے آئین کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ منظور کر لی تھی اور ملک کے پہلے آئین کا مسودہ چھ روز بعد ایوان میں پیش کیا جانے والا تھا۔

پاکستان کی نوزائیدہ جمہوریت پر یہ پہلا اور ایک بھرپور کاری وار تھا۔ سیاسی جوڑتوڑ کے ذریعے بننے والے گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر ملک کو ان بھول بھلیوں میں دھکیل دیا جن سے وہ اب تک نہیں نکل سکا۔ غلام محمد انگریزی دور کی بیوروکریسی کے نیابت دار تھے اور مالی معاملات میں مہارت کی بنیاد پر پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر خزانہ کی حیثیت سے شامل کیے گئے تھے۔ وہ نہ مسلم لیگ کے رہنما تھے اور نہ ہی ان کا کوئی سیاسی پس منظر اور دائرہ اثر تھا۔ ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملک کی فوجی اور سول بیوروکریسی نے اقتدار پر قبضے کا سوچا سمجھا منصوبہ بنا رکھا تھا جو اب پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ غلام محمد کی گورنر جنرل شپ میں یہ پہلا موقع تھا جب وزیر دفاع (ایوب خان) فوجی وردی میں ملبوس ہو کر کابینہ کے اجلاس میں شریک ہوا۔ یہ دراصل ملک کے اقتدار میں فوج کی شراکت اور آخر کار ملک کے اقتدار پر براہ راست فوجی تسلط کی ابتدا تھی جس کی انتہا شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔

غلام محمد کی جانب سے دستور ساز اسمبلی توڑنے کے اقدام کے پیچھے سب سے بڑی وجہ ملک میں آبادی اور طاقت کے لحاظ سے صوبوں میں عدم توازن تھا۔ دستور ساز اسمبلی نے سات سال کے طویل عرصے میں ملک کے پہلے آئین کے خاکے سے متعلق بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ منظور کی تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں پنجاب سے مسلم لیگ کے ارکان کے قائد ملک فیروز خان نون اس رپورٹ کے سخت خلاف تھے۔ انہیں خدشہ تھا

کہ اس رپورٹ پر مبنی نئے آئین کا جھکاؤ بڑی حد تک مشرقی پاکستان کے حق میں رہے گا اور نہ صرف سیاسی میدان بلکہ بیوروکریسی اور فوج میں پنجاب کے مفادات کو سخت زک پہنچے گی۔ پنجاب کا یہ خدشہ اس وقت مزید شدت اختیار کر گیا جب مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نورالامین کی شہ پر سندھ کے وزیر اعلیٰ عبدالستار پیرزادہ نے گورنر جنرل کے وسیع اختیارات کو چیلنج کیا اور ان اختیارات میں کمی کے لیے آئینی ترمیم پیش کر دی۔

گورنر جنرل غلام محمد اس پر طیش میں آ گئے اور اس کے ساتھ فوج، بیوروکریسی اور پنجاب کا مفاد پرست طبقہ لرز اٹھا۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر ملک میں جمہوری ڈھانچے کے تحت مشرقی پاکستان کو آبادی کی بنیاد پر بالادستی حاصل ہو گئی اور وہ ملک کے دوسرے تین چھوٹے صوبوں کے ساتھ کسی معاملے پر یک رائے اور متحد ہو گئے تو پنجاب سیاسی طور پر بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ گورنر جنرل غلام محمد کی شہ پر پنجاب مسلم لیگ نے تین مطالبات پر مشتمل الٹی میٹم پیش کیا اور کہا کہ اگر اس کے یہ مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو دستور ساز اسمبلی کے اجلاس سے قبل پارٹی کے تمام ارکان احتجاجاً مستعفی ہو جائیں گے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ آئین میں مرکز کے پاس صرف چار محکمے ہونے چاہئیں جن میں دفاع، امور خارجہ، کرنسی و بیرونی تجارت اور بین الصوبائی مواصلات شامل ہیں۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ دیگر تمام امور صوبوں کو تفویض کرنے کے لیے تمام صوبوں کے نمائندوں کی کمیٹی فیصلہ کرے۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ اگلے پانچ برس تک نئے آئین میں کوئی ترمیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اسے تمام صوبوں میں تیس فیصد ارکان کی حمایت حاصل نہ ہو جائے۔

دراصل محمد علی بوگرہ نے غلام محمد کے منظور نظر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ جب ان کے قدم ذرا جمے تو انہوں نے خود کو گورنر جنرل کے بندھنوں سے آزاد کرانا چاہا۔ محمد علی بوگرہ اور ان کے رفقائے کار نے ایک منصوبہ ترتیب دیا کہ اسمبلی کے اجلاس میں اس طرز کی قرارداد منظور کرائی جائے۔ اس حکمت عملی کے پیش نظر دستور ساز اسمبلی کے اجلاس سے

قبل قرارداد تمام ارکان اسمبلی کی میزوں پر رات کو رکھ دی گئی تھی۔ قرارداد کے مطابق انڈیا ایکٹ کی متعدد دفعات منسوخ کر دی گئیں۔ اس قرارداد کی منظوری میں تقریباً دس منٹ کا وقت لگا۔ یہ گورنر جنرل غلام محمد کے لیے محمد علی بوگرہ اوران کے ساتھیوں کی جانب سے ایک واضح اشارہ تھا کہ اب وہ اس قدر بااختیار نہیں رہے کہ اپنے آئینی اختیارات کی بنیاد پر کسی بھی حکومت کو ایک لمحے میں برطرف کر دیں۔ یہ قرارداد منظور ہونے کے بعد مطمئن اور خوش وزیراعظم امریکا کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اسی دوران انہیں گورنر جنرل کا پیغام ملا جس کے بعد انہیں دورہ ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ان کی واپسی پر جو کچھ ہوا وہ بالائی سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔

ملک غلام محمد نے پستول دکھا کر محمد علی بوگرہ سے اسمبلی تڑوائی جبکہ اس دوران پس منظر میں فوج کے کمانڈر انچیف اور وزیر دفاع ایوب خان بھی اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ بوگرہ غلام محمد کے اختیارات محدود کرنے کی کوشش میں اپنا عہدہ گنوا بیٹھے اور وفاقی حکومت کے سیکرٹری چودھری محمد علی کو نیا وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔

چودھری محمد علی

چودھری محمد علی تقسیم سے قبل برطانوی راج میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر کام کرتے رہے تھے لیکن نیا ملک بن جانے کے بعد انہوں نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ متحدہ پاکستان کے چیف سیکرٹری بنے۔ وہ 1956ء کے آئین کے خالق بھی تھے۔ چودھری محمد علی کا شمار لیاقت علی خان کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے۔ قائداعظم سے لیاقت علی خان کی آخری ملاقات میں بھی وہ ان کے ہمراہ تھے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد بنتی بدلتی حکومتوں کے عروج وزوال میں بھی شریک تھے۔ قائداعظم کی 11 اگست والی تقریر بھی چودھری محمد علی نے ریکارڈ سے حذف کرائی تھی۔ انہیں یہ گمان تھا کہ

جناح صاحب نے جوش خطابت میں جس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کو برابر قرار دیا تھا وہ مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا تقریر ختم ہوتے ہی نوکر شاہی متحرک ہوگئی اور تقریر کا پورا متن اخبارات میں شائع ہونے سے روکنے کی کوششیں شروع کردی گئیں۔

ان تمام افراد کی بدنصیبی یہ تھی کہ اس بات کا علم ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین کو ہو گیا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ سب کچھ کس کے حکم پر ہو رہا ہے۔ کیا جناح صاحب کے اپنے حکم پر کیا جا رہا ہے یا پھر کسی اور کی ہدایات پر ہو رہا ہے۔ معروف صحافی ضمیر نیازی نے اپنی کتاب ''صحافت پابند سلاسل'' میں لکھا ہے کہ ''الطاف حسین یہ جاننا چاہتے تھے کہ کون شخص یہ عبارت حذف کروانا چاہتا ہے۔ مجھے مجید ملک کو تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میں نے انہیں الطاف حسین کا پیغام پہنچایا۔ ملک صاحب نے چودھری محمد علی کو فون کیا جو اس وقت کابینہ ڈویژن کے سیکرٹری تھے۔ ان سے گفتگو کے بعد ملک نے مجھے فون پر کہا کہ یہ کوئی ایڈوائس نہیں بلکہ صرف ایک رائے ہے۔ قائداعظم کی تقریر کو سنسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایسا فیصلہ کون شخص کر سکتا ہے''

ضمیر نیازی کے مطابق 1949ء سے 1958ء تک نام نہاد جمہوری دور میں بھی سیاست دان ملک کا انتظام چلانے میں آزاد نہیں رہے۔ جو شخص اس وقت بیوروکریسی کی مشینری کا انچارج تھا وہ چودھری محمد علی تھے۔ ان کی صلاحیتیں اپنی جگہ مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اگر وہ پاکستان میں حکومتیں تبدیل کرنے میں شریک ہوں نہ ہوں ان کے واقعات کے عینی شاہد ضرور تھے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب ''مسلم لیگ کا دور حکومت'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''چودھری محمد علی نے مجھے ایک ذاتی ملاقات میں بتایا تھا کہ جب
> بوگرہ کو غلام محمد کے سامنے لایا گیا تو غلام محمد نے تکیے کے نیچے سے
> ریوالور نکال لیا اور جب تک بوگرہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کرلیا

اس وقت تک گورنر جنرل اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا۔ انہوں
نے مزید بتایا کہ جب یہ کارروائی ہو رہی تھی تو ایوب خان ریوالور
ہاتھ میں پکڑے پس پردہ کھڑے تھے"

چودھری محمد علی بااثر بیوروکریٹ تھے۔ لیاقت علی خان سے لے کر غلام محمد تک ان کا شمار فیصلہ ساز ٹولے کے اہم ارکان میں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں ملک کو آئین کا تحفہ دیں تا کہ ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ ان کے آئین میں صدر کا عہدہ سب سے اعلیٰ تھا مگر دستور میں ایک قومی اسمبلی کی گنجائش بھی موجود تھی۔ اس دوران شدید علالت کے باعث غلام محمد کو رخصت پر بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ سکندر مرزا گورنر جنرل بن گئے۔ سکندر مرزا کو کس نے گورنر جنرل کے عہدے کے لیے نامزد کیا؟ ایک وفاقی سیکرٹری سربراہ مملکت کیسے بن گیا؟ دراصل یہ سب محلاتی سازشیں تھیں جو آج تک اتنی ہی پراسرار ہیں جیسا کہ وہ وقوع میں آنے کے بعد تھیں۔

1956ء میں گورنر جنرل نے چودھری محمد علی کے بنائے آئین کی منظوری دے دی اور سکندر مرزا نے صدر مملکت کے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ سکندر مرزا کے صدر بنتے ہی چودھری محمد علی کو احساس ہو گیا کہ اب ان کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آخر کار چودھری محمد علی نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اس امر کے شدت سے متمنی تھے کہ انہیں تاریخ میں آئین کے خالق کے طور پر یاد رکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کوشش کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کے نظریات کو آئین میں سمو لیا تھا جس کے نتیجے میں آئین چوں چوں کا مربہ بن گیا۔

اس آئین میں واضح طور پر اختیارات کی تقسیم کر دی گئی تھی اور اقتدار کو صدر، وزیراعظم، کابینہ اور صوبوں میں تقسیم کر کے اس کی مرکزیت کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ اس آئین میں کوئی بھی صاحب اختیار نہیں تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس شخص نے آئین بنایا وہی اس کا پہلا شکار بنا۔ چودھری محمد علی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کمال دلیری

کے ساتھ حکومتیں توڑنے اور بنوانے میں نوکر شاہی کا ساتھ دیا۔ وہ حکمرانوں کے اقدامات کا ہر صورت ساتھ دیتے تھے۔ وہ عوامی سیاست دان نہیں تھے اور نہ ہی انہیں اس بات کا تجربہ تھا کہ عوام کے احتجاج سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک عوامی احتجاج سے گھبرا کر انہوں نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وزارت عظمیٰ سے فراغت کے بعد انہوں نے نفاذ اسلام پارٹی تشکیل دی۔ انہوں نے ایوب خان اور فاطمہ جناح کے مابین صدارت انتخابات میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور اس دوران جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

1956ء کا آئین

پے در پے سیاسی بحرانوں اور مسلسل بدلتے حکمرانوں اور حکومتوں کے باعث پاکستان کا آئین بننے میں نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ جواہر لعل نہرو کہتے تھے کہ وہ اتنی جلدی اپنی دھوتی بھی نہیں تبدیل کرتے جتنی جلدی پاکستان میں حکومت بدل جاتی ہے۔ بہر حال 23 مارچ 1956ء کو پہلے آئین کے نفاذ سے پاکستان ایک جمہوری ریاست اور ریپبلک بنا اور برطانیہ کی ڈومینین کے درجے سے ایک آزاد مملکت میں تبدیل ہو گیا۔ اس آئین کے تحت ایک وفاقی پارلیمانی حکومت قائم ہوئی جس میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے کردار واضح کر دیے گئے تھے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی الگ الگ فہرستیں بن گئیں۔ ایک فہرست ایسی بھی بنی جو مشترکہ تھی۔ پاکستان کی شہریت وفاقی بنیاد پر مقرر ہوئی اور صوبوں کی الگ الگ شہریت کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

ہر بالغ شخص کو حق رائے دہی دیا گیا اور اسمبلیوں کی مدت پانچ سال رکھی گئی۔ ملک کی جغرافیائی صورت کے مدنظر صوبائی حکومتوں کو بہت سی خودمختاری دی گئی۔ حسین شہید سہروردی کے الفاظ میں صوبے 98 فیصد خودمختار تھے۔ غرضیکہ یہی واقعتاً ایک جمہوری آئین تھا جس کا مقصد ملک میں اسلامی اقدار پر مبنی سیاسی عمل جاری کرنا تھا۔ گو اس آئین کو وضع

ہونے میں تاخیر ہوئی لیکن یہ عوامی امنگوں پر پورا اترتا تھا اور ملک کے دونوں حصوں میں یکساں مقبول تھا۔ ہر ملک کا آئین اس کے باشندوں کے لیے مقدس ہوتا ہے۔ جب حکومتیں بنتی ہیں یا اعلیٰ ترین عہدیدار اپنے منصب پر تعینات ہوتے ہیں تو سب کے سب اسی آئین کی برتری کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے تحفظ اور اطاعت کا حلف اٹھاتے ہیں۔ آئین کی خلاف ورزی جرم اور اس کے خلاف سازشیں بغاوت سے تعبیر کی جاتی ہیں اور ایسی بغاوت کی سنگین ترین سزا مقرر ہے۔ یہ قانون کسی ایک ملک کا نہیں بلکہ دنیا بھر کے مہذب ممالک میں نافذ ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں فوج کے چند سربراہ جرنیلوں نے ہمارے آئین کے تحفظ اور اطاعت کا حلف اٹھانے کے بعد اسے کچلا، معطل کیا، تبدیل کیا اور متعدد بار بالکل منسوخ کر دیا۔ آئین کے ساتھ یہ سلوک اسی معاشرے میں ہوسکتا ہے جو سیاسی اور اخلاقی ضمیر سے بالکل بے بہرہ ہو یا پھر جہاں عوام کو بندوق کی نالی کے سامنے رکھ کر بے بس کر دیا جائے۔ 1956ء کے آئین کے نفاذ سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء اور انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ 1947ء خود بخود کالعدم ہو گئے اور ایک مستقل نظام معرض وجود میں آ گیا جسے کم از کم پاکستانی عوام ضرور مستقل سمجھتے تھے۔ جب 1959ء کے اوائل میں عام انتخابات کا اعلان ہوا تو ملک میں سیاسی عمل جاری ہو گیا۔ تاخیر تو ہوئی لیکن لوگ اسی نظام کے تحت اجتماعی زندگی کے متمنی تھے۔ یہ اس خواب کی تعبیر تھی جو برصغیر کے مسلمانوں نے دیکھا اور جس کی خاطر لاکھوں جانیں قربان ہوئیں اور پھر کہیں جا کر یہ دن آیا۔

حسین شہید سہروردی

چودھری محمد علی کے استعفے کے بعد نئے وزیراعظم کے چناؤ کا مرحلہ پیش آیا تو صدر سکندر مرزا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم مقرر کر دیں۔ سکندر مرزا کا کہنا تھا کہ ایسا ان کی لاش سے گزر کر ہی ممکن ہے۔ مگر حالات نے انہیں اپنا ارادہ

تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ سہروردی ایک زیرک سیاست دان تھے۔ قائداعظم خود چاہتے تھے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور مشترکہ ہندوستان کے صوبے بنگال میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالیں۔ سہروردی جناح صاحب کی توقعات پر پورا اترے۔ سیاسی میدان میں مصروفیات کے ساتھ وہ ایک خوش مزاج اور بزلہ سنج انسان بھی تھے۔ ان کا شمار انتہائی قابل وکلا میں ہوتا تھا۔ مقدمات کے دوران وہ صرف دلائل سے کام ہی نہیں لیتے تھے بلکہ اشعار بھی سناتے تھے۔ عدالتوں میں ان کی کارکردگی مثالی ہوتی تھی۔ جن مقدمات کی سماعت میں وہ پیش ہوتے تھے، لوگ عموماً ان کے دلائل سننے کے لیے عدالت میں کھنچے چلے آتے تھے۔ سہروردی نے 1937ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اسی برس انڈین لجسلیٹو اسمبلی کا الیکشن بھی جیتا تھا۔ مسلم لیگ بنگال کے صوبائی سیکرٹری ہونے کے ناطے انہیں بنگال کے وزیراعلیٰ فضل الحق کے ساتھ کام کا موقع ملا۔ انہوں نے بنگال میں مسلم لیگ کو متحرک کیا اور عوام میں جماعت کی مقبولیت بڑھانے میں کامیاب رہے۔ اس کا نتیجہ کچھ یوں سامنے آیا کہ مسلم لیگ نے 250 میں سے 170 نشستیں جیت لیں۔

سکندر مرزا کی صدارت میں وزیراعظم بننے کے بعد انہوں نے ملک کو پارلیمانی جمہوری انداز میں بلانے کی کوشش کی۔ سہروردی نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین پل کا کردار ادا کیا۔ کے دونوں بازوؤں کو برابر قرار دلوانا ان کا بڑا سیاسی کارنامہ ہے۔

پاکستان کی ترقی میں کلیدی حیثیت رکھنے والی گوادر بندرگاہ بھی سہروردی نے سلطنت عمان سے خرید کر ملک کا حصہ بنائی۔ انہوں نے ملک کی اقتصادی حالت میں بہتری، افواج پاکستان کی پیشہ وارانہ صلاحیت میں اضافے اور ملک میں توانائی کا بحران حل کرنے کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ سہروردی صدر سکندر مرزا کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے یہی وجہ تھی کہ باامر مجبوری انہیں وزیراعظم مقرر کرنے کے بعد بھی سکندر مرزا نے ان کے خلاف سازشیں اور جوڑ توڑ پر مبنی کھیل جاری رکھا۔ سکندر مرزا سے اختلافات کے

نتیجے میں سہروردی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے یا انہیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ سہروردی کا دور اقتدار ایک برس پر محیط ہے مگر اسے لیاقت علی خان کے بعد ایوب آمریت سے پہلے کی حکومتوں میں سب سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔انہوں نے دیگر سیاست دانوں کے برعکس ایوب حکومت کے وضع کردہ قوانین کے خلاف عوام میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔تاہم انہیں ساتھی سیاست دانوں کی جانب سے خاطر خواہ حمایت نہ مل سکی۔

ایوب خان کے دور حکومت میں بدنام زمانہ ایبڈو قانون کے تحت سہروردی کو جیل میں بھی ڈال دیا گیا اور ان کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ 1963ء کے اوائل میں انہیں دل کا دورہ پڑا۔وہ علاج کی غرض سے یورپ گئے۔واپسی پر آرام کے لیے وہ بیروت کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے جہاں انہیں ایک مرتبہ پھر دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے کچھ عرصہ قبل سہروردی کی صاحبزادی بیگم اختر سلیمان کا انٹرویو شائع ہوا جس میں انہوں نے انکشاف کیا کہ ان کے والد طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ انہیں نوکر شاہی نے ایک سازش کے تحت مروایا تھا۔

ملکی تاریخ کے گنے چنے دیانت دار اور شفاف حکمرانوں میں شمار ہونے والے سہروردی کی میت لبنان سے پاکستان لانے کے لیے ان کے اہلخانہ کے پاس خاطر خواہ رقم ہی نہ تھی۔چنانچہ ان کی صاحبزادی نے والد کی میت وطن واپس لانے کے لیے حکومت پاکستان سے درخواست کی جس پر ان کی میت جہاز کے ذریعے واپس لانے کا بندوبست کیا گیا۔ بلاشبہ حسین شہید سہروردی کا شمار پاکستان کے معدودے چند ایسے نیک نام سیاست دانوں میں ہوتا ہے جنہیں وقت ملتا تو وہ ملک کی تقدیر بدل سکتے تھے۔تاہم شاید قدرت کو ابھی پاکستان کے مزید کئی امتحان مقصود تھے۔

سہروردی کے بعد تحریک پاکستان کے ایک اور رہنما آئی آئی چندریگر کو وزارت عظمیٰ سونپی گئی۔ چندریگر اس وقت اپوزیشن میں تھے۔کہا جاتا ہے کہ سکندر مرزا کی جانب

سے وزارت عظمیٰ قبول کرنا چندریگر کا درست فیصلہ نہیں تھا۔ انہیں ری پبلکن پارٹی سے مل کر مخلوط حکومت بنانا پڑی۔ یہ حکومت چند ماہ ہی چل پائی اور دسمبر 1957ء میں اصول پسند چندریگر کو احساس ہو گیا کہ سکندر مرزا کے ماتحت کٹھ پتلی حکومت میں وہ ملک کے لیے کوئی تعمیری سرگرمی انجام نہیں دے پائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا جس کے بعد اس عہدے کے لیے قرعہ فال فیروز خان نون کے نام نکلا۔ جس روز آئی آئی چندریگر نے استعفیٰ دیا اسی روز فیروز خان نون نے وزارت عظمیٰ سنبھالی۔ اس کے ساتھ ساتھ دفاع، اقتصادیات، دولت مشترکہ، ریاستوں، سرحدی علاقہ جات، امور کشمیر اور قانون کے محکمہ جات بھی انہی کے پاس تھے۔ فیروز خان نون کی وزارت عظمیٰ ایک سال بھی نہ چل سکی اور اکتوبر 1958ء میں صدر سکندر مرزا نے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں اور فیروز خان نون کو گھر بھیج دیا گیا۔

سکندر مرزا نے اسمبلیاں توڑنے کے بعد ملک میں مارشل لاء نافذ کیا اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ سکندر مرزا کا خیال تھا کہ وہ ایوب خان کی طاقت استعمال کرتے ہوئے طویل عرصہ تک حکومت کر سکیں گے۔ ادھر ایوب خان کو سکندر مرزا کی صدارت میں اپنے اختیارات کا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے خوف سمایا ہوا تھا۔ سکندر مرزا سیاست کا شاطر کھلاڑی تھا جبکہ جنرل ایوب خان کے پاس فوج کی طاقت تھی۔ دونوں مل کر حکومت تو کر رہے تھے مگر ایک دوسرے سے خوفزدہ بھی رہتے تھے کہ نہ جانے کون کب پہلا وار کر دے۔

اگرچہ جنرل ایوب خان کو ملکی معاملات چلانے کے مکمل اختیارات حاصل تھے مگر وہ سکندر مرزا کی بطور صدر بالادستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس خاموش سیاسی کشاکش میں ایوب خان اکتوبر 1958ء میں مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے تو ان کے پیچھے کراچی میں اس دلچسپ داستان کا آغاز ہوا جس نے پاکستان میں پہلے فوجی مارشل لاء کی بنیاد رکھی۔

ایوب خان کی عدم موجودگی میں سکندر مرزا نے فضائیہ کے چند اعلیٰ حکام کو فوج کے بعض سینئر افسروں کی گرفتاری کا حکم دیا جن میں یحییٰ خان بھی شامل تھے۔ بوجوہ ان احکامات کی تعمیل نہ ہوسکی اور اسی دوران ایوب خان مغربی پاکستان واپس آ گئے اور سکندر مرزا کے احکامات بارے تمام تفصیلات انہیں موصول ہوگئیں۔ اب نیام میں دو تلواروں کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ تاریخی حوالوں کے مطابق ایوب خان نے جنرل اعظم خان، جنرل برکی، جنرل شیخ اور بعض دیگر فوجی افسروں کو سکندر مرزا سے استعفیٰ لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب فوجی افسروں کا یہ گروہ صدر سے استعفیٰ لینے گیا تو وہ بیڈ روم میں سو رہے تھے۔ فوجی افسران نے ان کی اہلیہ بیگم ناہید سکندر سے صدر کو بلانے کے لیے کہا تو وہ چیخنے چلانے لگیں۔ اسی دوران سکندر مرزا پستول ہاتھ میں لیے نمودار ہوئے مگر فوجی افسروں کو دیکھ کر انہوں نے صورتحال کا اندازہ لگالیا اور بولے ''کیا تم میرا استعفیٰ ساتھ لائے ہو؟'' جرنیلوں نے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیے اور سکندر مرزا نے بلا چوں چراں ان کاغذات پر دستخط کر دیے۔

سکندر مرزا اور ان کی اہلیہ غریب الوطن ہو کر لندن جا بسے۔ وہ سکندر مرزا جس کے سامنے کوئی وزیراعظم آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ جس کا کہا پاکستان میں آئین بھی ہوتا تھا اور قانون بھی، جس کی ہیبت کے نشان سلہٹ کی پہاڑیوں سے لنڈی کوتل تک کندہ تھے، جس کی آنکھ کا اشارہ اقتدار کی راہداریوں کا تعین کرتا تھا، جس کی شاطرانہ چالوں نے کئی سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کو کوڑے کا ڈھیر بنا دیا جب وہ جلاوطن ہوا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سکندر مرزا اور ان کی اہلیہ کے پاس دو سوٹ کیس اور تھوڑی سی نقدی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ لندن میں جلاوطنی کے ایام میں انہیں تین ہزار پاؤنڈ پنشن ملتی تھی مگر اس میں ان کا گزارا ممکن نہیں تھا، چنانچہ وہ ایک ہوٹل میں منیجر کے طور پر کام کرنے لگے۔ بیماری کے ایام میں انہوں نے اپنی بیوی ناہید مرزا کو مخاطب ہو کر کہا ''ہم

علاج کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے اس لیے مجھے مرنے دو"

سکندر مرزا نے وفات پائی تو اس وقت پاکستان کے صدر یحییٰ خان نے ان کی میت پاکستان لانے اور یہاں دفن کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ایرانی بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی نے خصوصی طیارے کے ذریعے سکندر مرکزا کی میت تہران لانے کا حکم دیا جہاں ان کی آخری رسومات سرکاری اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں سکندر مرزا کا نام اچھے الفاظ میں محفوظ نہیں ہے۔ انہوں نے اقتدار کی ہوس میں ملک کو عدم استحکام سے دوچار کیا جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں تاہم یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ سکندر مرزا نے اقتدار سے کوئی مالی فائدہ اٹھایا نہ ہی بدعنوانی کے مرتکب ہوئے۔ دراصل اس دور میں اقتدار کی ہوس موجود تھی تاہم شاید دولت کی ہوس نے ابھی پنجے نہیں گاڑے تھے۔ اس دور کے صاحبان اقتدار حکومت کے شیدائی تھے مگر ان کے دامن بدعنوانی سے آلودہ نہیں ہوئے تھے۔ ملک میں کرپشن، اقربا پروری اور لوٹ مار کا کلچر ایوب خان کی دین ہے جنہوں نے ملکی سیاست میں بددیانتی کے ساتھ بدعنوانی کو بھی رواج دیا اور آج یہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔

جبرِ ایوب

بالائی سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کا پہلا آئین 1956ء میں بنا تھا جس کے تحت سکندر مرزا گورنر جنرل کے بجائے صدر پاکستان بن گئے تھے۔ انہیں فوج اور بیوروکریسی کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ لیکن اس جمود میں ایک انقلاب الیکشن کی صورت میں نمودار ہونے والا تھا یا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ آئین بنا تو پورے ملک میں جمہوری تحریک چلی نکلی۔ عوام بیوروکریسی کی حکمرانی سے بیزار ہو چکے تھے اور نمائندہ حکومت کی آمد آمد پر شاداں و فرحاں تھے۔ سکندر مرزا کی مخالفت عام تھی جبکہ ایوب خان کا مدت ملازمت پوری کرنے کے باوجود بار بار توسیع ملازمت کا بندوبست کر لینا بھی عوام کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔

1956ء کے آئین سے پہلے کا عارضی حکومتوں کا سلسلہ اور سیاسی استحکام کا فقدان ختم ہو چکا تھا۔ لوگ خوش تھے کہ بالآخر وہ جمہوریت کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔ سیاسی جماعتیں اپنی صفیں درست کرنے میں اور الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ان حالات میں مارشل لاء لگانے کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز تو ہرگز نہیں تھا البتہ یہ حقیقت ضرور تھی کہ 1959ء میں الیکشن ہو جانے کی صورت میں سکندر مرزا کی بطور صدر پاکستان حکمرانی ختم ہو جاتی اور اس کے ساتھ ساتھ ایوب خان کی سازش کی کھچڑی جو اندر ہی اندر برسوں سے پک رہی تھی، دھری کی دھری رہ جاتی۔ سکندر مرزا جو اپنے آپ کو سازش، دھوکا دہی، گٹھ جوڑ اور دغابازی میں استاد کامل سمجھتا تھا اس گمان میں تھا کہ وہ فوجی جرنیلوں کو استعمال کر کے اپنا اقتدار قائم رکھے گا۔ لیکن یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی کیونکہ کچھ اسی قسم کی چال ایوب خان

نے بھی سوچ رکھی تھی۔ وہ عرصہ دراز سے ملک کی سیاست کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔ مختلف حکومتوں سے تعلقات استوار رکھتا تھا تاکہ اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مدت ملازمت میں توسیع ہوتی رہے۔ سول افسروں سے بھی اس کی ملاقاتیں جاری رہتی تھیں یوں اسے یہ جاننے کا موقع ملتا تھا کہ کون سے افسر دشواریاں پیدا کر سکتے ہیں اور کون ایسے ہیں جنہیں ترقی کا لقمہ دے کر رام کیا جا سکتا ہے۔

ایوب خان نے سیاسی لیڈروں کی بھی کچھ ایسی ہی جانچ پڑتال کر رکھی تھی اور مناسب جگہوں پر دوست بنا رکھے تھے تاکہ وقت آنے پر ان کی مدد میسر آ سکے۔ اکتوبر 1958ء میں فوجی اقتدار کے ساتھ ہی آئین منسوخ کر دیا گیا اور ملک میں آمریت کا پہلا دور شروع ہوا۔ مشہور مقدمہ ''عاصمہ جیلانی بنام سرکار'' میں سپریم کورٹ نے ڈوسو کیس کا حوالہ دیتے ہوئے ایوب خان کے مارشل لاء کے بارے میں لکھا ہے:

> ''جیسا کہ ایک مبصر نے کہا ہے، ایک معقول ملک کو دنیا کے لیے تمسخر کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ایک ایسا ملک جو ایک تحریری آئین کے تحت معرض وجود میں آیا، جس آئین میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات وضاحت سے تقسیم کر دیے گئے تھے، اس ملک پر ایک آمرانہ نظام مسلط کر دیا گیا۔ اس کے بعد عوام جو خدائے بزرگ و برتر کے عطا کردہ اقتدار کے وارث تھے، حکومت کے نظام اور بست و کشاد سے الگ کر دیے گئے اور ایک آمر ان پر یوں حکومت کر رہا ہے جیسے کوئی غیر ملکی فاتح جرنیل شکست خوردہ رعایا پر کرتا ہے''

عوام کو مارشل لاء لگانے کا کوئی تسلی بخش جواز نہیں دیا گیا تھا کیونکہ ملک میں کسی قسم کے ہنگامے، بدامنی یا قانون شکنی کی کوئی واردات نہیں تھی اس لیے جواز موجود ہی نہ تھا۔ ملک کی ہر محرومی کے لیے سیاست دانوں اور سیاسی عمل کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں اور نہ

ہی مارشل لاء کا جواز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا طاقت اور تشدد کا استعمال کیا گیا اور خوف کی فضا میں لوگوں کو فوجی اقتدار قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایوب خان کے مارشل لاء آرڈرز اور ریگولیشنز کو ملک کے تمام قوانین پر فوقیت حاصل تھی اور عدالت کو ان سے متعلق کوئی سماعت یا کارروائی کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ معمولی جرائم کے لیے ہولناک سزائیں مقرر تھیں۔ مارشل لاء اور افواج پاکستان کی شان میں گستاخی نہایت سنگین جرم تھا۔ مارشل لاء کی پالیسی اور ضروریات کے مطابق عدالتیں قائم کر دی گئیں جہاں خاص قسم کا انصاف میسر آتا تھا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے تمام دفاتر اور محکمہ جات فوجی افسروں کے ماتحت کر دیے گئے۔ اضلاع میں ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر میں بھی فوجی افسر متعین ہوئے تاکہ ضلع کی انتظامیہ پر نظر رکھ سکیں۔ انٹر سروسز انٹیلی جنس کا دائرہ کار ہمیشہ فوجی معاملات تک محدود ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس کو وسیع تر کر کے تمام سیاسی امور بھی اس میں شامل کر دیے گئے۔ اسی طرح سول انٹیلی جنس میں بہت سے فوجی افسروں کو تعینات کر دیا گیا۔ وفاقی اور صوبائی افسروں کی بڑی تعداد کو کسی الزام، چارج شیٹ اور صفائی کا موقع دیے بغیر ریٹائر یا برخواست کر دیا گیا۔ چونکہ سول نوکر شاہی طویل عرصہ سے ملک کی انتظامیہ اور سیاست پر چھائی ہوئی تھی لہٰذا اس کا زور توڑنے اور نظام کار میں شامل ہونے والے سول بیوروکریٹس کو مکمل طور پر مغلوب کرنے کے لیے یہ نسخہ بے حد کارآمد رہا۔ اس چھانٹی کے بعد نوکر شاہی مودب اور وفادار بن گئی۔ سیاسی رہنماؤں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں اور عوام کو اپنے رہنماؤں سے الگ کر کے ہر قسم کے سیاسی عمل کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے سے تیار شدہ خصوصی قوانین نافذ کیے گئے جن کے تحت سیاست دانوں پر مقدمے چلائے گئے۔ ان مقدمات کا مقصد یہ تھا کہ سیاست دان طویل عرصہ کے لیے سیاست میں حصہ لینے کے اہل نہ رہیں اور بہر صورت اتنے عرصے کے لیے مقدمات کی پیروی میں مصروف رہیں کہ مارشل لاء کے ٹولے کو ملک پر گرفت مضبوط کرنے کا موقع مل جائے۔ تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں اور سیاسی کردار و

گفتار پر قدغن لگا دی گئی۔ اجتماعی سیاسی کارروائی اور تحریر و تقریر پر بھی پابندی لگ گئی۔ نجی میٹنگ بھی جرم قرار پائی اور پانچ یا زیادہ لوگوں کا مل کر چلنا بھی جرم ہو گیا۔

آئین منسوخ کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسمبلیاں اور وفاقی و صوبائی حکومتیں بھی ختم کر دی گئیں۔ عوام کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے، عدلیہ کے اختیارات کو بڑی حد تک محدود کر دیا گیا، فوجی عدالتیں قائم ہوئیں اور اس طرح مارشل لاء کے ٹولے نے ملک کی انتظامیہ پر آہنی گرفت حاصل کر لی۔ سیاست کی زبان گنگ ہو گئی، عوام سہم کر گھروں میں بند ہو گئے اور ملک کے مختلف حصوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ وفاقی سطح پر کابینہ تشکیل دی گئی جس میں نصف ارکان افواج پاکستان اور نصف نوکر شاہی سے لیے گئے تھے جن کا عوام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبہ جات میں فوجی گورنر مقرر کیے گئے جنہوں نے اپنی وزارتیں خود تشکیل دیں۔ ان وزارتوں میں وزراء اور مشیر شامل تھے۔

فوجی عدالتیں قائم رہیں اور قوم پر دباؤ رکھنے کے لیے مارشل لاء آرڈر اور ریگولیشن باقاعدگی سے جاری ہوتے رہے۔ گوکہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے بعد سیاست دانوں پر یہ الزام تو لگ سکتا ہے کہ انہوں نے ملک کو درپیش مسائل کے حل میں تساہل سے کام لیا لیکن آئین کو منسوخ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس آئین میں ہر وہ شق موجود تھی جو ملک کو درست سمت کی جانب گامزن کر سکتی تھی۔ اگر اس آئین میں کچھ نہیں تھا تو وہ ایوب خان کے لیے تازیست اقتدار کی ضمانت تھی جو انہیں آئینی اور جمہوری طریقے سے نہیں مل سکتی تھی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایوب خان فوجی اعتبار سے قابل افسروں میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ جب پاکستان بنا تو بریگیڈیئر ایوب خان سنیارٹی کے اعتبار سے دسویں نمبر پر تھے۔ 1948ء میں انہیں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور اگلے برس کمانڈر مشرقی پاکستان کی ذمہ داریاں دے دی گئیں۔ 1951ء میں انہیں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر

ترقی دے کر پہلے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار خان (میجر جنرل اکبر خان کے بھائی) کا نائب بنا دیا گیا۔

جنرل گریسی کے بعد سنیارٹی کے اعتبار سے جنرل افتخار خان کو ہی بری فوج کا پہلا مقامی سربراہ بننا تھا لیکن وہ 1949ء میں ایک اعلیٰ عسکری کورس میں شرکت کے لیے برطانیہ جاتے ہوئے ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ چنانچہ جنرل گریسی ریٹائر ہوئے تو ایوب خان کو اگلے دن فور سٹار جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر بری فوج کی سربراہی سونپ دی گئی۔ گو نئے ملک میں سنیارٹی کے اعتبار سے میجر جنرل اکبر خان سب سے تجربہ کار افسر تھے اور انہوں نے کشمیر کی جنگی منصوبہ بندی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا لیکن وہ اور جنرل گریسی ایک دوسرے سے خوش نہیں تھے چنانچہ قیادت کا ہما ایوب خان کے سر پر بیٹھ گیا۔ دوسری جانب کشمیر میں ناکامی سے دلبرداشتہ جنرل اکبر خان بعد ازاں راولپنڈی سازش کیس میں ایک اور میجر جنرل نذیر احمد کے ساتھ ماخوذ ہوئے۔ پنڈی سازش کیس ایوب خان کے کمانڈر انچیف بننے کے بعد سامنے آیا۔ مذکورہ دونوں جرنیل ایوب خان سے سینئر تھے۔ جنرل گریسی کے سابق اے ڈی سی میجر جنرل وجاہت حسین کے بقول 1956ء کے اوائل میں جب ان کی گریسی سے لندن میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا ''ایوب ملک پر کب قبضہ کر رہا ہے؟''

گریسی کے بقول انہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان کو خبردار کر دیا تھا کہ ذرا دھیان رکھنا، ایوب اونچی ہواؤں میں ہے۔ ایوب خان کی ڈائریوں کا ڈیفنس جرنل میں ریویو کرنے والے نقاد جمیل ماجد کے مطابق ایوب خان نے دوسری عالمی جنگ کا اختتامی عرصہ برما کے محاذ پر گزارا تھا۔ برٹش کامن ویلتھ آفس کی ڈی کلاسیفائیڈ دستاویزات میں ایک نوٹ یہ بھی شامل ہے کہ برما میں لیفٹیننٹ کرنل ڈبلیو ایف براؤن کی ہلاکت کے بعد ان کے نائب لیفٹیننٹ کرنل ایوب خان کو رجمنٹ کی کمان سونپی گئی لیکن جنگی حکمت عملی میں

بزدلانہ ناکامی کے سبب ان سے کمان واپس لے کر لیفٹیننٹ کرنل ہیو پیئرسن کے حوالے کر دی گئی اور ناقص کارکردگی پر ایوب خان کی ملازمت سے چھٹی کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔

1969ء میں ایوب خان کی صدارت سے سبکدوشی کے لگ بھگ ڈیڑھ ماہ بعد برطانوی ہائی کمیشن نے برطانوی سیکرٹری خارجہ کو جو نوٹ بھیجا اس کے مطابق ایوب خان عسکری حکمت عملی کے اعتبار سے اوسط درجے کے افسر تھے۔ روزمرہ گفتگو میں بھی وہ اپنی سابقہ فوجی زندگی کا تذکرہ اکثر ٹال جاتے اور دورے پر آنے والے فوجی افسروں سے ملاقات کے بھی خاص متمنی نہیں ہوتے تھے مبادا کہ ان کا عسکری علم آشکار نہ ہو جائے۔ بہرحال کمانڈر انچیف بننے کے بعد ان کی سیکرٹری دفاع سکندر مرزا اور گورنر جنرل غلام محمد کے ساتھ گاڑھی چھننے لگی۔ اس اثر ورسوخ کے سبب یہ چمتکار بھی ہوا کہ محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں حاضر سروس کمانڈر انچیف کو دس ماہ کے لیے وزیر دفاع کا قلمدان بھی مل گیا۔

اکتوبر 1958 کو ایوب خان کے پاس وزارت دفاع کا قلمدان دوبارہ آ گیا اور پھر یہ عہدہ انہوں نے اگلے آٹھ برس یعنی اکتوبر 1966 تک اپنے پاس رکھا اور پھر ایڈمرل اے آر خان کے حوالے کر دیا۔ بوگرہ حکومت تو چلتی ہوگئی لیکن ایوب خان کو 1955ء میں بطور کمانڈر انچیف مزید چار برس کی توسیع مل گئی۔ جون 1958ء میں جب دوسری توسیعی مدت ختم ہونے میں سال بھر باقی تھا تو صدر سکندر مرزا کے دباؤ پر فیروز خان نون حکومت سے مزید دو برس کی پیشگی توسیع مل گئی حالانکہ فیروز خان نون اگلا کمانڈر انچیف میجر جنرل نواب زادہ جنرل شیر علی خان پٹودی کو دیکھ رہے تھے اور بقول الطاف گوہر کمانڈر انچیف ایوب خان کو یہ گوارا نہ تھا جن کا فوجی علم بقول جنرل شیر علی پٹودی محض بیرک اور بٹالین تک محدود تھا۔ جنرل شیر علی کو 1958ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ملائشیا میں ہائی کمشنر بنا کر بھیج دیا گیا اور دس برس بعد وہ یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات بن کر نمودار ہوئے۔

اکتوبر 1958ء میں جب صدر سکندر مرزا نے کمانڈر انچیف ایوب خان کو پہلا

ملک گیر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا تو بظاہر لگتا تھا کہ مارشل لاء سکندر مرزا کی خواہش پر لگا۔ لیکن برطانوی دفتر خارجہ کی ڈی کلاسیفائیڈ دستاویزات کے مطابق کراچی میں متعین برطانوی فوجی اتاشی نے یہ نوٹ لکھا کہ ”سات اکتوبر کے مارشل لاء کی منصوبہ بندی دو ہفتے پہلے راولپنڈی میں سینئر فوجی افسروں کا ایک گروپ کر چکا تھا“

اسی طرح ایک اور سفارتی نوٹ کے مطابق ایوب خان نے کئی مہینے پہلے ہی یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ صورت حال بگڑی اور اگلے انتخابات میں تسلی بخش نتائج کے آثار نظر نہ آئے تو فوج کو بادل ناخواستہ کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ الطاف گوہر لکھتے ہیں کہ ”سکندر مرزا نے مارشل لاء کے نفاذ سے بہت پہلے وزیر خزانہ ملک امجد علی اور کمانڈر انچیف ایوب خان کو یہ فرض سونپا کہ وہ امریکیوں کو بتائیں کہ اگر فروری 1959ء میں عام انتخابات ہوئے تو کمیونزم کی طرف جھکاؤ رکھنے والی بائیں بازو کی قوتوں کی کامیابی کا واضح خطرہ موجود ہے۔ ایوب خان نے یہ جتانے کے لیے مارشل لاء سے چھ ماہ قبل اپریل میں امریکا کا دورہ کیا۔

پچاس کی دہائی میں امریکا نے بھی قرائن سے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ پاکستان میں فوج اقتدار پر قبضہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے اور یہ واقعہ جلد ہی رونما ہونے والا تھا۔ بعد میں پیش آنے والے حالات کے مطابق خود ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان کا کہنا تھا کہ اس فوجی پلان میں امریکی سی آئی اے کا بھی ہاتھ تھا۔ چنانچہ الیکشن اور اس کے نتائج کے خوف سے سکندر مرزا صدر اور ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ مارشل لاء لگنے سے چار روز بعد امریکی سیکرٹری دفاع پاکستان میں وارد ہوئے اور باہم صلاح مشورے ہونے لگے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جلد ہی ایوب خانے سکندر مرزا کو معزول کر کے صدر کا عہدہ بھی اختیار کر لیا اور یوں فوج کے سربراہ نے ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں پاکستان کو دونیم کر کے رکھ دیا، بنیادی قوانین اور اداروں کی جڑیں ہلا دیں اور قوم و قومیت کا تصور پارہ پارہ کر دیا۔ ایوب خان کے برسر اقتدار آتے ہی امریکا نواز

پالیسیوں کا دور شروع ہو گیا۔ اس دور میں فارن افیئر ز جرنل نامی جریدے میں ایوب خان کا مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے ببانگ دہل کہا کہ:

''پاکستان نے واضح طور پر مغرب کے ساتھ اپنی شناخت کا اعلان کر دیا ہے اور بعض دوسرے ملکوں کی پالیسی سے ہٹ کر ہم نے کمیونسٹ ممالک سے مکمل علیحدگی اور ان سے ہر قسم کی مدد سے دست برداری اختیار کر لی ہے۔ ہم کسی دوغلے پن کی حکمت عملی پر ہرگز یقین نہیں رکھتے''

کچھ عرصہ بعد امریکی کانگریس سے خطاب میں ایوب خان کا کہنا تھا کہ:

''براعظم ایشیا میں پاکستان واحد ملک ہے جس کی سرزمین پر امریکی فوجیں ''آزاد دنیا'' (سامراجی یا سرمایہ دار ممالک) کے دفاع کی خاطر قیام پذیر ہو سکتی ہیں''

1959ء میں جب ایوب خان کو اقتدار سنبھالے بمشکل چند ماہ گزرے تھے، پشاور کے قریب بڈابیر میں امریکا کو ایک خفیہ اڈہ بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ معاہدہ خفیہ رکھا گیا اور پاکستانیوں کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی۔ یہ ہوائی اڈہ دراصل سی آئی اے کا مرکز تھا جہاں سے خاص قسم کے اونچی اڑان والے ہوائی جہاز ''یو2'' روس کی سرزمین کے اوپر پرواز کرتے اور روسی مواصلاتی نظام اور دیگر فوجی اداروں کی جاسوسی کرتے تھے۔ امریکا نے ایوب خان کو یقین دہانی کرا رکھی تھی کہ یو2 جہاز اتنی بلندی پر اڑتے ہیں کہ کوئی روسی طیارہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا یو2 روسی ہوابازوں کی دسترس سے باہر اور ناقابل تسخیر ہے۔ اس دعوے کا پول اس وقت کھل گیا جب روسیوں نے یو2 طیارہ مار گرایا اور اس کے پائلٹ گیری پاورز کو زندہ حراست میں لے لیا۔ گیری پاورز نے دوران تفتیش تمام حالات من وعن بیان کر دیے اور پاکستان کے اس معاملے میں ملوث ہونے کا راز بھی افشا

ہو گیا۔اس موقع پر روس نے پاکستان کو سخت تنبیہ کی اور کہا کہ ہم نے اپنے نقشوں میں پشاور کے گرد سرخ دائرہ لگالیا ہے تا کہ وقت آنے پر اس شہر کو نشانہ بنایا جا سکے۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ اگر آئندہ پاکستان کی سرزمین سے کوئی امریکی طیارہ روس میں داخل ہوا تو پاکستان کو اس جرم کی قرار واقعی سزا بھگتنا پڑے گی۔اس واقعے کے بعد یو2 کی پروازیں تو بند ہو گئیں لیکن بڈابیر کا اڈہ بدستور امریکی جاسوسوں کا مرکز بنا رہا۔امریکی سی آئی اے نے ایوب خان پر دباؤ ڈال کر کراچی میں بھی جاسوسی کا ایک خاص ادارہ کھول دیا۔ بظاہر یہ ادارہ پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کا حصہ کہلاتا تھا لیکن دراصل یہ صرف پاکستانی سٹاف کو استعمال کرتا تھا اور اس کا تمام کاروبار امریکی افسر ہی چلاتے تھے۔پاکستانی حکام کو اس ادارے کی کوئی رپورٹ دی جاتی تھی اور نہ ہی کسی کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار تھا۔ یہ ادارہ تمام اشتراکی ممالک کے سفارت خانوں کے خلاف جاسوسی کرتا تھا۔اس کی تیز رفتار گاڑیاں سفارت کاروں کا پیچھا کرتی تھیں اور مختلف ممالک کے قونصل خانوں کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے جاتے تھے۔ ان کارروائیوں سے دو مقاصد حاصل ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ اشتراکی سفارت کاروں کی آمد و رفت اور گفت و شنید سے ان کی سرگرمیوں کی معلومات حاصل ہوں اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ میزبان ملک یعنی پاکستان کی اس جارحانہ جاسوسی سے برگشتہ ہوں کیونکہ بظاہر تعاقب کرنے والے تو پاکستانی ہی نظر آتے تھے۔لہٰذا اشتراکی ممالک اور پاکستان کے درمیان فاصلے پیدا کرنے کی یہ ایک اور چال بھی تھی۔

کوئی بھی غیرت مند ملک اپنی سیکیورٹی سروس میں کسی غیر ملک کو اس قدر دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ انٹیلی جنس بیورو کے چند محب وطن اور حساس افسروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور بصد مشکل ایوب خان کو مجبور کیا کہ یہ سلسلہ ختم کیا جائے۔ ایوب خان نے اپنے دور حکومت میں امریکی پالیسیوں کی مکمل اطاعت کی۔ ستمبر 1959ء میں امریکا کے اشارے پر وہ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملے اور مشترکہ

دفاع کے معاہدے کی تجویز دی جسے نہرو نے رد کر دیا۔ اس کے بعد ایوب خان نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے بھی اپیل کی مگر یہاں بھی سرد مہری کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ کسی مقام پر بھی خود امریکا نے بھارت کو کسی سمجھوتے کی طرف مائل کرنے کی نہ تو کوشش کی اور نہ ہی ایوب خان یا پاکستان کی خاطر بھارت کے خلاف کوئی غیر دوستانہ بیان دیا۔ امریکا کے لیے بھارت کی خوشنودی ہر قیمت پر خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی دانست میں یہ خطے پر اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کی پہلی کڑی ہے۔ ایک موقع ایسا بھی تھا جب خود امریکا پاکستان اور بھارت میں مسئلہ کشمیر حل کرانے کا خواہش مند تھا مگر بھارت کے تیور دیکھ کر وہ فوری پیچھے ہٹ گیا کہ بھارت کو ناراض کرنا گویا امریکی مفادات پر ضرب تھی۔

1959ء میں امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس کی وفات کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ ڈلس معاہدوں کے ذریعے اتحاد قائم کرنے کا زبردست حامی تھا۔ عراق میں عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹے جانے کے بعد عراق اس معاہدے سے نکل گیا جسے بغداد پیکٹ کہا جاتا تھا جو بعد میں ''سینٹو'' کے نام سے زندہ رہا۔ لیکن اب اس معاہدے میں امریکی دلچسپی بھی قدرے کم ہو گئی تھی۔ اگر اس دور میں شائع ہونے والے ٹائم میگزین کے شمارے دیکھے جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ 1960ء کے لگ بھگ معاہدوں کی جگہ غیر جانبداری کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا امریکا نے پاکستان کو نظر انداز کر کے بھارت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ خصوصاً 1962ء میں جب بھارت اور چین کے مابین سرحدی جھڑپوں میں بھارتی فوج کو بری طرح شکست ہوئی تو امریکا نے موقع غنیمت جان کر بھارت کو ہر قسم کا فوجی ساز و سامان مہیا کرنے کی پیش کش کر دی اور بہت سی امداد بھی دی۔ اسی برس چین اور پاکستان کے درمیان سرحدی حد بندی کے لیے گفت و شنید شروع ہوئی اور دونوں ممالک میں دوستانہ معاہدے کی شروعات بھی ہونے لگیں۔ امریکا پاکستان کی اس حرکت پر مزید ناراض ہوا اور پاک امریکا تعلقات میں خلیج پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر

پاکستان نے امریکا کے ساتھ سیاسی اور فوجی معاہدوں پر نظر ثانی کا عندیہ دیا۔ کہنے کو تو یہ بات کہہ دی گئی لیکن حقیقی صورت حال یہ تھی کہ پاکستان امریکی قرضہ جات اور دیگر امداد پر اس قدر انحصار کیے ہوئے تھا کہ اس مکڑی کے جال سے نکلنا خارج از امکان دکھائی دیتا تھا۔ 1964ء میں ایک بھارتی اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ''دس سال کی مستقل دوستی کے بعد بھی امریکا نے پاکستان کے سب سے بڑے مسئلے یعنی مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا کیونکہ اس میں بھارت کی ناراضگی کا خوف ہے۔ بایں ہمہ جب تک ایوب خان اقتدار میں ہے پاکستان مغرب کے ساتھ ہی وابستہ رہے گا اور ایوب خان کے بعد بھی مغرب کے سوا کون ہے جو پاکستان کو وہ تمام فوجی واقتصادی امداد دے جس پر اب وہ مکمل انحصار کیے ہوئے ہے''

1962ء کا آئین

فروری 1960ء میں ایوب خان نے سابقہ چیف جسٹس مسٹر جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا۔ جسٹس شہاب الدین ایک نہایت دیانت دار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک جج تھے جنہیں ملک کے دونوں حصوں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود ایوب خان نے ان کی حب الوطنی اور خلوص کا اعتراف کیا تھا۔ شہاب الدین نے آئینی کمیشن کی سربراہی اس شرط پر قبول کی تھی کہ ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور ان کی رپورٹ قبول ہو یا نہ ہو شائع ضرور کی جائے گی۔

اس کمیشن نے ایک طویل سوالنامہ شائع کیا اور ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے انٹرویو کیے گئے۔ خصوصاً ان رہنماؤں کی رائے لی گئی جن کا عوام سے براہ راست رابطہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پختہ

اور منجھے ہوئے سیاست دان سامنے آئے جن میں نورالامین، عطاء الرحمان اور چودھری محمد علی وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے آئین پر رائے دینے سے پہلے آئین کی منسوخی اور مارشل لاء کے نفاذ کو چیلنج کر دیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ سکندر مرزا کو نوشتہ دیوار دکھائی دے رہا تھا کہ جونہی الیکشن ہوئے اسے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑیں گے لہٰذا اس نے مارشل لاء لگا دیا۔ان سیاست دانوں کا کہنا تھا کہ مارشل لاء کا ٹولہ کچھ بھی کہے اور سیاست دانوں پر جتنا بھی کیچڑ اچھالا جائے ، اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ ملک میں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

جہاں تک نئے آئین کا تعلق تھا تو سب نے یک زبان ہو کر جمہوری آئین کی حمایت کی۔مختلف طبقات کے لوگوں سے ان کی آراء اور نظریات جمع کر کے کمیشن نے مئی 1961ء میں ایوب خان کو نئے آئین کا مجوزہ ڈرافٹ پیش کر دیا۔اس ڈرافٹ میں وفاقی طرز حکومت، مقننہ اور عدلیہ کی مکمل خود مختاری اور آزادی کی سفارش کی گئی تھی۔عوام کے بنیادی حقوق پر زور دیا گیا اور وفاق وصوبائی اسمبلیوں کے لیے مناسب مالیاتی اختیارات تجویز ہوئے۔ البتہ ان سب سفارشات کے ساتھ صدارتی نظام بھی تجویز کیا گیا۔ عطاء الرحمان کا کہنا تھا چونکہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اس لیے صدارتی نظام مشرقی پاکستان کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ ہونا یہ چاہیے کہ جب صدر ایک حصے سے تعلق رکھتا ہو تو وزیراعظم دوسرے حصے سے چنا جائے۔ صدارتی نظام میں لامحالہ ایک حصہ اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ سے الگ پائے گا جس سے اس حصے کی دل شکنی ہوگی۔تمام ملک کے عوام اقتدار میں شریک نہ ہوں تو جمہوریت ایک ڈھونگ رہ جاتی ہے اور حکومت موثر اور فعال نہیں ہو سکتی۔آئینی کمیشن نے صدارتی نظام حکومت کی سفارش تو کی لیکن اس کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ پاکستان کے عوام کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کا انتخاب خود کریں۔اور اپنی ضروریات وترجیحات کے مطابق قومی

پالیسی تشکیل کریں۔ لارڈ ایکٹن کا مشہور مقولہ ہے کہ "طاقت اور اختیار انسان کو بددیانت بنا دیتے ہیں اور جہاں یہ طاقت ہمہ گیر اور کسی قسم کے محاسبے سے آزاد ہو وہاں بدنیتی بھی ہمہ گیر اور آزادانہ ہو جاتی ہے"

کمیشن نے یہ مقولہ دہراتے ہوئے حتمی طور پر ہر قسم کی آمریت کی مخالفت کی اور کہا کہ پاکستان میں صرف اور صرف نمائندہ حکومت ہی ہونی چاہیے۔ کمیشن کی رپورٹ سے جمہوریت کی بو آ رہی تھی اس لیے ایوب خان نے اسے بلا تامل قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف ایک سفارش منظور کی گئی جو صدارتی نظام سے متعلق تھی۔ جسٹس شہاب الدین سے رپورٹ شائع کرنے کا وعدہ بھی ایفا نہ ہوا اور عوام کو اس کمیشن کی بقیہ سفارشات کے بارے میں اندھیرے میں رکھا گیا۔ جسٹس شہاب الدین کی اشک شوئی کے لیے انہیں ملک کا سب سے بڑا سول ایوارڈ دینے کی کوشش کی گئی تاہم انہوں نے یہ ایوارڈ وصول کرنے سے انکار کر کے با اصول اور باوقار انسان ہونے کا ثبوت دیا۔

جسٹس شہاب الدین لاہور میں رہتے تھے۔ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے گورنر ہاؤس کی تمام تقریبات میں بلائے جانے والے شرفاء میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ لیکن اس واقعے کے بعد انہوں نے گورنر پنجاب سے درخواست کی کہ اس فہرست سے ان کا نام خارج کر دیا جائے اور آئندہ انہیں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری دعوت یا تقریب میں نہ بلایا جائے۔ ایوب خان نے کسی عوامی ردعمل کی پروا کیے بغیر آئینی کمیشن کی رپورٹ رد کر دی اور اپنے مخصوص فلسفے اور مفاد کے مطابق ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کروایا۔ اس نئے آئین میں قرار دیا گیا تھا کہ وفاقی حکومت صدارتی نظام کے تحت ہوگی۔ مرکز میں ایک ہی قومی اسمبلی ہوگی اور اسی طرح ملک کے دونوں حصوں میں ایک ایک صوبائی اسمبلی کام کرے گی۔ تمام اسمبلیاں یک ایوانی ہوں گی اور وفاق کے تمام انتظامی اختیارات صدر کو تفویض ہوں گے جو اپنی مرضی سے کابینہ کے ارکان نامزد کر سکے

گا۔ کابینہ کے ارکان کا منتخب ہونا ضروری نہیں ہوگا اور وزراء صرف صدر کو جواب دہ ہوں گے۔ قومی اسمبلی صدر کو ہٹا نہیں سکے گی اور نہ ہی صدر قومی اسمبلی کو جواب دہ ہوگا۔ صوبائی گورنر صدر ہی کے نامزد کردہ ہوں گے اور وہ بھی صوبائی اسمبلیوں کو جواب دہ نہیں ہوں گے۔ صوبائی گورنر بھی اپنی کابینہ خود منتخب کریں گے۔ صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات بالواسطہ ہوں گے۔ پہلے براہ راست بالغ دہی سے 80 ہزار ارکان (بنیادی جمہوری کے ارکان جنہیں بی ڈی ممبر بھی کہا جاتا تھا) منتخب ہوں گے جو بعد ازاں صدر اور ارکان اسمبلی کا انتخاب کریں گے۔ صدر کے عہدے کے لیے صرف تین امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ بجٹ منظور کرنے کے تمام اختیارات صدر کے پاس ہو گے اور اسمبلی کا اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

اس آئینی مسودے میں عوام کے بنیادی حقوق کا ذکر تو تھا لیکن ان حقوق کے نفاذ کے لیے عدلیہ کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ یہ آئین سیاسی جماعتوں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس آئین کی ساخت صریحاً آمرانہ تھی۔ اختیارات صدر کے ہاتھ میں تھے اور منتخب اسمبلیاں ربڑ کی مہریں تھیں۔ ایک منتخب اسمبلی کی سب سے بڑی طاقت یہ ہوتی ہے کہ انتظامیہ اس کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ چونکہ وفاقی اور صوبائی وزراء جو مختلف محکموں کے سربراہ تھے، اسمبلیوں کے سامنے جواب نہیں تھے اس لیے تمام طاقت صدر اور اس کے نامزد گورنروں میں ہی مرکوز ہو کر رہ گئی تھی اور نام نہاد اسمبلیاں قطعی بے معنی اور بے اثر ہوگئی تھیں۔ منتخب اسمبلی کا دوسرا بڑا اختیار بجٹ پر بحث اور اس کی منظوری ہے۔ یہ اختیار اسے انتظامیہ کی نوک پلک درست رکھنے کا موقع دیتا ہے مگر اس آئین میں اسمبلیوں کو اس اختیار سے محروم رکھا گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ آئین کے مطابق نظام حکومت میں سے سیاست اور سیاست دان یوں نکال پھینکے گئے جیسے دودھ میں سے مکھی۔ ایوب خان کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ سیاست اور سیاست دانوں کو سرے سے ہی ختم کر کے دم لیں گے۔ دنیا کے پانچویں

بڑے ملک کے خودساختہ صدر کی زبان سے ایسے مضحکہ خیز خیالات کا اظہار ان کی اپنی فراست کا آئینہ دار تھا۔

مارچ 1962 میں آئین کا یہ مسودہ اسی شکل میں نافذ کر دیا گیا۔ظاہر ہے کہ ایسا آئین عوام کو قابل قبول نہ تھا مگر اس کی پروا کسے تھی۔ایوب حکومت نے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس جاری کر کے ذرائع ابلاغ کا گلا گھونٹ دیا۔دفعہ 144 ضابطہ فوجداری صرف ہنگامی حالات میں وقتی طور پر کسی محدود علاقے میں نافذ کی جاتی ہے مگر تمام بڑے شہروں میں طویل عرصے کے لیے یہ دفعہ نافذ کر دی گئی تاکہ عوام جلسے جلوسوں اور تقریروں سے ایسے آئین پر کوئی تبصرہ یا تنقید نہ کر پائیں۔تحریر، اجتماع اور تقریر پر اس طرح پابندی لگ جانے سے عوام دلبرداشتہ ہو گئے لیکن توپ اور تفنگ کے سامنے بے دست و پا ہو کر کچھ نہ کر سکے۔
ایسے میں اپنے گریبان کا پرچم لے کر نکلنے والا حبیب جالب پکار اٹھا:

ایسے دستور کو
صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا
میں نہیں جانتا

قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے ایوب خان نے تنبیہ کی کہ ”اسمبلی کو وجود میں لانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ آئین پر تنقید کرنے لگے یا اس میں ترامیم کا سلسلہ جاری ہو۔اسمبلی کا فرض ہے کہ وہ آئین کو تحفظ دے اور اس کا دفاع کرے“

رفتہ رفتہ لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا یارا ہوا تو جون 1962ء میں نو بنگالی لیڈروں نے آئین کی قطعی آمرانہ حیثیت پر تنقید کی اور یہ اعتراض بھی کیا کہ اسے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ معقول ترامیم کے بغیر یہ آئین نا قابل عمل ہو گا۔

مدبر سیاسی اکابرین نے ایوب خان کو کئی مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کاروبار

سیاست میں سیاست دانوں کی عدم شرکت مہمل اور بے معنی بات ہے۔ آخر کار حکومت کرنا بھی سیاست ہے، انتخابات اور منتخب نمائندوں کا اسمبلیوں میں بیٹھنا اور قانون وضع کرنا بھی سیاست ہے۔ ہر وہ شخص جو منتخب ہوا یا ہارا یا جو انتخابات میں شامل نہ ہوا یا جسے اس عمل میں شمولیت سے باز رکھا گیا، سب سیاست دان ہیں خواہ انہیں کوئی بھی نام دے دیا جائے۔

لیکن ایوب خان اپنی بات پر اڑے رہے۔ دیوانہ ہوشیار باش بکار خویش کے مصداق وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ عوام کے مقبول سیاسی لیڈران کے مدمقابل نہ آسکیں۔ اس لیے اگر سرے سے سیاست ہی کو بدنام کر کے عوام کی سوچ کے دھارے موڑ دیے جائیں تو پھر راج کرے گا خالصہ اور باقی رہے نہ کو۔ مگر ایسا نہ ہوسکا کہ ایوب خان کے خاص حامی ارکان اسمبلی بکھرتے دکھائی دینے لگے۔ ایوب خان نے ان کی ''ہم خیال'' گروہ بندی کی کوشش کی مگر بات نہ بنی اور یہی ارکان سیاسی جماعتیں بحال کرنے کا تقاضا کرنے لگے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ صدارتی نظام میں خود صدر کا اکثریتی پارٹی کا رکن ہونا لازمی ہے وگرنہ اکثریت کے بغیر وہ اپنے عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ سرکاری ملازمین، پرانے سیاست دانوں اور اپنے حامی ارکان اسمبلی سے مفصل بحث و مباحثے کے بعد بالآخر ایوب خان نے دیکھ لیا کہ سیاست کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں سے انحراف ممکن نہیں اور نہ ہی سیاسی پارٹی کے بغیر اس کی حکومت قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی کیونکہ ملک کی آزادی کی ذمہ دار یہی پارٹی تھی اور عوام میں اس کا امیج بھی بلند تھا۔ اس جماعت کی قیادت سے نواب آف کالاباغ کے گہرے اختلافات تھے لہٰذا اس نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ یا تو کوئی اور پارٹی چن لی جائے یا پھر نئے سرے سے اپنی الگ پارٹی بنالی جائے۔ مگر ایوب خان مسلم لیگ کے نام اور شہرت سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے اسی جماعت کو اپنانے پر اصرار کیا جس پر نواب آف کالاباغ نے ''مکمل انتظامات'' کا بیڑا اٹھالیا۔

اس سلسلے میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل کو راولپنڈی بلا کر شاندار مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ نواب کالاباغ کی ہدایت پر وفاقی وزیر شیخ خورشید احمد نے اس سے ملاقات کی اور تین دن تک ایک مخصوص سمجھوتے پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تاہم سیکرٹری مسلم لیگ کسی طور راضی نہ ہوا۔ تیسرے دن جب اس نے مہمان خانے سے رخصت ہونے کی کوشش کی تو گارڈز نے اسے اطلاع دی کہ جب تک اوپر سے حکم نہ ہو اس وقت تک وہ باہر نہیں جا سکتے۔ بیچارے بے بس سیکرٹری نے حکومت کے پیش کردہ اعلامیے پر دستخط کر دیے جس کی رو سے وہ اور اس کے تمام ہم خیال ارکان نے اپنی الگ مسلم لیگ بنالی۔ مسلم لیگ کے اس گروپ نے ایوب خان کو اپنا صدر منتخب کرلیا اور یوں پاکستان کی تاریخ کا پہلا آمر نا صرف سیاست دان بن گیا بلکہ ملک کی سب سے بڑی جماعت کی باگ ڈور بھی سنبھال لی۔ 1959ء میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کیا۔ اس نظام کی بنیاد یہ تھی کہ پاکستان کے عوام سیاسی طور پر جاہل ہیں اور ووٹ کے تقدس کو نہیں پہچانتے۔ لہٰذا ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مقامی طور پر الیکشن میں حصہ لے کر بنیادی جمہوریت کے ارکان کا انتخاب کریں اور یہ منتخب ارکان صدر اور اسمبلی کے انتخاب کے لیے ووٹ ڈالنے کے اہل ہوں۔ جن لوگوں نے ہندو اکثریت اور انگریزی اقتدار کی مسلسل مخالفت کے باوجود ایک نیا اور آزاد ملک بنا ڈالا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انہیں سیاسی شعور نہیں دراصل ایک ایسی الزام تراشی ہے جسے سراسر بدنیتی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

مزید براں عوام کو کوئی حق دینا ترقی کہلاتا ہے۔ جو حق وہ برسوں سے استعمال کرتے چلے آئے ہوں ان سے وہ حق چھین لینا آزادی اور ترقی کی نفی ہے۔ ایوب خان اس سے بخوبی واقف تھا لیکن اس نے ملک میں مارشل لاء اس لیے نہیں لگایا تھا کہ سیاسی عمل اور سیاسی اداروں کو فروغ ملے۔ اس کا واضح مقصد یہی تھا کہ فوج کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا جائے اور پھر تاحیات حکمرانی کے مزے لوٹے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بنیادی

جمہوریت کا ڈھونگ رچایا تا کہ مارشل لاء اٹھا لینے کے بعد وہ خود بار بار منتخب ہو کر صدر کے عہدے پر متمکن رہے۔ براہ راست ووٹ کے ذریعے عام انتخابات میں کوئی امیدوار سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کامیاب ہوگا۔ ہر امیدوار اپنے ماضی کے کردار اور سیاسی یا سماجی کارکردگی پر انحصار کرتے ہوئے عوام کے پاس جاتا اور ان کے ووٹ کا طلب گار ہوتا ہے۔ مارشل لاء لگانے والا جرنیل جس نے ایک قانونی حکومت کو بندوق کی نوک پر معزول کر دیا ہو، سیاسی عمل موقوف اور حقوق سلب کر لیے ہوں، جس نے چھوٹے چھوٹے جرائم یا ادنیٰ سی مخالفت پر لوگوں کو کڑی سزائیں دی ہوں اور جس نے ملک و قوم کا گلا دبوچ رکھا ہو ایسے جرنیل کا عام انتخابات میں عام امیدوار کی حیثیت سے کامیابی کی امید رکھنا عبث ہے۔ تاہم اگر انتخابات بالواسطہ ہوں اور ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد مختصر سی ہو، جن پر اثر انداز ہونا اور جنہیں خرید لینا آسان ہو تو پھر کامیابی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بنیادی جمہوری اسی کرشمے کا نام تھا۔ بنیادی جمہوریت کے ارکان (بی ڈی ممبرز) کو نام نہاد مقامی ترقی و تعمیر کے لیے بے تحاشہ رقم دی گئی۔ اس رقم کا بیشتر حصہ یہ ارکان خورد برد کر لیتے تھے۔ صدارتی الیکشن کے بعد مزید رقوم کا لالچ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی رکن مخالفت کی جرات کرتا تو اس کو محاسبے کی دھمکی دی جاتی تھی تا آنکہ وہ سیدھی راہ پر آ جائے۔ لہٰذا یہ نظام صریحاً دھوکا تھا جس کا مقصد اقتدار کے بھوکے آمر کے لیے تاعمر صدارتی کرسی کی ہوس پوری کرنا تھا۔

پھول بمقابلہ لالٹین

جون 1962ء میں مارشل لاء اٹھا لیا گیا۔ لیکن اس اقدام سے پہلے ایوب خان نے ایک برائے نام ریفرنڈم کے ذریعے خود کو ملک کا صدر بنوا لیا تھا۔ نئے آئین کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی تشکیل ہوئی۔ 1965ء مین ایوب خان کی صدارت کی مدت ختم ہونا تھی لہٰذا صدارتی اور پارلیمانی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ حزب مخالف کو نظر آ رہا تھا کہ

الیکشن ڈھونگ ہوگا لہٰذا مطالبہ کیا گیا کہ کم از کم صدارتی انتخاب براہ راست ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ ایوب خان کو کسی صورت منظور نہیں تھا کیونکہ آئین سازی اور بنیادی جمہوریت کا سارا تماشا ہی ایوب خان کو صدر بنوانے اور برقرار رکھنے کے لیے رچایا گیا تھا۔ لہٰذا ایوب خان نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

حزب اختلاف مشکل میں تھی کہ ایسے حالات میں ایوب خان کے خلاف موثر امیدوار کون ہوسکتا ہے، خصوصاً جب تمام انتظامیہ ایوب خان کے حق میں خون پسینہ ایک کر رہی تھی کہ تو کوئی صدارتی الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے میں حزب مخالف نے قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح سے درخواست کی کہ وہ ایوب خان کے خلاف صدارتی امیدوار بنیں۔ پہلے تو ایوب خان نے اس مقابلے کا مذاق اڑایا اور یہی سمجھا کہ فاطمہ جناح کے خلاف اس کی کامیابی یقینی ہے۔ چند ملاؤں سے یہ فتویٰ لیا گیا کہ عورت سربراہ مملکت نہیں ہوسکتی۔ اسلام کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی یہ مثال اس شخص نے قائم کی تھی جو مذہب اور ریاست کے کاروبار کو دو الگ شعبے گردانتا تھا۔ یہ فاطمہ جناح ہی تھیں جنھوں نے سب سے پہلے آمرانہ اور غاصبانہ طریقہء حکومت کی مخالفت کی اور ایوب خان کو عوامی جلسوں میں برملا ڈکیٹیٹر کا نام دیا۔ انہوں نے عوام کو بتایا کہ ایوب خان نے بھارت کو سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کی چھوٹ دی اور دریاؤں کی تقسیم بھارت کے حوالے کر دی ہے۔

فاطمہ جناح نے کراچی سے لے کر مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ تک اپنے سیاسی دوروں کا آغاز کیا۔ ان کی ٹرین کو ''فریڈم سپیشل'' کا نام دیا گیا تھا۔ فاطمہ جناح کے اولین جلسوں میں ڈھائی لاکھ کے قریب شرکاء موجود ہوتے تھے اور ان کی انتخابی مہم میں روز بروز تیزی آتی چلی گئی۔ فاطمہ جناح نے قصبے قصبے، گلی گلی اور شہر شہر دورے کیے۔ مشرقی پاکستان کے دورے میں ان کی ٹرین 22 گھنٹے میں ڈھاکا سے چٹاگانگ پہنچی۔ ہزاروں

لوگ مادرملت کی ٹرین کی راہ دیکھنے کھڑے ہوتے۔ٹرین جس شہر یا قصبے میں پہنچتی وہاں کے لوگ زنجیر کھینچ کر ٹرین روک دیتے۔محترمہ فاطمہ جناح سے درخواست کی جاتی کہ وہ تقریر کریں اور لوگوں سے ملاقات کریں۔ایوب خان یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا چکا تھا۔ چنانچہ اس نے فاطمہ جناح کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے فوج سمیت تمام سیکیورٹی ایجنسیوں اور اہم اداروں کو استعمال کرنا شروع کردیا۔پاکستان کی تاریخ میں شاید اب تک ایسا نہیں ہوا کہ ملک کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی جماعتیں ایک ہی صدارتی امیدوار کے نام پر متفق ہوگئی ہوں۔اس وقت محترمہ فاطمہ جناح ملک کے دونوں حصوں میں یکساں مشہور تھیں۔وہ ملک کے ہر بچے، جوان، بوڑھے مردوزن کے دلوں کی دھڑکن تھیں۔دنیا کے تمام بڑے اخبارات، تجزیہ نگار، سیاسی مندوبین اور اور عوامی جوش وخروش ان کی جیت یقینی قرار دے چکا تھا۔ 71 سالہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی کی یاد تازہ کردی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے مسلم لیگ کا پرانا دور واپس آگیا ہو۔دوسری جانب ایوب خان نے اپنی انتخابی مہم میں روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ دیا جو بعد میں ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی کا منشور بنالیا۔ انتخابی مہم کے دوران ایوب خان نے ایوان صدر کراچی میں بنیادی جمہوریتوں کے نومنتخب ارکان سے خطاب کرتے ہوئے ''مہاجرین'' کو بطور خاص مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر مس جناح انتخابات جیت گئیں اور ملک کمزور ہوگیا تو آپ کہاں جائیں گے؟ آپ پہلے ہی ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں اور اس سے آگے تو سمندر ہے۔۔۔''

ایوب خان نے ملک کے تعلیمی اداروں کو تعلیمی قانون کی تبدیلی کا جھانسہ دیا۔ میڈیا کے بعض طبقات کو ذاتی نوعیت کے فائدوں کا لالچ دیا گیا،اسی طرح کاروباری افراد کو بھی متعدد اقسام کے لالچ دیے گئے۔ایوب خان کی آمد پاکستانی سیاست میں مالی بدعنوانی کی ابتدا تھی اور اس الیکشن میں ایوب خان کی طرف سے بدعنوانی کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔یہی نہیں بلکہ محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف اخلاق سے گرے ہوئے الزامات عائد کیے

گئے اور اس سلسلے میں سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اخبارات کا سہارا لیا گیا۔ رہی سہی کسر درباری علمائے سو نے پوری کر دی۔ ان علماء نے اپنی مسند فتویٰ نویسی کو اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ جنرل ایوب خان کی خوشی کے لیے استعمال کیا اور اس وقت کے بدترین علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ کوئی عورت کسی اسلامی ملک کی حکمران نہیں بن سکتی۔ ملک میں نافذ العمل فوجی قانون اور اس کے زیر اثر تمام ہتھکنڈے فاطمہ جناح کے خلاف استعمال کیے گئے۔ انتخابات کے دوران بعض مقامات پر فاطمہ جناح کو نامزد کرنے والے کل جماعتی اتحاد کے سیکڑوں کارکنوں کو عین الیکشن کے دن گرفتار کر لیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں فاطمہ جناح کے حق میں ہونے والے مارچ اور جلسوں میں ایوب خان کے حکم پر طلبہ کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ الیکشن سے ایک ہفتہ قبل ملک کے دونوں حصوں میں ہفتہ مادرِ ملت منایا گیا تھا۔ ٹائم میگزین کے مطابق جب جنرل ایوب خان نے کہا کہ میں ملک میں جمہوریت نافذ کروں گا تو اس وقت فاطمہ جناح نے اسے للکار کر کہا کہ کونسی جمہوریت؟ ایک شخص کی جمہوریت یا پچاس افراد کی جمہوریت؟

الیکشن میں صدر ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کے ارکان پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا۔ اس مقصد کے لیے لالچ، دھونس اور دھاندلی سمیت ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ بہت سے مقامات پر بنیادی جمہوریت کے ارکان کو قید کر لیا گیا اور ان پر ایوب خان کو ووٹ دینے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ تمام تر ریاستی دباؤ کے باوجود محترمہ فاطمہ جناح پر عوام نے بے پایاں اعتماد کا اظہار کیا۔ انتخابات کے ابتدائی نتائج کے مطابق مشرقی پاکستان میں ایوب خان کو شکست فاش ہوئی۔ مغربی پاکستان میں کراچی، اندرون سندھ، بالائی پنجاب اور صوبہ سرحد کے نصف سے زیادہ حصے میں محترمہ فاطمہ جناح مکمل طور پر جیت چکی تھیں۔ مگر دوپہر اور شام کے نتائج میں فوج اور ایجنسیوں کی طرف سے کی جانے والی دھاندلی، غلط نتائج کے اندراج اور انتخابی دفاتر پر قبضے کر کے نتائج تبدیل کر دیے گئے۔ اخبارات، جرائد، میڈیا،

صحافی برادری اور ابلاغ کے دیگر ذرائع پر دباؤ ڈال کر فاطمہ جناح کے حق میں آنے والی اطلاعات سنسر کر دی گئیں۔ سرکاری سطح پر جاری ہونے والے نتائج کے مطابق ایوب خان کو 64 فیصد اور فاطمہ جناح کو 36 فیصد ووٹ ملے۔ کراچی میں ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کو کامیابی ملی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے مولانا بھاشانی نے ایوب خان کو الیکشن میں کامیاب کرانے کے لیے دو کروڑ روپے وصول کیے تھے مگر وہ بھی ایوب کو شکست سے نہ بچا سکے۔ بی ڈی ممبرز پر دباؤ کے باوجود کراچی سمیت ملک کے بیشتر شہری علاقوں میں ایوب خان کے پھول پر محترمہ فاطمہ جناح کی لالٹین کو برتری حاصل رہی تاہم آخری وقت میں نتائج تبدیل کر دیے گئے۔

صدارتی انتخابات سے تین دن بعد کراچی میں ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب خان کی قیادت میں فتح کا جلوس نکالا گیا۔ گوہر ایوب صوبہ سرحد سے پٹھانوں سے بھری بسیں لے کر کراچی آیا جہاں لالوکھیت (موجودہ لیاری) میں اس جلوس کی محترمہ فاطمہ جناح کے حامیوں سے مڈھ بھیڑ ہوگئی جس کے بعد کراچی میں پٹھان مہاجر فسادات نے ہندو مسلم فسادات کی یاد تازہ کر دی۔ اس موقع پر محترمہ فاطمہ جناح بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ جب پولیس نے لوگوں پر گولی چلائی تو ان کا کہنا تھا'' آئی جی کو روکو، میرے بچوں کو مت مارو'' ان فسادات کے سیاسی اثرات آج 50 برس بعد بھی کراچی کی سیاست میں نمایاں ہیں۔ 1965ء میں ایوب خان کے خلاف شروع کی گئی سیاسی جنگ سیاست کے ایوانوں اور کراچی کے گلی کوچوں میں آج بھی جاری ہے۔

1962ء میں امریکا کی جانب سے پاکستان کی فوجی امداد میں بہت سی کمی کر دی گئی اور 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد یہ امداد مکمل طور پر ختم ہوگئی۔ اس وقت تک پاکستان امریکا سے ایک ارب 20 کروڑ ڈالر کی فوجی اور دو ارب ڈالر کی اقتصادی امداد لے چکا تھا۔ پاک بھارت جنگ کے بعد جب سرکاری طور پر امریکی اسلحہ کی خریداری پاکستان

کے لیے ممنوع قرار دے دی گئی تو امریکا کو یہ خطرہ بھی لاحق ہوا کہ کہیں پاکستان اس کے چنگل سے نکل کر اشتراکی کیمپ میں نہ چلا جائے، چنانچہ احتیاطاً یہ انتظام کیا گیا کہ پاکستان کچھ اسلحہ امریکا سے لینے کے بجائے پڑوسی ممالک کی وساطت سے حاصل کرے۔

ان حقائق کے بیان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایوب خان نے برسر اقتدار آتے ہی پاکستان کو امریکی جھولی میں ڈال دیا۔ انہوں نے بظاہر یہ تاثر دیا کہ امریکی امداد کے بغیر پاکستان فوجی اور اقتصادی اعتبار سے قائم نہیں رہ پائے گا۔ تاہم یہ بات سراسر لغو ہے اور ایوب خان کے ان اقدامات کا مقصد امریکی مفادات کا تحفظ کر کے اس کی آشیرباد کا حصول اور اپنے اقتدار کو طوالت دینا تھا۔

آپریشن جبرالٹر اور دوسری جنگ

پاکستان اور بھارت میں کشیدہ تعلقات کی ابتدا بھی ایوب خان کے دور میں ہوئی۔ 1965ء میں کشمیر کی آزادی کے لیے ہونے والا آپریشن جبرالٹر اور بعد ازاں کھلی جنگ نے دونوں اطراف دشمنی اور نفرت کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے 1962ء میں جب چین اور بھارت کے مابین سرحدی کشیدگی اور جنگ کا آغاز ہوا تو چین نے پاکستان کو پیشکش کی کہ بھارت کی کمزور پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر کشمیر پر قبضہ کر لیا جائے۔ چین کا کہنا تھا کہ وہ بھارت کو جوابی کارروائی کا موقع ہی نہیں دے گا، مگر ایوب خان نے امریکی دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اس اقدام کی ہمت نہ کی۔

اسی برس رن کچھ میں پاک بھارت جھڑپوں کے فوری بعد اپریل/ مئی میں پاک فوج نے مقبوضہ وادی کشمیر اور سری نگر پر قبضہ کرنے کے لیے گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا۔ اس حوالے سے فیصلہ کن اجلاس بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کی صدارت میں ہوا جس میں بری فوج کے تمام اہم افسر اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو بھی

موجود تھے۔ اس سے قبل صدر ایوب خان کو بھی اس منصوبے کے بارے میں اعتماد میں لیا گیا تھا۔ کشمیر کمیٹی نے عزیز احمد کی صدارت میں آپریشن جبرالٹر کی منظوری کا اشارہ دے دیا۔ سرکاری سطح پر بین الاقوامی سرحدوں کے احترام اور عدم مداخلت کا موقف جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور وزارت خارجہ کی ہدایت پر ''آہستہ چلو اور دشمن کو مشتعل نہ کرو'' کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ یہ ایک متضاد، ناقص اور احمقانہ پالیسی تھی کیونکہ مقبوضہ وادی میں آٹھ ہزار مجاہدین داخل ہونے کے بعد گوریلا کارروائیوں کے نتیجے میں دشمن بھلا کیسے مشتعل نہ ہوتا۔ جنرل موسیٰ خان نے اپنی کتاب ''میرا موقف'' میں اصرار کیا ہے کہ انہوں نے صدر ایوب خان کو خبردار کر دیا تھا کہ یہ خفیہ کارروائیاں بھارت کے ساتھ جنگ میں تبدیل ہو جائیں گی لیکن عملی طور پر فوجی قیادت ضرورت سے زیادہ پراعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور یقین رکھتی تھی کہ بھارت کی فوج میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ پاکستان کا مقابلہ کر سکے۔ آپریشن جبرالٹر دراصل وزارت خارجہ کا ''برین چائلڈ'' تھا جس کو صدر ایوب نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے قبول کر لیا۔ مسئلہ کشمیر کو زندہ کرنے اور بھارت کو مذاکرات پر مجبور کرنے کے لیے گوریلا جنگ کا تصور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور کشمیر کمیٹی کے سربراہ اور نہایت ہوشیار بیوروکریٹ سیکرٹری خارجہ عزیز احمد کے ذہن کی پیداوار تھا۔ ان دونوں کا کشمیر کی صورت حال کا تجزیہ اس حقیقت پر مبنی تھا کہ 1962ء میں چین کے ہاتھوں بھارت کی ذلت آمیز شکست کے بعد بھارت اپنی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ امریکا نے بھی پاکستان کو نظر انداز کر کے بھارت کے ساتھ اقتصادی اور فوجی تعلقات بڑھا لیے تھے۔ بھٹو کا خیال تھا کہ 1966ء تک طاقت کا توازن بھارت کے حق میں ہو جائے گا اور امریکا کی فوجی امداد کے بغیر پاکستان اس قدر پیچھے رہ جائے گا کہ کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال بھی مفید نہیں رہے گا۔ چونکہ اقوام متحدہ نے کشمیر پر بھارتی موقف کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اسے بھارت کا حصہ تسلیم کیا تھا اس لیے مذاکرات کا راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ پاکستانی

قیادت یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ مقبوضہ وادی میں پاکستانی فوجیوں اور مجاہدین کی طویل گوریلا جنگ کے ذریعے بھارت کو مذاکرات کی میز پر لایا جا سکتا ہے اور اسے مسئلہ کشمیر کے حل پر مجبور کرنا ممکن ہے۔

اس منصوبے کو آپریشن جبرالٹر کا نام دیا گیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مکمل تیاری کے بغیر آپریشن شروع کر دیا جائے۔ اگر گوریلا جنگ کی کارروائیاں شروع کرنے سے پہلے کشمیر کے اندر حریت پسندوں کا نیٹ ورک قائم کیا جاتا اور بھارت کے آمرانہ قبضے کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والے سربکف مجاہدین کو گوریلا جنگ کی مکمل تربیت دی جاتی تو شاید تاریخ مختلف طریقے سے لکھی جاتی۔ صدر ایوب خان کو یقین تھا کہ کشمیر میں مجوزہ کارروائیوں کی وجہ سے بھارت بین الاقوامی سرحد کے پار پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ کم از کم وزیر خارجہ بھٹو نے انہیں یہی یقین دہانی کروا رکھی تھی۔ جنرل موسیٰ نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ صدر ایوب خان کو اس آپریشن کے نتائج کے بارے میں سب کچھ بتا دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس منصوبے کی منظوری دی تھی جو یقیناً جی ایچ کیو کے پرانے ریکارڈ میں موجود ہو گی۔ ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب لکھتے ہیں کہ ان کے والد کو کبھی یہ نہیں بتایا گیا کہ کشمیر آپریشن نا قابل عمل اور قابل حصول نہیں ورنہ وہ اس پر عملدرآمد کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان کو اپنے کمانڈر انچیف اور جی ایچ کیو پر اس قدر اعتماد نہیں تھا جتنا انہیں وزارت خارجہ کی سفارشات پر اعتماد تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان آپریشن جبرالٹر کو ایک ناقص اور نا قابل عمل منصوبہ قرار دیتے ہیں مگر ایوب خان نے اپنے جرنیلوں کی رائے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس آپریشن کے دوران جنرل ایوب خان نے ایک مرتبہ جنرل موسیٰ خان کو بھی مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ انہیں اپنے کمانڈر انچیف کی فوجی قابلیت سے زیادہ اس کی وفاداری اور اطاعت کا یقین تھا۔ موسیٰ خان نے رن کچھ اور چین بھارت جنگ کو اپنے حق میں استعمال کرتے

ہوئے صدر کے فیصلے کی تائید کی۔ مگر یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات تھی کیونکہ جنرل موسیٰ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس باغیانہ کارروائی میں کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے نہ تو ان کے پاس مضبوط یقین تھا اور نہ ہی ان کے پاس اتنی بڑی تربیت یافتہ فوج تھی۔

جہاں تک صدر ایوب کا تعلق ہے تو انہوں نے سوچے سمجھے بغیر اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔ انہیں امید تھی کہ کشمیر میں مطلوبہ کامیابی حاصل ہونے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور وہ اسے ایک عظیم جنگی کامیابی کے طور پر پیش کر سکیں گے۔

مقبوضہ وادی میں آپریشن گرینڈ سلام پر عمل بھی جاری تھا جس کا مقصد اکھنور پر قبضہ کر کے وادی کشمیر کا بھارت سے زمینی رابطہ منقطع کرنا تھا۔ اس صورت میں بھارت زبردست دباؤ میں آ جاتا اور وہ پاکستان پر حملے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے لیے کشمیر کو بچانا ہی اصل ہدف ہوتا۔ اس آپریشن کے کمانڈر میجر جنرل اختر حسین ملک میدان جنگ میں کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ 31 اگست 1965ء کو وہ اکھنور پر قبضہ کرنے والے تھے کہ متزلزل اور بزدل ایوب خان نے کوئی وجہ بتائے بغیر کمان جنرل اختر کے ہاتھ سے لے کر یحییٰ خان کو دے دی جس نے اپنے دستوں کو اکھنور پر قبضے سے روک دیا۔ اسی دن پاکستان کشمیر کی جنگ ہار گیا تھا۔ ایوب خان نے مقبوضہ وادی میں پھنسے ہزاروں فوجیوں اور مجاہدین کو کسی احساس ندامت کے بغیر بھلا دیا اور انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ان بہادر جانبازوں نے بھارتی فوجی ہیڈ کوارٹر، اسلحہ ڈپوؤں اور دیگر تنصیبات کے علاوہ قابض بھارتی فوجیوں کو بموں سے اڑایا اور دشمن کو بھاری جانی نقصان پہنچایا مگر انجام کیا ہوا؟ جی ایچ کیو نے انہیں سامان اور خوراک کی سپلائی جاری رکھنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہ کی اور انہیں شدید نامساعد حالات میں اپنی مدد آپ کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ البتہ پاکستان ایئر فورس کے باہمت ہوابازوں نے اپنے کمانڈر اصغر خان کی قیادت میں ان فوجیوں کا بھرپور ساتھ دیا اور کئی ناممکن کارنامے انجام دیے۔

آپریشن جبرالٹر فوجی اور سول قیادت کی ناپختہ اور ناقص منصوبہ بندی کا نمونہ تھا جسے پاکستانی قوم کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔اس منصوبے کی ناکامی یقینی تھی کیونکہ یہ ایک کم تر پیشہ وارانہ تجربے کے حامل صدر اور اس کے اطاعت گزار کمانڈر انچیف کی کمزور قائدانہ صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ان دونوں کا فوجی آپریشن کا تصور گہری حکمت عملی سے خالی تھا۔ جنرل ایوب کے بارے میں گلبرٹ لیتھ ویٹ لکھتے ہیں کہ"میں اسے کسی بھی اعتبار سے اعلیٰ دانشور طبقے میں شمار نہیں کرتا۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق وہ لیفٹیننٹ کرنل کے طور پر ایک ناکام کمانڈنگ افسر تھا۔اس کا فوجی علم محدود ہے۔اس نے پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بننے کے بعد اپنی ناتجربہ کاری کو چھپانے کے لیے لیفٹیننٹ جنرل سر راس میکے کو اپنا ذاتی مشیر بنایا۔وہ اس پر بہت زیادہ انحصار کرتا تھا"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نااہلی کے باوجود ایوب خان کو ایک انتہائی پیشہ ور فوج کا کمانڈر کیوں بنایا گیا؟

صدر ایوب اور جنرل موسیٰ نے دانستہ طور پر پاکستان ایئر فورس کے کمانڈر انچیف ایئر مارشل اصغر خان کو آپریشن جبرالٹر سے بے خبر رکھا کیونکہ وہ اصغر خان کے بلند اخلاقی معیار اور جرات مندانہ اظہار خیال سے خائف تھے۔اصغر خان نے پی اے ایف کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی تھی اور اسے ایک انتہائی منظم، مربوط، تربیت یافتہ اور پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی حامل تیز رفتار ایئر فورس میں تبدیل کر دیا تھا۔انہوں نے اپنی بصیرت افروز نظروں سے رن کچھ کی جھڑپوں کے بعد پیدا ہونے والے طوفان کا اندازہ کر لیا تھا اور ایئر فورس کو انتہائی تیاری کی حالت میں رکھا ہوا تھا۔ جولائی 1965ء میں پی اے ایف کی قیادت ایئر مارشل نور خان نے سنبھالی اور اصغر خان کو پی آئی اے کا چیئر مین بنا دیا گیا۔کمان کی اس تبدیلی کے موقع پر ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز گل حسن نے انہیں بتایا کہ فوج مقبوضہ وادی کشمیر میں ایک بڑے آپریشن کی تیاریاں کر رہی ہے۔اصغر خان اس کے بارے میں بالکل

بے خبر تھے۔ جب ایئر مارشل نور خان نے اس سلسلے میں جنرل موسیٰ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک چھوٹا سا مقامی معاملہ ہے جسے میجر جنرل اختر ملک خود ہی سنبھال لے گا اور اس میں پی اے ایف کی شرکت ضروری نہیں ہے۔

نور خان نے اختر ملک سے بھی ملاقات کی اور پوچھا کہ وہ ایئر فورس کی مدد کے بغیر یہ آپریشن کیسے انجام دیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ رسد کی سپلائی کے لیے آرمی کے ہیلی کاپٹر اور خچر استعمال کریں گے۔ نور خان کے مطابق انہیں فوجی افسروں کی محدود اور غیر پیشہ وارانہ سوچ پر شدید مایوسی ہوئی۔

یہ انتہائی بدقسمتی تھی کہ ایک تربیت یافتہ فوج کی سربراہی فوجی حکمت عملی سے عاری جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایوب خان نے اپنی یادداشتوں میں موسیٰ خان کو نااہل اور غیر موثر کمانڈر قرار دیا ہے۔ پی اے ایف کے دونوں سربراہان کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا گیا کہ گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی مئی 1965ء میں ہی کر لی گئی تھی۔ جنرل موسیٰ نے اپنی کتاب میں نور خان کو بے جا تنقید کا نشانہ بنایا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جنرل موسیٰ فوج کے دستوں کو جنگ کے محاذوں پر متعین کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ یہی نہیں بلکہ مشرقی سرحد پر تمام بارودی سرنگوں اور دوسری دفاعی تنصیبات کو بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ اسی طرح سیالکوٹ، لاہور اور قصور کے محاذوں پر بکھرے فوجی دستوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے پی اے ایف کو اپنی زیادہ توجہ اس طرف مرکوز کرنا پڑی ورنہ وہ اپنے پہلے حملے میں ہی دشمن کی ایئر فورس کو زمین پر ہی تباہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

فوجی قیادت کو آپریشن جبرالٹر سے مکمل طور پر بے خبر رکھا گیا تھا۔ درحقیقت جنرل موسیٰ بھارتی فوج کے ممکنہ ردعمل سے خوفزدہ تھے اسی لیے انہوں نے فوجی یونٹوں کو مشرقی سرحد سے دور رکھا اور انہی صرف اسی وقت محاذوں پر جانے کا حکم ملا جب بھارتی فوج تین اطراف سے پاکستان پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ اس معاملے میں فوجی اور سیاسی قائدین اپنی کوتاہ

نظری اور غفلت کے الزام سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اپنے منصوبے کے ممکنہ نتائج کی پیش بینی میں ناکام رہے اور اسی وجہ سے انہوں نے جنگ کی تیاری پر کوئی توجہ نہ دی۔

کشمیر آپریشن میں ایئر فورس کو شریک نہ کرنے کے بارے میں ان کا تصور قابل افسوس حد تک غلط مفروضوں اور جنگی حرکیات سے لاعلمی پر مبنی تھا۔ وہ ابھی تک جنگ کے منڈلاتے خطرات سے لاتعلق اور تیاری کے بغیر محض خوش اعتمادی کے نشے میں مدہوش تھے کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں پاکستانی فوج کو جسٹر، برکی، واہگہ، اٹاری، چونڈہ اور کھیم کرن کے محاذوں پر جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ آرمی قیادت کا اپنے آپریشن کو ایئر فورس سے خفیہ رکھنے کا فیصلہ ناقابل معافی اور قابل مذمت جرم تھا۔ تاہم ایئر مارشل نور خان نے اپنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اور خطرے کی بو سونگھتے ہوئے پی اے ایف کو جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایئر فورس کے جہاز کشمیر کے محاذ پر برابر رسد اور کمک پہنچانے میں مصروف تھے۔ آپریشن گرینڈ سلام اور آپریشن جبرالٹر کی ناکامی اس لیے بھی زیادہ المناک ہو جاتی ہے کیونکہ بھارتی جرنیلوں کی غفلت اور غیر پیشہ وارانہ انداز پاک فوج کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں تھا۔ بھارتی جنرل جوگندر سنگھ اپنی کتاب ''پس پردہ'' میں لکھتے ہیں کہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل چودھری کی ہدایات پر کہیں بھی عمل نہ کیا گیا۔ نہ دراندازی کے راستے بند کیے گئے اور نہ ہی درجہ حاجی پیر پر جارحانہ حملہ ہو سکا۔ چھمب جوڑیاں کی طرف فوجی دستے بھی روانہ نہیں کیے گئے۔ اسی طرح لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں پر جارحانہ پیش قدمی کے لیے آپریشن ''ایبلیز'' کی منصوبہ بندی کی گئی''

بھارتی فوج شاید پاکستانی فوج سے زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھی مگر اسے جنرل چودھری کی صورت میں ایک قابل اور پیشہ ور چیف آف سٹاف میسر تھا۔ اگست کے اواخر میں بھارتی فوج نے پاک فوج کے ساتھ دست بدست لڑائی کے بعد درہ حاجی پیر پر قبضہ کر

لیا۔اس کے بعد انہوں نے آپریشن فولاد کا آغاز کیا اور کارگل اور کشن گنگا کے ساتھ ساتھ کئی اہم مقامات قبضے میں لے لیے۔ ان کارروائیوں سے آپریشن جبرالٹر پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔کشمیر کے اندر آمد ورفت کے تمام راستے بند ہوگئے اور مجاہد فورس کے بچ نکلنے کا امکان ختم ہوگیا۔ان ہزاروں مجاہدین کو بھارتی فوجیوں نے گرفتار کرلیا یا ہلاک کردیا۔اسی طرح آپریشن گرینڈ سلام کا واحد مقصد اکھنور پر قبضہ کرنا تھا۔اکھنور کشمیر کی گردن اور سب سے اہم ہدف سمجھا جاتا تھا۔اگر یہ پاکستان کے قبضے میں آجاتا تو بھارت کو کشمیر سے ملانے والے تمام راستے بند ہوجاتے اور پوری وادی محصور ہوکر رہ جاتی۔مگر جس وقت اکھنور پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں گرنے والا تھا اسی وقت ایوب خان نے جنرل ملک کو جنرل یحییٰ سے تبدیل کر کے یہ سنہری موقع گنوادیا۔آپریشن جبرالٹر دراصل فوجی اور اس کے ماتحت افسر شاہی کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ناکام ہوا۔آپریشن جبرالٹر اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والی پاک بھارت جنگ کی تاریخ پاک فوج اور ریاستی قیادت کی نااہلیوں، فاش غلطیوں، مبہم منصوبہ بندی اور غلط فیصلوں سے بھری ہوئی ہے۔تاریخی حوالے سے ثابت ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس نے 30 اگست کو دو صفحات پر مشتمل خفیہ اطلاع جی ایچ کیو اور دوسرے متعلقہ اداروں کو بھیجی جس میں بھارتی فوج کی نقل وحرکت کی واضح تفصیلات فراہم کی گئی تھیں۔اس میں بتایا گیا کہ بھارت کا بکتر بند ڈویژن پٹھان کوٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔انٹیلی جنس کے سربراہ نے اس فوری خطرے کے بارے میں صدر، مسلح افواج کے سربراہوں اور وزیر خارجہ کو مطلع کیا مگر پاکستان کی سلامتی کو درپیش اس خطرے کی پیش بندی کے لیے کسی نے بھی کوئی اقدام نہیں کیا۔ جنرل موسیٰ نے اپنے دستوں کو جنگی مقامات پر تعینات ہی نہ کیا، اسی طرح صدر نے فوج کو ریڈ الرٹ کا حکم بھی نہ دیا۔ یہ ایک مجرمانہ غفلت تھی جس کی وجہ سے پاکستان آرمی کے جوانوں کو آنے والے دنوں میں پرآشوب حالات سے گزرنا پڑا۔خفیہ ایجنسیوں کی بروقت وارننگ کے باوجود آرمی کی عدم

تیاری اور ایئر فورس کو مکمل طور پر اندھیرے میں رکھنے کی وجہ سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ بھارت میں پاکستان کے سفیر ارشد حسین نے نئی دہلی میں متعین ترک سفیر کے توسط سے پاکستان پر بھارت کے ناگزیر حملے کی اطلاع حکومت کو بھیجی۔ اس کے برعکس فوج کے سربراہ نے رن کچھ واقعے کے بعد ایک چوتھائی فوج کو رخصت پر بھیج دیا جبکہ آپریشن جبرالٹر کی تیاریاں جاری تھیں۔ یہ ایک غیر معقول اور عجیب وغریب فیصلہ تھا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں دفاعی مورخین کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایک اہم بکتر بند ڈویژن کو بھارتی حملے سے 24 گھنٹے بعد سیالکوٹ پہنچنے کے احکامات دیے گئے اور جب وہ اپنی منزل کے قریب پہنچا تو کوئی وجہ بتائے بغیر ڈویژنل کمانڈر کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ گوہر ایوب کی کتاب ''اقتدار کے ایوانوں کی جھلکیاں'' میں کیے گئے اس دعوے کی متعدد شواہد سے تردید ہو جاتی ہے کہ بھارتی حملے کے بارے میں صدر ایوب کو پیشگی بریفنگ نہیں دی گئی تھی اور بکتر بند ڈویژن سات کے بجائے چھ ستمبر کو محاذ پر پہنچا۔ اس مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جرنیلوں نے جنگ کے لیے کوئی پیشگی تیاری نہیں کر رکھی تھی۔

جہاں تک پاک فوج کے جوانوں کا تعلق ہے تو انہوں نے رن کچھ، چھمب جوڑیاں، اٹاری، برکی، چونڈہ، کھیم کرن اور چھور کی لڑائیوں میں ہمت اور بہادری کے شاندار مظاہرے کیے۔ اگر عسکری قیادت سے فاش غلطیاں سرزد نہ ہوتیں تو بہت سے نقصانات سے بچا جا سکتا تھا۔ جنگ میں جانی نقصان ناگزیر ہوتا ہے لیکن کمانڈروں کی ناقص منصوبہ بندی یا بزدلی سے ہونے والے جانی نقصان کی ذمہ داری صرف قیادت پر عائد ہوتی ہے۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ شہدا کے بچوں، بیواؤں اور والدین کے سامنے اپنی نااہلی اور غفلت کا اعتراف کریں کہ جلد یا بدیر خدا کی عدالت میں ان کا انصاف ضرور ہوتا ہے۔ بری فوج کی قیادت کے برعکس ایئر مارشل نور خان نے جنرل موسیٰ پر بھروسہ کرنے

کے بجائے کشمیر کے افق پر ابھرتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر ایئرفورس کو ہائی الرٹ کر رکھا تھا۔ حالات کے پیش نظر نور خان نے پہلی کور کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کیا اور کمانڈر جنرل بختیار رانا سے استفسار کیا کہ آیا ان کے دستوں کو ایئرفورس کے تحفظ کی ضرورت ہے کیونکہ وہ دریائے توی کے کنارے کھلے آسمان تلے موجود تھے۔ جنرل رانا نے جواب دیا کہ جنگ میں تیزی سے بچنے کے لیے بھارت اپنی ایئرفورس استعمال نہیں کرے گا۔ نور خان جونہی وہاں سے روانہ ہوئے، بھارتی ایئرفورس نے جنرل رانا کے دستوں پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جرنیلوں کی یادداشتوں کے مطابق ان کے جہازوں نے غلطی سے اپنی ہی فوج پر بمباری کر دی۔ اسی دوران پاک فضائیہ کے طیارے بھی فضا میں پہنچ گئے اور دشمن کو مار بھگایا۔ اس مثال کے بیان کا مقصد بھی پاک فوج کی قیادت کے حالات پر روشنی ڈالنا ہے۔

بدقسمتی سے آپریشن جبرالٹر مکمل طور پر ناکام ہو گیا اور آپریشن گرینڈ سلام کو بریک لگا دی گئی۔ میجر جنرل یحییٰ خان نے اکھنور پر قبضے کی کوئی کوشش نہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ فوجی اور سیاسی قیادت کی سطح پر سازش کی گئی اور میجر جنرل اختر حسین ملک کو اکھنور پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے کمان تبدیل کر دی گئی اور یوں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کا ایک نادر موقع دانستہ طور پر ضائع کر دیا گیا۔ میجر جنرل اختر ملک اور بریگیڈیئر امجد چودھری کے بیانات اس سازش کی کڑیاں آپس میں ملاتے ہیں۔

ایوب خان کا کردار اس کے ناقابل رشک فوجی ریکارڈ سے مطابقت رکھتا تھا۔ بطور کمانڈر اس میں عزم و ہمت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، وہ کمزور قوت فیصلہ کا مالک اور میدان جنگ سے خوفزدہ تھا۔ اسی لیے آپریشن جبرالٹر اور پاک بھارت جنگ کے دوران وہ والی سوات کی مہمان نوازی کے مزے لوٹتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم میں کوہیما (برما) کی مشہور جنگ میں اس کی بزدلی اور کم حوصلگی کے باعث اسے فرسٹ آسام رجمنٹ کی کمان سے الگ کر دیا گیا۔ پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف جنرل میسروی نے ایوب خان کو ترقی کے

لیے نا اہل قرار دیا تھا۔

ایوب خان کو اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ کس طرح اس کی وزارت خارجہ اور دوسرے معتمد افسروں نے دھوکے سے اس کو یقین دلایا تھا کہ آپریشن جبرالٹر اور گرینڈ سلام کی وجہ سے بھارت کبھی بھی بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ ایوب خان خود اتنی فوجی بصیرت اور تجربے کا مالک نہ تھا کہ صورت حال کی نزاکت کو سمجھ سکتا۔ پوری پاکستانی فوجی اور سیاسی قیادت اپنی اس مہم کو کشمیر تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ بھارت بھی ایسا ہی کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ایوب خان یا جنرل موسیٰ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جنگ کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایوب خان اور فوجی قیادت نے محبِ وطن فوجی جوانوں اور بے خبر عوام کا جذباتی اور مذہبی استحصال کیا۔ خوفزدہ ایوب خان نے پورے طور پر جنگ بندی کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ایئر مارشل اصغر خان لکھتے ہیں کہ چینی وزیراعظم چو این لائی نے انہیں کہا تھا کہ ''اگر ایوب خان جنگ کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی صلاحیت اور حوصلہ نہیں رکھتے تھے تو جنگ شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

معاہدہ تاشقند

17 روزہ جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ آپریشن جبرالٹر ناکام رہا جبکہ پاک فوج نے بھارت کا حملہ روک دیا۔ بعض مقامات پر بھارت نے پاکستانی سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیا جبکہ پاک فوج نے بھی بھارتی سرحد کے اندر کئی علاقے فتح کیے۔ بحیثیت مجموعی یہ کسی کی ہار تھی اور نہ ہی جیت۔

پاک فوج دو ہفتوں سے بڑی جنگ لڑنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جبکہ بھارت کے حالات بھی کچھ ایسے بہتر نہیں تھے۔ چنانچہ جب روس کے شہر تاشقند میں جنگ بندی معاہدے کا ڈول ڈالا گیا تو ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم شاستری نے اس پر دستخط میں

کوئی دیر نہ لگائی۔ مشہور بھارتی صحافی کلدیپ نائر لکھتے ہیں کہ جب تاشقند معاہدہ ہونے لگا تو شاستری پر دباؤ تھا کہ وہ مذاکرات میں پاک بھارت کشیدگی کا مستقل حل نکال کر لائیں۔ سیز فائر مسئلے کا حل نہیں تھا۔ بھارتی عوام کو ایک ہی چیز مطمئن کر سکتی تھی کہ شاستری تاشقند میں پاکستان کے ساتھ ایسا معاہدہ کریں جس میں طے پائے کہ اب دونوں ملک کوئی جنگ نہیں کریں گے اور مذاکرات کے ذریعے مسائل حل کیے جائیں گے۔

ایوب خان بھٹو سے نالاں تھا کہ جنگ شروع کرانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ بھٹو اور عزیز احمد نے غلط اعداد وشمار اور حالات کے غلط تجزیے کی بنیاد پر کشمیر میں پانچ ہزار فوجی بھجوانے کا فیصلہ کروایا تھا جس کے نتیجے میں کشمیر تو کیا ہاتھ آتا الٹا لاہور ہاتھ سے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اگر فوج کے مختلف حصوں کی جانب سے انفرادی بہادری کا مظاہرہ نہ کیا جاتا تو حالات سنگین ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب خان نے مذاکرات میں جنگ بندی معاہدے پر دستخط کا فیصلہ کر لیا مگر بھٹو نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ایسے کسی بھی معاہدے کی ڈٹ کر مخالفت کریں گے۔ اب ایوب خان کے لیے مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ کیسے اس معاہدے پر دستخط کریں جس کی مخالفت ان کا اپنا وزیر خارجہ کر رہا تھا۔ چنانچہ مذاکرات میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔

جب میزبان روسی صدر کو پتا چلا کہ دونوں ممالک میں معاہدہ نہیں ہو پا رہا تو انہوں نے شاستری اور ایوب خان کو ایک ساتھ بٹھایا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس دوران ایک ڈرافٹ تیار ہو چکا تھا جس پر دونوں رہنماؤں کے دستخط ہونا تھے۔ جب معاہدہ سامنے لایا گیا تو ایوب خان دستخط کے لیے تیار ہو گئے جبکہ شاستری نے انکار کر دیا۔ روسی صدر کوسیجن نے شاستری سے دستخط نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ جب تک اس معاہدے میں بھارت اور پاکستان جنگ نہ کرنے کا نہیں لکھیں گے اس وقت تک وہ دستخط نہیں کریں گے۔ یہ سن کر روسی صدر نے ایوب خان کو دیکھا اور حیران ہوئے کہ اگر

جنگ لڑنی ہے تو پھر وہ یہاں تاشقند میں کیا کر رہے تھے۔ نیا معاہدہ لکھوانے کے بجائے ایوب خان نے جیب سے قلم نکالا اور ہاتھ سے اس پر لکھ دیا کہ پاکستان اور بھارت لڑے جھگڑے بغیر باہمی مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ شاستری اس پر بھی راضی نہیں تھے، وہ چاہتے تھے کہ پورا معاہدہ لکھا جائے کہ پاکستان اور بھارت آئندہ ایک دوسرے کے خلاف کبھی جنگ نہیں کریں گے۔

یہی وہ راز تھا جو بھٹو نے چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ وہ قوم کو بتائیں گے کہ ایوب خان نے تاشقند میں کشمیر کا سودا کیسے کیا تھا۔ بھٹو کو اس راز کا پتا چل گیا تھا کہ ایوب خان نے اپنے ہاتھ سے معاہدے پر لکھ دیا تھا کہ وہ بھارت سے لڑائی نہیں لڑیں گے۔ یوں بھٹو عوام کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان کا فوجی صدر لڑائی کے لیے تیار نہیں تھا لیکن وہ خود بھارت سے ہزار سال تک لڑنے کے لیے تیار تھے۔ تاہم بھٹو سمجھدار نکلے اور انہوں نے یہ راز بھی نہ بتایا (یہ معاہدہ جس پر ایوب خان نے اپنے ہاتھ سے اضافہ کر دیا تھا، اس وقت بھارتی وزارت خارجہ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے جس کا کلدیپ نائر نے اپنی کتاب میں عکس چھاپا ہے اور اس پر ایوب خان کی لکھائی واضح دکھائی دیتی ہے)

کلدیپ نائر لکھتے ہیں کہ شاستری نے جب معاہدے کے بعد اپنے گھر فون کیا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ لوگ خوش نہیں ہیں کیونکہ آپ نے اچھا معاہدہ نہیں کیا۔ مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا مستقل معاہدہ کیوں نہ ہو سکا۔ بھارتی یہ سمجھتے تھے کہ شاستری مذاکرات کی میز پر وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جو ان کی فوج نے میدان پر حاصل کی تھی۔ دوسری جانب پاکستان میں ایوب خان کے بارے میں بھی یہی رائے تھی۔ معاہدہ ہونے کے بعد اگلی رات شاستری کا انتقال ہو گیا۔ عام خیال کے مطابق شاستری اپنی عوام کی توقعات کے مطابق معاہدہ نہ ہو پانے کے باعث دباؤ کا شکار تھے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاستری پاکستانی وزیراعظم ایوب خان سے

اپنی شرائط منوا کر خوشی کی کیفیت میں تھے جس سے انہیں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ایوب خان بھٹو کو بھی خوش نہ کر سکے اور بھارت سے با قاعدہ جنگ نہ کرنے کے معاہدے کا موقع بھی ضائع کر دیا۔ اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کا حملہ روک دیا تھا مگر میدان جنگ میں حاصل ہونے والی کامیابیاں ایوب خان نے مذاکرات کی میز پر ضائع کر دیں جس سے قوم میں بے دلی پھیل گئی۔

40 سال گزرنے کے بعد مورخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک قطعی غیر ضروری، بے معنی اور لا حاصل جنگ تھی جس سے گریز بہت آسان تھا۔ اگر دونوں ملکوں کی قیادت بصیرت سے کام لیتی اور حالات کی یرغمالی نہ بن جاتی تو اس جنگ سے بچا جا سکتا تھا۔ اس جنگ سے ڈیڑھ برس قبل پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری آئی تھی اور مسئلہ کشمیر کے تصفیے کی راہ بھی ہموار ہونے لگی تھی۔ اگرچہ 1963ء میں مسئلہ کشمیر پر بھٹو اور سورن سنگھ کے مذاکرات ناکام رہے تھے لیکن ان مذاکرات میں پہلی مرتبہ پاکستان نے استصواب رائے شماری کے علاوہ تصفیے کے لیے دوسرے حل تلاش کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس موقع پر جنگ بندی لائن میں ردوبدل کی بنیاد پر کشمیر کی تقسیم کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ امریکا کے محکمہ خارجہ کی یادداشتوں میں اس امر کی تصدیق کی گئی ہے کہ 1963ء کے دوطرفہ مذاکرات میں پاکستان نے استصواب رائے کے علاوہ دوسری تجاویز پر غور کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور بھارت نے کشمیر کو متنازع علاقہ تسلیم کر کے علاقائی ردوبدل پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اسی پس منظر میں بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے 1964ء میں شیخ عبداللہ کو طویل نظر بندی کے بعد رہا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کے دفاع میں انہوں نے لوک سبھا میں کہا تھا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے تصفیے کے لیے پاکستان کے ساتھ آئینی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ بھارت پاکستان اور کشمیر کی ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن چاہتے تھے یا کشمیر کے کچھ علاقوں کو مشترکہ کنٹرول میں دینے کے خواہش مند

تھے۔ شیخ عبداللہ نہرو کی آشیر باد سے پاکستان آئے جہاں انہوں نے ایوب خان سے نہرو کے ساتھ سربراہ مذاکرات کے امکانات پر بات کی تھی۔ اسی دورے میں دلی سے نہرو کے انتقال کی خبر آئی اور شیخ عبداللہ کو واپس بھارت جانا پڑا۔

نہرو اپنی زندگی کے آخری دور میں مسئلہ کشمیر حل کرنا چاہتے تھے مگر انہیں مہلت نہ مل سکی۔ نہرو کے بعد لال بہادر شاستری وزیراعظم بنے۔ شاستری نہرو کی کابینہ میں وزیر ریلوے کے طور پر کام کرتے رہے تھے تاہم ایک ٹرین حادثے کے بعد انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ لال بہادر شاستری نہرو ہی کے انداز فکر کے مطابق کشمیر کے تصفیے کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے خواہش مند تھے اور اسی مقصد سے انہوں نے 1964ء کے اواخر میں جے پرکاش نارائن کی قیادت میں ایک وفد پاکستان بھیجا تھا۔ اسی پس منظر میں لال بہادر شاستری نے اکتوبر 1964ء میں کراچی کے ہوائی اڈے پر ایوب خان سے ملاقات کی تھی۔ چونکہ چند ماہ بعد پاکستان میں صدارتی انتخابات ہونے والے تھے لہٰذا اس ملاقات میں لال بہادر شاستری نے صدارتی انتخابات کے بعد کشمیر کے تصفیے کے لیے مذاکرات کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن حالات نے اس وقت پلٹا کھایا جب بھارت میں وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ اور حزب مخالف جن سنگھ نے لال بہادر شاستری پر اس قدر سخت دباؤ ڈالا کہ وہ کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانے کے لیے آئین میں ترامیم پر مجبور ہو گئے جن کے تحت ریاستی اسمبلی کو صدر ریاست کے انتخاب کے حق سے محروم کر کے دلی کو گورنر کی تقرری کا اختیار دے دیا گیا اور لوک سبھا میں پہلی بار کشمیر کی نشستیں مخصوص کی گئیں۔

ایوب کا زوال

دوسری جانب ذوالفقار علی بھٹو اور عزیز احمد نے رن آف کچھ کے معرکے میں

پاکستان کی جیت کے بعد آپریشن جبرالٹر کا ایسا جال پھیلایا کہ ایوب خان بے دست و پا ہو گئے۔ ایئر مارشل اصغر خان اپنی کتاب ''پاک بھارت جنگ کا پہلا دور'' میں لکھتے ہیں کہ اس آپریشن کی منصوبہ بندی میں بہت سقم تھا اور جب ایوب خان نے خطرہ ظاہر کیا کہ اس آپریشن کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں بھرپور جنگ چھڑ سکتی ہے تو بھٹو اور عزیز احمد نے یہ کہا تھا کہ امریکیوں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ بھارت بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی ایسی یقین دہانی تھی تو وہ چھ ستمبر کو درست ثابت نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں دونوں ملکوں میں ایسے عناصر طاقتور اور بااثر ثابت ہوئے جو برصغیر کو معرکہ آرائی اور جنگ کی آگ میں دھکیلنے پر تلے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ دونوں ملک تیزی سے بھرپور جنگ میں کود پڑے جس نے برصغیر کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جنگ ختم ہوگئی مگر اس کے ساتھ ایوب خان کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ ایوب آمریت دراصل پاکستان کے مسائل کا آغاز تھی جس نے ملک کو سیاسی، معاشی، اقتصادی جغرافیائی اور سماجی اعتبار سے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ملک دشمنی پر مبنی اقتدار کے اس کھیل میں خاکی اور فیوڈل لارڈز نے باہم گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقات انگریزوں کے غلام تھے جبکہ عوام کا سیاسی شعور اتنی بلندی پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ اس گٹھ جوڑ کے خلاف موثر مزاحمت کرتے۔ ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے سے پہلے دس برس ملک میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ آئے روز حکومتوں کو چلتا کرنے کی سازشوں میں وہ برابر کے شریک تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی جہاں کہیں انہیں کوئی اپنے مقابل ابھرتا دکھائی دیتا اسے سازش کے ذریعے پیچھے دھکیل دیتے تھے۔ گزشتہ سطور میں جنرل اعظم خان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ پچاس کی دہائی کے اوائل میں مشرقی پاکستان شدید ترین سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے میں فوج کی ایسٹرن کمان کے سربراہ جنرل اعظم خان نے مشرقی پاکستان کے عوام کی مدد کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اعظم

خان نیکر پہن کر خود پانی میں جا کر سیلاب زدگان کے لیے امدادی کاموں کی نگرانی کرتے رہے۔ ان کی عوامی مقبولیت دیکھ کر ایوب خان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں اعظم ان سے آگے نہ بڑھ جائیں۔ چنانچہ اس نے اعظم خان کو مشرقی پاکستان سے واپس بلا لیا اور لاہور میں تحریک ختم نبوت کو بزور طاقت کچلنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

ایوب خان کے دور حکومت میں ہی سندھ طاس معاہدے کے تحت پاکستان نے اپنے دریا بھارت کے حوالے کر دیے۔ یہ معاہدہ 1960ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان طے پایا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ایوب خان ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا جبکہ بھارت کی وزارت عظمٰی کے منصب پر جواہر لعل نہرو جیسی جہاں دیدہ اور زیرک سیاسی شخصیت فائز تھی اور جمہوری نظام مکمل طور سے فعال تھا۔ یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے فیصلے عقل و شعور سے عاری ایک جاہ پرست کے ہاتھ میں تھے۔ ان حالات میں ورلڈ بینک کی ضمانت کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج اور دریائے بیاس کی تقسیم کا معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کی رو سے مشرقی دریاؤں یعنی راوی، ستلج اور بیاس پر بھارت کو خصوصی اختیارات حاصل ہو گئے جس کے بدلے بھارت نے پاکستان کو کچھ رقم بھی ادا کی۔ مغربی دریاؤں پر پاکستان کو حقوق دیے گئے مگر یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ اگر متعین مدت تک پاکستان ان دریاؤں پر پانی کنٹرول کرنے کے ذخائر تعمیر نہیں کرتا تو بھارت ان دریاؤں کے پانی کو بھی مقامی ضروریات، زرعی مقاصد اور بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

اس معاہدے کے بعد پاکستان میں منگلا اور تربیلا ڈیم بنائے گئے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہو گی کہ دریائے سندھ پر کالا باغ کا مقام ڈیم کے لیے فطری طور پر موزوں ترین جگہ ہے جہاں بند بنانے کا منصوبہ لیاقت علی خان کے دور میں تیار کیا گیا تھا۔ مگر ایوب خان نے کالا باغ ڈیم کے بجائے اپنے آبائی گاؤں کے قریب تربیلا میں ڈیم

بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس اقدام سے اندازہ ہوتا ہے کہ حساس ترین نوعیت کے ملکی معاملات کس سوچ کے تحت چلائے جارہے تھے۔ تربیلا اور منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد پاکستان میں اس ضمن میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بھارت نے مشرقی دریاؤں پر متعدد ڈیم بنائے جبکہ اس نے مغربی دریاؤں کے پانی سے استفادہ بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے مابین پانی کے مسئلے پر متعدد اختلافات جنم لیتے رہے ہیں اور حالیہ دور میں ان کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سندھ طاس معاہدہ فوری طور پر نظر ثانی کا متقاضی ہے اور اس شعبے سے متعلق ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سے پاکستان کو آئندہ دو دہائیوں میں ایتھوپیا جیسے قحط کا سامنا ہوسکتا ہے۔

پاکستان میں بدعنوانی کے ساتھ ساتھ اقرباپروری کا آغاز بھی ایوب خان کے دور حکومت میں اور انہی کے اپنے گھر سے ہوا۔ ایوب خان نے کراچی میں موٹر کاریں بنانے والی کمپنی جنرل موٹرز اونے پونے داموں خرید کر گندھارا موٹرز کے نام سے اپنے بیٹے گوہر ایوب کے حوالے کردی۔ گوہر ایوب اس وقت فوج میں کپتان تھے جنہیں ملازمت سے استعفیٰ دلوا کر ان کے لیے کاروبار کا اہتمام کیا گیا۔ یوں انٹر پاس گوہر ایوب اپنے باپ کی آشیرباد سے مختصر عرصے میں کروڑ پتی بن گئے۔ یہ ملک میں حکمرانوں کی بدعنوانی کی پہلی بڑی مثال تھی جو بعدازاں ریت بن گئی۔

ایوب خان کے دور حکومت میں ہونے والی نام نہاد صنعتی ترقی کی حقیقت بھی سامنے آچکی ہے۔ اگرچہ اس دور میں بہت سی صنعتیں قائم ہوئیں مگر اس ضمن میں ایک بنیادی اصول سے انحراف کیا گیا کہ چھوٹی صنعتوں کے فروغ پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ بڑی صنعتوں کا دارومدار چھوٹی صنعتوں پر ہوتا ہے چنانچہ چھوٹی صنعت کو زوال آیا تو بڑی صنعتی ترقی بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی۔

پاکستان نے پہلا قرضہ بھی ایوب آمریت کے دوران لیا اور یہ رقم صنعتکاروں کو

دی گئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ دولت مرتکز ہوکر 22 خاندانوں تک محدود ہوگئی اور صنعت کے ثمرات غریب عوام تک نہ پہنچ سکے۔ یہ سب کچھ عوام کی نمائندہ جمہوری حکومت کے بجائے شخصی آمریت میں ہونے والے فیصلوں کا نتیجہ تھا۔

قائداعظم اور لیاقت علی خان پاکستان کی خارجہ پالیسی کو متوازن اور غیر جانبدارانہ خطوط پر تشکیل دینے کے خواہش مند تھے مگر ایوب آمریت میں خارجہ تعلقات کے شعبے میں بانیان پاکستان کے رہنما خطوط کو پس پشت ڈال دیا گیا اور یوں خارجہ پالیسی کا بیڑہ غرق ہوگیا۔امریکا کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے ایوب خان نے عالمی سامراجی کیمپ میں شمولیت اختیار کرلی۔سوویت یونین اور چین کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے امریکا اور برطانیہ سمیت مغربی طاقتوں نے یورپ میں نیٹو اور ایشیا میں سیٹو اور سینٹو نامی فوجی معاہدے کیے تھے۔ ہر ملک سے ایک ہی معاہدہ ہوتا تھا مگر ایوب خان کی سامراج سے تابعداری کی انتہا تھی کہ انہوں نے سیٹو اور سینٹو دونوں معاہدوں پر دستخط کردیے۔

ایوب خان کا حکومت کرنے کا نسخہ یہی تھا کہ عوام اور ان کے حقیقی نمائندوں کو اقتدار سے دور رکھا جائے اور اپنے گرد نوکر شاہی کا حصار بنالیا جائے۔اسی لیے بالواسطہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا اور آئین میں انتظامیہ کو مضبوط اور عدلیہ و مقننہ کو کمزور کردیا گیا۔تمام تر طاقت کا سرچشمہ صدر کی ذات کو بنایا گیا۔ایوب خان کی کوشش یہی تھی کہ قوم کو سوچنے کے دھندے میں نہ پڑنے دیا جائے اور قوم ان کے ہر فیصلے پر آمین کہے اور احکام بجا لانے میں جت جائے۔ چیدہ چیدہ سول ملازمین کو ہی حکومت کے بست و کشاد میں دخل حاصل تھا۔یوں ریاست مکمل طور سے انتظامیہ کی حکومت بن کر رہ گئی تھی۔فرد واحد کا فیصلہ حرف آخر تھا اور حکومتی مشینری اس پر عمل پیرا ہونے کی پابند تھی۔عوام میں سے صرف بڑے بڑے زمیندار ہی ایوب خان کی طرف بڑھے اور ایوب خان نے بھی ان کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انگریزوں کے کتے نہلا کر جاگیریں پائی تھیں۔

حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی میں دارالخلافہ تبدیل کرنا بھی پہلے سے شامل تھا۔ چنانچہ ملک کا دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی کے قریب منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا جو ایوب خان کی طاقت کے مرکز یعنی فوجی ہیڈ کوارٹر اور ان کے آبائی علاقے کے درمیان ہونا تھا۔ یوں اسلام آباد کے نام سے ایک نیا شہر وجود میں آیا۔ اس نقل مکانی میں مصلحت یہ تھی کہ ایوب خان دارالحکومت اور جی ایچ کیو میں موجود رہے۔ سول اور ملٹری انٹیلی جنس کے ادارے بھی فوری طور پر راولپنڈی منتقل کر دیے گئے۔ ان انتظامات کے طفیل ایوب خان فوج کی سربراہی کے ساتھ ساتھ نام نہاد قومی اسمبلی کو بھی قریب سے دیکھ سکتا تھا اور ارکان اسمبلی کی فرداً یا اجتماعی سرگرمیوں کی مکمل اطلاعات بھی اس تک پہنچائی جاتی تھیں۔

مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کی پالیسی سے پہلے ہی نالاں تھے۔ دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو ملک کے دونوں بازوؤں کی اخوت میں بھی دراڑ پڑ گئی۔ کراچی کو قائداعظم نے دارالحکومت بنایا تھا اور ملک کے دونوں حصوں نے اسے بخوشی قبول کیا تھا۔ سمندری راستے سے آتے ہوئے مشرقی پاکستانی شہری اسی بندرگاہ پر اترتے تھے۔ کراچی کی آب و ہوا بھی مشرقی پاکستان سے ملتی جلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بنگالیوں کو اس شہر سے قدرے جذباتی لگاؤ بھی تھا۔

کراچی سے برعکس اسلام آباد مغربی پاکستان کے اندر بہت دور واقع تھا۔ علاوہ ازیں اس علاقے کی آبادی بھی پنجابی تھی جبکہ کراچی کی آبادی پورے پاکستان کی نمائندگی کرتی تھی۔ فوج میں بنگالیوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ راولپنڈی اور جی ایچ کیو ان کے لیے نامانوس جگہیں تھی۔ لہٰذا اس نقل مکانی سے ملک کے مغربی اور مشرقی حصے میں بدگمانیوں کی فضا جنم لینے لگی۔

1962ء کی چین بھارت جنگ میں چینی وزیراعظم چواین لائی نے ایوب خان کو پیش کش کی کہ بھارت دباؤ میں ہے لہٰذا پاکستان باآسانی کشمیر پر قبضہ کر سکتا ہے مگر ایوب

خان اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جب یہ جنگ شروع ہوئی تو بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں پاکستان حالات سے فائدہ اٹھا کر مقبوضہ کشمیر پر حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ نہرو کی ایما پر امریکا نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے اور یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ جیسے ہی بھارت چینی محاذ سے فارغ ہو گا تو دونوں ملکوں میں مذاکرات ہوں گے اور کشمیر کے حوالے سے ایک منصفانہ تصفیہ عمل میں آئے گا۔ ایوب خان نے اس یقین دہانی کو فوری قبول کر لیا اور نہرو کو اطمینان دلایا کہ پاکستان کشمیر پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ جب بھارت اور چین کی جنگ ختم ہوگئی تو پنڈت نہرو نے اپنے شاطر وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو واضح ہدایات کے ساتھ پاکستان سے مذاکرات کے لیے بھیجا۔ یہ مذاکرات دہلی اور مری میں ہوتے رہے جن میں ادھر ادھر کی باتیں، بے مقصد بحث اور بے معنی دلائل شامل تھے۔ یوں سورن سنگھ نے خوبصورتی سے ان مذاکرات کو ڈیڈ لاک کر دیا اور یوں بات ختم ہوگئی۔ اس طرح ایک تجربہ کار سیاست دان نے سیاسی رموز سے نا آشنا جرنیل کو مات دے دی۔

1965ء کی جنگ نے ایوب خان کی کمزور لیڈر شپ کی قلعی کھول دی تھی۔ ایوب اور اس کے جرنیل اپنے ہی ملک کے عوام پر جبر و استبداد سے حکومت تو کر سکتے تھے اور کر رہے تھے لیکن دشمن کا سامنا کرتے ہوئے ان سے کچھ بن نہ پڑی۔ ایوب خان نے جنگ بندی کے لیے جو جتن کیے انہیں دیکھ کر عوام ان سے متنفر ہو گئے۔ مبالغہ آرائی پر مبنی خبروں سے عوام کو پہلے تو یہ تاثر دیا گیا کہ پاکستان جنگ جیت رہا ہے اور عنقریب ایک بہت بڑی فتح ملنے والی ہے اور پھر یکا یک جنگ بندی کی خبر آ گئی۔ بھارت کے ساتھ جنگ بندی کے لیے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں مسئلہ کشمیر کے حل کا کوئی ذکر نہیں تھا جس سے یہ تمام جنگی بکھیڑا بے معنی ہو کر رہ گیا۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بھٹو نے اپنا سیاسی پروگرام ترتیب دیا اور ایوبی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جس کا تذکرہ آئندہ سطور میں ہوگا۔

پاکستان ٹوٹنے کی عملی ابتدا بھی ایوب خان کے دور حکومت میں ہوئی۔ اگرچہ قومی زبان کے مسئلے اور آبادی کے تناسب سے اقتدار میں حصے داری سمیت بہت سی دیگر وجوہات ملک کے دونوں بازوؤں میں نفرت کے آغاز کا سبب بنیں مگر یہ ہرگز ایسے مسائل نہیں تھے جنھیں حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ تاہم یہ مسائل حل کرنے اور اختلافات کی خلیج پاٹنے کے لیے لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، سہروردی، فضل الحق اور عبدالرب نشتر جیسے مدبر سیاست دانوں کی ضرورت تھی جنھیں بدقسمتی سے منظر عام سے ہٹایا جا چکا تھا۔

ایوب آمریت میں ملک کے دونوں حصوں میں نفرتیں تیزی سے پروان چڑھیں۔ سیاسی اختیارات اور ملکی وسائل کی تقسیم میں مشرقی پاکستان کو مسلسل نظر انداز کیا گیا یہی نہیں بلکہ بنگالیوں سے اچھوتوں کا سا سلوک روا رکھا گیا جس سے ان کے دل میں نفرت کے بیج تیزی سے تناور درخت میں تبدیل ہو گئے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ ایوب خان بنیادی جمہوریت کے ارکان سے خطاب کے لیے ڈھاکہ گئے۔ اس موقع پر انھوں نے فوجی وردی زیب تن کر رکھی تھی اور دو دیگر جرنیل بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایوب خان خطاب کے لیے آئے تو بی ڈی ارکان کے رہنما نے انہیں تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ”کیا آپ عوامی نمائندوں سے خطاب کے لیے آئے ہیں یا فوجی آپ کے مخاطب ہیں“ ایوب خان کا مقصد اپنے فوجی دبدبے سے بنگالیوں کو مرعوب کرنا تھا اور یہ ان کی خام خیالی تھی۔ چنانچہ بی ڈی ارکان نے ایوب خان کی تقریر کا بائیکاٹ کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایوب خان مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے تو ان سے متنفر بنگالیوں نے کتوں کے گلے میں ایوب کے نام کی تختیاں ڈال کر انہیں سڑکوں پر چھوڑ دیا۔ گو قیام پاکستان کے بعد ابتدائی دس برس میں حکومتیں تیزی سے بنتی اور ٹوٹتی رہیں مگر مشرقی پاکستان کے سیاست دان بھی اقتدار میں شریک رہے تھے۔ ایوب خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد گویا مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کی کالونی بنا دیا گیا۔ وہی بنگالی

جو قیام پاکستان کی جدوجہد میں سب سے آگے تھے آمریت زدہ پاکستان سے آزادی کی خواہش کرنے لگے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار سمجھے جانے والے شیخ مجیب ہرگز غدار نہیں تھے انہوں نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں مثالی کردار ادا کیا تھا۔ شیخ مجیب مولوی فضل الحق کے سیاسی شاگرد تھے۔ ایوب خان کی حکومت میں بنگالیوں کو گویا دیوار سے لگا دیا گیا یہاں تک کہ وہ پھٹ پڑے اور شیخ مجیب کی قیادت میں اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ہم نے خود غدار بنایا وگرنہ وہ ہم سے کہیں زیادہ محب وطن تھے۔ مغربی پاکستان کی سول اور فوجی اشرافیہ خصوصاً ایوب خان کے دس سالہ دور حکومت میں ملک کی باگ ڈور چلانے والوں نے مملکت خداداد کو دولخت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

1966ء کے اوائل میں لاہور میں ایک آل پارٹیز میٹنگ ہوئی جس میں مشرقی پاکستان سے صرف مجیب الرحمان عوامی لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا۔ جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں بھی عام عوام ایوب خان کی پالیسیوں سے نالاں ہیں تو اس نے آئین میں ترمیم کا چھ نکاتی پروگرام پیش کیا۔

شیخ مجیب کے چھ نکات درج ذیل تھے۔

1۔ 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان ایک وفاق ہونا چاہیے جس میں دونوں حصوں (مغربی اور مشرقی پاکستان) کے حقوق برابر ہوں۔

2۔ ملک کے دونوں حصوں کی کرنسی الگ الگ ہو لیکن دونوں میں تبادلہ کھلا رکھا جائے۔ مشرقی پاکستان کی مالیاتی پالیسی بھی الگ ہونی چاہیے۔

3۔ ہر وفاقی یونٹ کو ٹیکس لینے کا اختیار ہو جبکہ وفاق کو یہ اختیار نہیں دینا جانا چاہیے۔ وفاق کی مالی ضروریات وفاقی یونٹ ہی پوری کریں۔

4۔ وفاقی حکومت کا دائرہ کار صرف دفاع اور امور خارجہ تک محدود ہو۔

5۔ غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا الگ الگ حساب کتاب رکھا جائے۔ ہر وفاقی یونٹ کو

بیرون ملک آزادانہ تجارتی تعلقات رکھنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

6۔ مشرقی پاکستان کی اپنی الگ نیم فوجی تنظیم ہونی چاہیے۔

ایوب خان کی آمریت سے نالاں بنگالی عوام سمجھتے تھے کہ اب ان کے لیے وفاق کے اقتدار میں کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ بیشتر فوج مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے ہے لہٰذا جب بھی یہ اقتدار پر قبضہ کرے گی تو لامحالہ اقتدار کا مرکز مغربی پاکستان ہی ہوگا جبکہ مشرقی پاکستان نوآبادی میں بدل جائے گا۔

مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام اسے بے اطمینانی اور غم و غصے کا آئینہ دار تھا۔ مشرقی پاکستان سے جو لوگ ایوب خان کی حکومت میں شامل ہوئے یا شامل کیے گئے وہ کسی طور بھی عوامی نمائندے نہیں کہلا سکتے تھے۔ان میں کچھ پولیس افسر اور کچھ لوگ مختلف محکموں کے جونیئر افسر تھے۔ ان میں چند ایک ٹھکرائے ہوئے سیاست دان بھی شامل تھے جنہیں بنگالی عوام طویل عرصہ سے سیاسی زندگی سے معزول کر چکے تھے۔ چنانچہ بنگالیوں کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ ایوب خان عوام کے حقیقی نمائندوں کو کبھی آگے نہیں آنے دے گا۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ جب فوجی افسروں نے ایک بار ملک میں اقتدار کا مزہ چکھ لیا تو وہ بار بار اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا شیخ مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام اس نظام کے خلاف زوردار دھماکا تھا جو قومی افق پر نمودار ہوا۔ ملکی اقتصادیات کے ضمن میں مشرقی پاکستان سے ہونے والا امتیازی سلوک بھی بنگالیوں کی مغربی پاکستان اور اس کے کرتا دھرتاؤں سے نفرت کا موجب بنا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پٹ سن کی تمام تر پیداوار مشرقی پاکستان میں ہوتی تھی جبکہ وہاں پٹ سن کا کوئی کارخانہ نہیں لگایا گیا تھا۔ ایسے تمام کارخانے کراچی میں تھے جہاں مشرقی پاکستان سے مال لایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بنگالی اور ان کا رہنما شیخ مجیب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں اسلام آباد کے در و دیوار سے پٹ سن کی بو آتی ہے۔

ایوب خان کے دس سالہ دور حکومت میں بنگالی رہنماؤں کو سیاسی عمل سے دور کر دیا گیا اور ایسے سیاسی، انتظامی و معاشی اقدامات کیے جاتے رہے جس سے ملک کے دونوں بازوؤں میں فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ جب 1956ء کا آئین منسوخ کیا گیا اور تمام سیاسی جماعتوں کو کام کرنے سے روکا گیا تو گویا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خان نے صدارتی نظام نافذ کر کے اور اس میں نائب صدر کا عہدہ نہ رکھ کر مشرقی پاکستان کو پیغام دیا کہ اقتدار میں اس کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نظام میں قومی اسمبلی کی حیثیت ربر سٹمپ سے زیادہ نہیں تھی اور تمام فیصلے صدر ہی صادر کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کو شدید محرومی کے احساس نے گرفت میں لے لیا۔ بنگالیوں کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ ان کے وسائل مغربی پاکستان کی ترقی پر خرچ کیے جا رہے ہیں جبکہ ان کے حصے میں فقط افلاس، غربت اور بیروزگاری آئی ہے۔

1962ء کے دستور کی بنیاد مساوات پر رکھی گئی تھی۔ قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان سے منتخب ارکان اسمبلی ایک ایک مسئلے میں مساوات کا حوالہ دیتے اور مطالبہ کرتے کہ سرکاری ملازمتوں، وسائل کی تقسیم، سفیروں کی تعیناتی اور فوج کے سٹرکچر میں انہیں مساوی حصہ دیا جائے۔ اس پر آئے روز جھک جھک ہوتی جو مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی طبع نازک پر گراں گزرتی تھی۔ ایک مرتبہ ایوب خان نے اپنے وزیر قانون کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ مشرقی پاکستان کی قیادت سے بات کرو کہ وہ بدمزگی پیدا کرنے کے بجائے پاکستان سے علیحدگی اختیار کرنے کا منصوبہ سامنے لائے۔ مشرقی پاکستان کی قیادت نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ ایوب خان نے مارشل لاء کے آغاز میں یہ باور کرایا تھا کہ حالات میں بہتری پیدا ہوتے ہی فوجی راج ختم کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایوب خان اپنے اقتدار کو دوام دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان کے سابق وزیراعلیٰ نورالامین کے مطابق جب مارشل لاء نافذ ہوا اور تین برس گزرنے کے

باوجود کوئی آئین تشکیل نہ دیا جا سکا تو مشرقی پاکستان کے عوام میں احساس محرومی نے جنم لیا کہ ملکی امور اور انتظام میں ان کا کوئی حصہ یا کردار نہیں رہا۔

جب ایوب خان نے 1962ء کا دستور نافذ کیا تو سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کی قیادت میں اس کے خلاف ملک گیر مہم شروع ہوگئی۔ ابتداء میں اس مخالفت کو سختی سے کچل دیا گیا۔ سہروردی گرفتار کر لیے گئے جس کے خلاف شدید عوامی ردعمل دیکھنے کو ملا۔ ایوب دور میں ہونے والی نام نہاد صنعتی ترقی کے نتیجے میں ملک کی دولت رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کے چند گھرانوں تک ہی محدود ہوگئی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام نے ان صنعتکار خاندانوں کو تمام تر استحصال اور حق تلفی کا ذمہ دار قرار دیا۔ ایوب خان کو مسلح افواج کی حمایت حاصل تھی اور فوج کی اکثریت کا تعلق بھی مغربی پاکستان سے تھا۔ حمودالرحمان کمیشن کی رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ ایوب خان تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز نہ کر لیتے اور سیاسی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام کو حکومت میں شرکت کا حقیقی احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتے تو اس بدقسمت ملک کی تاریخ مختلف ہوتی اور تاریخ میں ان کا نام اچھے الفاظ میں محفوظ ہوسکتا تھا۔ سقوط مشرقی پاکستان کی کہانی جب بھی بیان ہوگی تو اس میں شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کا ذکر ضرور ہوگا۔ چھ نکات کیسے وجود میں آئے؟ ان کا حقیقی خالق کون تھا؟ یہ سوال آج بھی سربستہ راز ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ مجیب الرحمان ایسی ذہانت کا مالک نہیں تھا کہ یہ نکات تیار کرتا جبکہ نورالامین کا خیال تھا کہ ان نکات کے پیچھے کسی غیر ملکی طاقت کا ہاتھ تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان نکات کو مشرقی پاکستان کے سی ایس پی افسروں کے ایک گروپ نے کسی بینکار سے مل کر ترتیب دیا تاہم اے کے رفیق الحسن اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ حقیقت میں الطاف گوہر چھ نکات کے خالق تھے اور انہیں مذکورہ بالا بینکار کے توسط سے شیخ مجیب الرحمان سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ سب کچھ صدر

ایوب خان کی رضامندی سے کیا گیا تھا۔ دراصل وہ شیخ مجیب الرحمان کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے تھے اوران کے ہراقدام کا مقصد اپنے اقتدار کو دوام بخشنا تھا جبکہ اس معاملے میں ملکی سلامتی بھی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

چین کے ساتھ تعلقات نے ایوب خان کو بہت سے فوائد مہیا کیے۔ چین سے پاکستان کے تعلق کی برکتوں سے ایوب آمریت کو ترقی پسند حکومت کا تخلص میسر آ گیا۔ عالمی سطح پر ایوب حکومت کی ظاہری کامیابی اپنی گہری تہوں میں معاشی وسماجی بحران لیے ہوئے تھی۔ بظاہر معاشی ترقی کی شرح پانچ فیصد سالانہ تھی مگر یہ ترقی صرف مغربی پاکستان کی حدود میں ہو رہی تھی جبکہ ملک کا مشرقی حصہ ترقی سے محروم تھا اور وہاں غربت اور ناامیدی پنپ رہی تھی۔ مشرقی پاکستان کا انحصار دو فصلوں پر تھا جن میں ایک چاول اور دوسری جیوٹ کی فصل تھی۔ عالمی منڈی میں جیوٹ کی بہت زیادہ مانگ تھی کیونکہ اسے پلاسٹک سمیت دوسری سنتھیٹک اشیا کی تیاری کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ مغربی پاکستان انڈسٹریلائزڈ ہو چکا تھا مگر یہاں محدود ہاتھوں میں دولت کا اجتماع خطرناک حدود کو چھونے لگا تھا۔ ایک جانب 22 خاندان ملک کی صنعتی دولت کے 66 فیصد انشورنس کے 79 فیصد اور بینکاری میں 80 فیصد حصے کے مالک بن چکے تھے۔ دوسری جانب اسی مغربی پاکستان میں فی کس آمدنی 35 پاؤنڈ سالانہ تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ شرح 15 فیصد تک تھی۔ عام عوام میں پھیلی غربت نے ایک دھماکا خیز کیفیت پیدا کر دی تھی جسے بھڑکنے کے لیے محض ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔

ایوب مخالف تحریک

1967ء کے آخر تک ملک کے مختلف علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے تھے جو جنوری 1968ء میں دوبارہ شروع ہو گئے۔ بنیادی جمہوریت کے نام سے کرایا گیا جعلی

الیکشن ان فسادات کی بنیادی وجوہات میں ایک تھا۔ یہ ایسی دھوکا دہی تھی جس کے تحت الیکشن کا حلقہ انتخاب 80 ہزار کٹھ پتلیوں تک محدود رکھنا تھا۔ اس برس پاکستان بڑی عوامی تحریکوں کی زد میں آ چکا تھا جن میں عوام کی سبھی پرتیں شریک تھیں۔ یہ انقلاب اچانک سامنے نہیں آیا تھا بلکہ سماج میں اس کی تیاری طویل عرصہ سے جاری تھی۔ ظاہری استحکام کے عین نیچے بے چینی و اضطراب آہستہ آہستہ مگر یقین کے ساتھ پنپتے جا رہے تھے۔ جنوری 1968ء میں پولیس نے ڈھاکا میں مظاہرین پر فائرنگ کر دی جس سے درجنوں افراد ہلاک ہو گئے۔ چند روز کے بعد عام ہڑتال کے نتیجے میں ڈھاکا مفلوج ہو کر رہ گیا۔ طلبہ کو سنبھالنے کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔ بعد ازاں صحافیوں کی جانب سے 24 گھنٹوں کی ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا جو حکومت کی جانب سے ایمرجنسی مسلط کیے جانے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ یہ قانون جنگ کے دوران نافذ کیا گیا تھا مگر اب اسے ''اندرونی دشمنوں'' کے خلاف بروئے کار لایا جارہا تھا۔ عوام کا غصہ عروج پر پہنچا تو ایوب حکومت نے مراعات کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ مگر اصلاحات کے عمل میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں لوگ مطمئن اور پرسکون ہونے کے بجائے مزید بھڑکتے چلے گئے۔

بادل ناخواستہ ایوب خان نے مشرقی پاکستان سے گرفتار اپوزیشن لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیا۔ بحران سے بچنے کی حتمی کوشش کے طور پر ایوب خان نے ملک کی اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ ملاقات پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس بحران میں اپوزیشن خاطر خواہ کردار ادا نہ کر پائی۔ کراچی کی کاک ٹیل پارٹیوں میں پیش کیے جانے والے ''آئینی اصلاحات'' کے مطالبات کو سڑکوں پر نکلے لاکھوں عوام گھاس نہیں ڈال رہے تھے۔ طلبہ اس انقلابی تحریک کے روح رواں بنے ہوئے تھے جنہوں نے محنت کش طبقے کی طاقت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

فروری اور مارچ 1968ء میں پورے ملک کو ہڑتالوں کی لہر نے اپنی لپیٹ میں

لے لیا۔ ہزاروں محنت کش مارچ کرتے اور نعرے لگاتے سڑکوں پر نکل آئے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی مضبوط سیاسی جماعت موجود نہ تھی جو اس انقلابی دھارے کو منطقی انجام تک لے جاتی۔ مشرقی پاکستان میں مزارعین نے زمینوں پر قبضہ کرلیا اور جرائم پیشہ افراد، دیہی سربراہوں اور ایوب حکومت کے لیے مرکزی کردار ادا کرنے والے کلیکٹروں کو سزائیں دینا شروع کردیں۔ ملک میں ممکنہ سیاسی انقلاب کو دیکھتے ہوئے بڑے تاجروں نے اپنی رقوم بیرون ملک منتقل کرنا شروع کردیں۔ ایوب خان کے خلاف سیاسی تحریک کے ابتدائی دو ہفتوں میں ہی بلیک مارکیٹ میں پاؤنڈ کی قیمت 21 سے 30 روپے تک جا پہنچی جبکہ سونے کی قیمت میں 40 فیصد تک اضافہ ہوگیا۔ حکومت کی خود کو سنبھالنے میں ناکامی واضح ہوچکی تھی۔ ریاستی عملداری ریت کی طرح بکھر گئی اور تمام قوت مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوچکی تھی۔ عام عوام خصوصاً محنت کش طبقہ، طلبہ اور ٹریڈ یونینز جبر کی زنجیریں توڑ کر باہر نکل آئے تھے۔ دس برس تک سیاست دان جو کام نہ کرسکے وہ عوام کی طاقت نے ایک ماہ میں ہی ممکن کر دکھایا۔

کراچی میں فوج کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم ملا۔ جونیئر افسروں نے یہ حکم ماننے سے انکار کیا تو ان کا کورٹ مارشل کردیا گیا۔ اس وقت مشہور امریکی اخبار ''دی ٹائمز'' نے لکھا کہ ''ہر پیشے میں ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ تجارت ہو یا کوئی اور ادارہ، ڈاکٹروں سے لے کر ریلوے اور ریاستی انجینئروں تک تمام لوگ سڑکوں اور گلیوں میں مارچ کررہے ہیں۔ دو ہفتوں سے ڈھاکا میں پولیس کہیں دکھائی نہیں دی''

ایوب حکومت کے اعصاب جواب دے چکے تھے اور صورتحال قابو سے باہر تھی۔ حکومتی مشینری ہوا میں معلق تھی، پولیس فورس شل ہوچکی تھی جبکہ فوج متذبذب تھی۔ سیاسی تحریک نے ہر شعبے اور ہر ادارے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور پورے سماج کی سوچ تبدیل ہوکر رہ گئی تھی۔ ایسے میں انقلابی قیادت کے علاوہ انقلاب کے تمام عوامل موجود تھے۔ ایوب

خان کے خلاف اس تحریک پر بائیں بازو کے عناصر کا غلبہ تھا مگر خاطر خواہ قیادت کی عدم موجودگی کے باعث بھٹواس تحریک کے رہنما کے طور پر ابھر کر سامنے آ گئے۔

1969ء میں یہ ہنگامے بے قابو ہو گئے اور ایوب خان کو نوشتہ دیوار نظر آنے لگا۔ آمر کے خلاف سالہا سال سے عوام کے دلوں میں پلتی نفرت اب باہر آ چکی تھی اور گلی گلی ''ایوب کتا'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ایوب خان کا کمسن پوتا بھی گھر میں دوران کھیل نوکروں چاکروں کو جمع کر کے یہی نعرہ لگاتا پایا گیا جس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے نفرت کے جو بیج بوئے تھے ان سے اگنے والی فصل خود انہیں کاٹنا پڑے گی۔ چنانچہ محلاتی سازشوں اور طاقت کے بل پر اقتدار کا کھیل کھیلنے والے ایوب خان کے اعصاب جواب دے گئے۔ ایسے میں ان کا مقرر کردہ کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان پس پردہ تمام اختیارات کا مالک بن چکا تھا۔

اسی دوران ایوب خان پر دل کا دورہ پڑا اور ان کی بیماری کو چھپانے کی کوشش کی گئی۔ ملک کے سنجیدہ طبقوں میں یہ سوال شدت سے ابھر رہا تھا کہ ایوب خان کے بعد جو خلا پیدا ہو گا اسے آئین کے تحت کیسے پر کیا جائے گا۔ دوسری جانب یحییٰ خان نے ایوب خان کی مثال سامنے رکھ کر جی ایچ کیو میں اپنے ہم خیال جرنیلوں کو جمع کیا۔ ان میں جنرل حمید، جنرل گل حسن، جنرل پیرزادہ اور جنرل غلام عمر شامل تھے۔ یحییٰ خان کا خیال تھا کہ ایوب خان کے بعد کرسی اقتدار پر مسلط ہونے کا حق اسے ہی ملنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ جس روز ایوب خان بیمار ہوئے اسی دن یحییٰ خان نے اپنا بستر ایوان صدر میں لگوا لیا تھا۔ ایوب خان صحت مند ہوئے تو ان طالع آزما جرنیلوں نے خود برسر اقتدار آنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بعض سیاسی رہنماؤں سے بھی رابطہ کیا اور انہیں کامیابی سے اپنا آلہ کار بنا لیا۔

اسی دوران ہر طبقے میں بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ حکومتی جبر اور عوامی صبر میں

طویل عرصے سے مقابلہ جاری تھا۔ ریلوے مزدوروں نے اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال کی تو طاقت کے اندھے استعمال سے اسے کچل دیا گیا۔ انہی دنوں عید آئی تو کسی نے صدر ایوب کو اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ عید کی نماز جمعے کو پڑھی جائے تو مملکت کے سربراہ پر بھاری ہوتی ہے۔ چنانچہ ایوب خان عید جمعے کے بجائے جمعرات کو منانے پر تل گئے۔ چاند نظر نہ آیا مگر رات تین بجے اعلان کر دیا گیا کہ صبح عید ہو گی۔ علماء نے مزاحمت کی تو ان کے خلاف بھی سخت ایکشن لیا گیا۔ چند ہفتے بعد پانچ علماء کو گرفتار کر لیا گیا جن میں مولانا مودودی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا اظہر حسن زیدی، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مفتی محمد حسین نعیمی شامل تھے۔ حکومت کے خلاف لکھنے پر چٹان اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ کر کے پریس ضبط کر لیا گیا اور اخبار کے ایڈیٹر شورش کاشمیری گرفتار کر لیے گئے۔ غرضیکہ حکومت نے عوامی مزاحمت کچلنے کے لیے آخری حربے تک استعمال کر ڈالے۔

اس موقع پر ذوالفقار علی بھٹو جو وزارت سے علیحدگی کے بعد لاہور میں ریلوے سٹیشن پر عوامی استقبال کا جواب صرف آنسو بہا کر دے سکے تھے، جو حکومت کے کہنے پر کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر بھی چلے گئے تھے اور حزب اختلاف کی مشترکہ جدوجہد میں مسلسل وعدوں کے باوجود شامل ہونے آمادہ نہیں ہوئے تھے، وہ یکلخت سیاسی میدان میں وارد ہوئے۔ بھٹو نے مغربی پاکستان میں ہنگامہ آرائی کی سیاست کا آغاز کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نے بعض فوجی جرنیلوں کے کہنے پر گھیراؤ جلاؤ کا بازار گرم کر دیا۔ وہاں سینکڑوں افراد کا قتل عام بھی کیا گیا۔ اسی دوران بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا اور ایئر مارشل اصغر خان بھی میدان سیاست میں آ گئے۔ ایوب خان کے خلاف تحریک جمہوریت کے رہنما اصغر خان کے بیانات کو اپنے مقاصد سے ہم آہنگ سمجھتے تھے۔ ان کا سیاسی رویہ بھٹو کے برعکس متین اور سنجیدہ تھا۔

ایوب خان کے خلاف جمہوری تحریک کے رہنماؤں نے محسوس کیا کہ سیاسی

جماعتوں کے اتحاد کو مزید وسعت دی جانی چاہیے اور اب تک جو سیاسی عناصر اس میں شامل نہیں ہوئے انہیں بھی شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے نیشنل عوامی پارٹی، شیخ مجیب کی چھ نکاتی عوامی لیگ اور جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ ڈھاکا میں مذاکرات کیے گئے۔ دو نکات پر ان جماعتوں کے ساتھ اتفاق رائے عمل میں آیا جن میں وفاقی پارلیمانی نظام کا قیام اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کا انعقاد شامل تھے۔

یحییٰ خان ملک میں اس قدر افراتفری پیدا کرنا چاہتے تھے کہ ایوب خان کے لیے حکومت چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے اور عوام کو یقین ہو جائے کہ فوج کے سوا ملک کو تباہی اور انارکی سے کوئی نہیں بچا سکتا اور یوں یحییٰ خان کی مارشل لاء حکومت کو قبول کر لیا جائے۔ انہی دنوں مولانا بھاشانی لاہور آئے۔ اس سے پہلے وہ مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر گھیراؤ جلاؤ کا اہتمام کر چکے تھے۔ لاہور ایئرپورٹ پر اترتے ہی انہوں نے استقبال کے لیے آئے ہوئے بائیں بازو کے کارکنوں سے پوچھا ''کیا گلبرگ کی کوٹھیاں ابھی تک محفوظ ہیں؟ انہیں آگ نہیں لگی؟''

جیسا کہ بالائی سطور میں بیان کیا جا چکا ہے طلبہ اور مزدور اس تحریک کا ہراول دستہ تھے جس میں دن بدن شدت آتی جا رہی تھی۔ ایوب خان کی طاقت ختم ہو چکی تھی اور عوام نے ثابت کر دیا تھا کہ اگر وہ اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو کڑی سے کڑی آمریت بھی ان کے سامنے ٹک نہیں سکتی۔ کراچی سے خیبر اور ڈھاکا تک بپھرے ہوئے عوام ایوب خان کے خلاف جان کی بازی لگا دینے کو تیار تھے۔ اس موقع پر غیر ملکی مبصرین نے تبصرہ کیا کہ اگر فوری انتقال اقتدار نہ ہوا تو عوام خود ایوب خان کا تختہ الٹ دیں گے۔ ایوب خان کے اعصاب جواب دے گئے۔ انہوں نے اپنے نشری خطاب میں اعلان کیا کہ ذمہ دار سیاسی جماعتوں کو بات چیت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ تاہم انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ جنرل یحییٰ خان سیاست دانوں کی گول میز کانفرنس کی ناکامی اور اقتدار پر قبضے کے متمنی ہیں۔

چنانچہ ایوب خان نے تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کو طلب کیا اور خواہش ظاہر کی کہ جن شہروں میں امن عامہ کی صورتحال بہت زیادہ بگڑ چکی ہے وہاں جزوی طور پر مارشل لاء لگا دیا جائے۔ جنرل یحییٰ خان نے یہ تجویز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پورے ملک میں مارشل لاء لگایا جائے تو وہ تیار ہیں۔ یحییٰ خان کی اس تجویز کا مفہوم واضح تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اقتدار انہیں منتقل کر دیا جائے۔ صدر ایوب خان نے کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے شیخ مجیب کی رہائی کا فیصلہ کر لیا اور ان کے خلاف اگرتلہ سازش کیس بھی واپس لے لیا۔ گول میز کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی جس میں شیخ مجیب نے اپنے چھ نکات کی منظوری کے علاوہ دارالحکومت کی ڈھاکا منتقلی، ڈھاکا میں تینوں مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹرز کے قیام، ون یونٹ کے خاتمے اور مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان مساوی نیابت کے اصول کے خاتمے کی تجاویز پیش کیں۔

انہی دنوں یحییٰ خان نے فوجی ہیلی کاپٹر لاہور بھیجا جس کے ذریعے شیخ مجیب کو راولپنڈی بلایا گیا جہاں اس نے یحییٰ خان سے ملاقات کی۔ یحییٰ نے مجیب کو انتباہ کرنے کے بجائے کہا کہ آپ جو مطالبات مناسب سمجھیں کانفرنس میں پیش کریں، فوج ان سیاسی معاملات میں قطعاً غیر جانبدار رہے۔ اس سے مجیب الرحمان کو مزید شہ ملی۔ مزید براں دولتانہ اور دوسرے سیاسی عناصر کے اصرار پر غیر مشروط رہائی نے شیخ مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان میں قومی ہیرو بنا دیا تھا۔ نوابزادہ نصر اللہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ ''گول میز کانفرنس میں صدر ایوب نے ابتدائی تقریر کی اور میں نے جمہوری تحریک کے کنوینز کی حیثیت میں دو متفقہ نکات پیش کیے۔ شیخ مجیب نے چھ نکاتی پروگرام اور دوسرے مطالبات کے بارے میں ٹائپ شدہ آٹھ صفحات کی تقریر پڑھی۔ اس موقع پر ایوب خان نے اعلان کیا کہ وہ سیاسی جماعتوں کے دو متفقہ مطالبات یعنی براہ راست انتخابات اور پارلیمانی نظام حکومت کو تسلیم کرتے ہیں جبکہ باقی تمام معاملات نئی منتخب ہونے والی خود مختار اسمبلی پر چھوڑ دیتے ہیں''

کانفرنس کے اختتام پر صدر ایوب خان نے دونوں صوبوں میں نئے گورنر مقرر کیے۔ مغربی پاکستان میں یوسف ہارون اور مشرقی پاکستان میں شمس الضحیٰ کی تقرری ہوئی۔ گول میز کانفرنس کی کامیابی کا عوام پر خاطر خواہ اثر ہوا لیکن یحییٰ خان بے حد پریشان ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں میں اضافہ کر دیا۔ ملک میں امن و امان کی صورتحال قدرے بہتر ہونے لگی تو یحییٰ خان نے اپنے بھائی آغا محمد علی (مغربی پاکستان میں سی آئی ڈی انچارج) اور ملٹری سیکرٹری کے ذریعے صدر ایوب کو مسلسل رپورٹیں بھجوائیں کہ صورت حال پہلے سے زیادہ خراب ہے اور صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ فوج براہ راست میدان میں آ جائے۔ ایوب خان نے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر کی قیادت میں ایک وفد کو پیغام دے کر جنرل یحییٰ خان کے پاس بھیجا اور اس سے درخواست کی کہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے وہ امن بحال کرنے میں تعاون کرے اور مارشل لاء نہ لگائے۔ یحییٰ خان نے اس درخواست پر توجہ نہ دی۔

مارچ 1969ء میں ایوب خان نے یحییٰ خان کو مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ''یہ تمہارا آئینی اور قانونی فریضہ ہے کہ نا صرف بیرونی حملے کی صورت میں ملک کا دفاع کرو بلکہ اس کو اندرونی خلفشار سے بھی محفوظ رکھو۔ قوم تم سے توقع کرتی ہے کہ اپنے اس فریضے کو بطریق احسن انجام دو۔ ملک کی سلامتی کے ساتھ اس کے معاشرتی، اقتصادی اور انتظامی نظام کو بحال کرنے اور برقرار رکھنے میں مدد اور تعاون کرو۔ آؤ اور اس بدحال ملک کے بارہ کروڑ عوام کو امن اور خوشحالی واپس دلاؤ''

اپنے اس خط کا منفی ردعمل دیکھ کر ایوب خان نے اگلے ہی روز حکومت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا اور یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔

میں نے پاکستان ٹوٹتے دیکھا

یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا، خود صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا اور 1962ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ ایوب خان کی طرح یحییٰ خان نے بھی اس دن کے لیے تیاری کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص اور بااعتبار دوستوں کو ترقیاں دے کر اہم عہدوں پر فائز کر رکھا تھا۔ سلسلہ وار انجام پانے والے مختلف اقدامات پہلے سے تیار تھے۔ لہٰذا فوری طور پر ایک نیا لیگل فریم ورک آرڈر جاری ہو گیا۔ اس فریم ورک کی رو سے صوبہ مغربی پاکستان کو توڑ دیا گیا اور سابقہ صوبہ جات یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان بحال ہو گئے۔ بنیادی جمہوریت کا نظام منسوخ کر دیا گیا اور براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا نظام بحال ہو گیا۔ قومی اسمبلی میں ارکان کی تعداد 313 مقرر ہوئی جن میں 169 رکن مشرقی پاکستان اور 144 ارکان مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں سے لیے جانا تھے۔ مشرقی پاکستان کے واحد صوبے کی اپنی اسمبلی کے ارکان کی تعداد 310 اور مغربی پاکستان کی چاروں صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی مشترکہ تعداد 211 مقرر ہوئی۔ اس تقسیم سے مشرقی پاکستان کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں مغربی پاکستان پر اکثریت حاصل ہو گئی۔ اس آرڈر کے ذریعے یہ بھی کہا گیا کہ قومی اسمبلی منتخب ہونے پر آئین ساز اسمبلی کا کردار بھی ادا کرے گی اور 120 دن میں نیا آئین مرتب کیا جائے گا۔

مزید براں ایک پروویژنل آئینی آرڈر کے ذریعے عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیے گئے۔ جب اس آرڈر کے باوجود اعلیٰ عدالتیں فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے

خلاف اپیلیں سنتی رہیں تو یحییٰ خان نے ایک اور حکم نامہ جاری کیا جو عدالتوں کے اختیارات کی حدود سے متعلق شکوک دور کرنے کا آرڈیننس کہلایا۔ اس کے ذریعے عدالتوں کے اختیارات سختی سے محدود کردیے گئے۔

برطانوی مورخ لارنس زائرنگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''ایوب خان نے اپنی حکومت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے ایک پیچیدہ آئین بنایا تھا جسے تاریخ کے ملبے میں دفن کردیا گیا۔ ایسے میں سیاسی انتظام ہی رہا جسے فوجی شکل دے دی گئی تھی''

1970 کے الیکشن

یحییٰ خان نے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرایا جسے وہ اسمبلی کے ذریعے نافذ کرانا چاہتا تھا۔ یحییٰ خان اور اس کے فوجی جرنیلوں کے ٹولے کو یقین کامل تھا کہ جو الیکشن ان کے عہد میں ہوگا اس کے نتائج سو فیصد ان کی خواہش اور منصوبے کے مطابق ہوں گے۔ لہٰذا آئین کو باقاعدہ طور پر شائع بھی کرالیا گیا تھا۔ مگر ان لوگوں کی بدقسمتی سے اس آئین کے نفاذ کا موقع ہی نہ آسکا۔

1970ء کے الیکشن میں یحییٰ خان کی حکومت نے انتخابی عمل پر براہ راست اثرانداز ہونے کی کوشش نہیں کی، تاہم خفیہ طور پر کئی سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی مالی امداد کی گئی تاکہ عوام کے ووٹوں کو اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ کوئی پارٹی واضح اکثریت حاصل کرکے حکومت بنانے کے قابل نہ رہے۔ ایسے موقع پر فوجی حکومت اپنی من مرضی سے ایسی چال چلتی کہ مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل لاکر اپنی پسند کی مخلوط حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیگل فریم ورک کا مسئلہ بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس کی رو سے قومی اسمبلی کو 120 دن میں آئینی ڈھانچہ تیار کرنا تھا ورنہ ناکامی کی صورت میں اسمبلی کی بساط لپیٹی جاسکتی تھی۔ یہ بات بھی نہایت اہم تھی کہ یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کردیا تھا

مگراس نے صدر ایوب کی پالیسیوں سے برعکس کسی بھی سیاسی جماعت پر پابندی عائد نہ کی اور نہ ہی سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں لائی گئی تاہم کچھ عرصہ کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر قدغن ضرور دیکھنے میں آئی۔

شیخ مجیب الرحمان نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد چھ نکاتی منصوبے پر رکھی۔ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں قومی خود مختاری کی بنیاد پر انتخابی مہم استوار کی گئی جبکہ پنجاب کو دفاعی حکمت عملی کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبہ سندھ کو جہاں ایک طرف پنجابی اور مہاجر کی تقسیم کے تحت گروہی سازش کا شکار ہونا پڑا وہیں دوسری جانب وڈیروں کی مفاد پرستانہ روش کا سامنا بھی رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی پنجاب میں بااثر طبقے پر بھروسہ کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اتحادیوں کے کردار کو بھی اپنا ہم نوا خیال کرتی تھی۔ بھٹو تو جنرل یحییٰ کی حکومت میں ڈپٹی وزیراعظم کے طور پر بھی کام کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ یحییٰ خان اپنی پسندیدہ جماعتوں میں بھٹو کی پیپلز پارٹی، قیوم خان کی مسلم لیگ اور چند چھوٹے سیاسی گروہوں پر اعتماد کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سیاسی جماعتوں کو الیکشن کی بھرپور مہم چلانے کے لیے مناسب وقت بھی فراہم کیا۔

ملک کے پہلے عام انتخابات کا انعقاد 7 دسمبر 1970ء کو ہوا۔ انتخابات کے تمام نتائج فوج اور اس کے حامیوں کی توقع اور پیش گوئیوں کے برعکس تھے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے 162 نشستیں جیت لیں جس کا مطلب یہ تھا کہ 300 ارکان پر مشتمل قومی اسمبلی میں اسے واضح اکثریت حاصل ہو چکی تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے پنجاب میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی اکثریتی نشستیں جیتیں۔ سندھ میں بھی قومی اسمبلی کی اکثریت اس کے ہاتھ میں رہی جبکہ صوبائی اسمبلی میں تین نشستوں کی کمی سے اکثریت نہ مل پائی۔ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور اس کی چھوٹی اتحادی جماعت جے یو آئی نے قومی اور صوبائی اسمبلی کی بیشتر نشستیں جیت لیں۔ یہاں پیپلز پارٹی خاطر خواہ کارکردگی نہ دکھا سکی۔

اسی طرح شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام اکثریتی پارٹی کے طور پر سامنے آئیں۔

غیر متوقع نتائج نے فوجی جنتا کو مایوس کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ حکومت صدمے کی کیفیت سے دوچار تھی۔ شیخ مجیب الرحمان جو کل تک اگرتلہ سازش کیس میں نامزد تھا اب اس کی پارٹی عوامی لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی تھی اور ایک بڑی پارٹی کی حیثیت سے جمہوری طور پر حکومت بنانے کا قانونی جواز رکھتی تھی۔لیکن اس نے مغربی پاکستان سے کوئی نشست نہیں جیتی تو قدرتی طور پر نیشنل عوامی پارٹی اور دوسری قوم پرست جماعتوں سے الحاق کرنے کی پوزیشن میں تھی۔لیکن یہ جماعتیں بھی فوج اور پنجاب کے حکومتی عہدیداروں کی نگاہوں میں کھٹکتی تھیں، چنانچہ یہ صورتحال کچھ عجیب کشمکش کی آئینہ دار تھی اور اگر کوئی ایسا اتحاد عمل میں آ بھی جاتا تو اسے خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا۔ بلاشبہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی پنجاب مرکزی حکومت میں ایک کلیدی کردار ادا کرتا چلا آیا تھا۔ابتدائی عرصے میں اردو بولنے والے مہاجر طبقے اور دوسرے صوبوں کے ساتھ امتیازی رویے اس بات کے گواہ تھے۔اب یہ لوگ دوبارہ فوج اور ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر ایسی سازشوں کا جال بن رہے تھے تاکہ اکثریتی پارٹی کو اقتدار منتقل کرنے کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں۔

جنوری 1971ء کے اختتام پر عوامی لیگ نے اپنے چھ نکاتی ایجنڈے کی بنیاد پر آئینی مسودے کی تیاری کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی دلایا کہ پاکستان کے دونوں حصوں کو علیحدہ کرنے کے لیے کوئی دراڑ نہیں ڈالی جائے گی۔چنانچہ مغربی پاکستان کی زیادہ تر چھوٹی جماعتوں نے آئین کی تیاری پر عوامی لیگ کو اپنی بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ادھر فروری میں یحیٰی خان نے اعلان کر دیا کہ نئی اسمبلی کا اجلاس مارچ میں ڈھاکا میں ہوگا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی چھوٹی پارٹیوں نے ایک ایک کر کے اجلاس میں شرکت

کی یقین دہانی کرا دی لیکن بھٹو کے ذہن میں کوئی اور ہی کھچڑی پک رہی تھی اور وہ ایسی رکاوٹوں کے بارے میں سوچ رہے تھے جن کے ذریعے قومی اسمبلی کے اجلاس کا انعقاد روکا جا سکے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ مضحکہ خیز اعلان کیا کہ حکومت میں برابری کی بنیاد پر حصہ شامل کیا جائے۔ یہ تجویز بالکل ہی غیر جمہوری اور غیر آئینی تھی۔ جب شیخ مجیب الرحمان نے اس احمقانہ تجویز کو قطعی طور پر رد کر دیا تو بھٹو نے ''ادھر تم اور ادھر ہم'' کا نعرہ لگایا جس کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو تم سنبھالو اور مغربی پاکستان میں ہم اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں۔ یہ الفاظ کچھ ایسے منحوس تھے کہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات اس کے گرد گھومتے گئے۔

فروری 1971ء میں پنجاب کے سامعین کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے برملا کہا کہ مغربی پاکستان کے کسی رکن اسمبلی نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکا جانے کی کوشش کی تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور ایسے ارکان کا مغربی پاکستان میں دوبارہ داخلہ ممنوع ہوگا۔ بھٹو نے مطالبہ کیا کہ اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے یا دستور سازی کے لیے 120 روز کی مدت مقرر نہ کی جائے۔

مارچ 1971ء میں ریڈیو پاکستان سے صدر یحییٰ خان کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایڈمرل احسن کو مشرقی پاکستان کی گورنری سے الگ کر کے میجر جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کو گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ اسی دوران مشرقی پاکستان کے کئی مقامات پر سول نافرمانی کے مظاہرے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ ڈھاکا سمیت کئی شہروں میں مظاہرین پر گولی بھی چلائی گئی جبکہ شیخ مجیب الرحمان نے اسمبلی اجلاس ملتوی کیے جانے کے خلاف ہڑتالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یحییٰ خان نے اسمبلی اجلاس ملتوی کر کے سیاسی جماعتوں کی گول میز کانفرنس بلائی تھی مگر شیخ مجیب نے اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے

ڈھاکا کے ریس کورس گراؤنڈ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ عام قیاس یہی تھا کہ اس جلسے میں شیخ مجیب مشرقی پاکستان کی آزادی کا اعلان کرے گا۔ جلسے سے ایک دن پہلے یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ اس نے 25 مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ امکان بعید از قیاس نہیں کہ بنگالیوں سے سمجھوتے کی طرف مائل عناصر کا وزن اسلام آباد میں محسوس کرلیا گیا تھا۔

25 مارچ کے مجوزہ اجلاس میں شرکت کے لیے شیخ مجیب نے چار شرائط پیش کیں جن کے نتیجے میں دستور کے مصدق اور ثالث کے طور پر یحییٰ خان کی پوزیشن چیلنج ہوگئی۔ اس کی یہ شرط کہ ''عوام کے منتخب نمائندوں کو فی الفور اقتدار منتقل کردیا جائے'' باضابطہ مطالبے کی حامل نہ تھی اور اس پر گفتگو کے لیے خاصی گنجائش موجود تھی۔ اس میں یہ کنایہ بھی پوشیدہ تھا کہ صدر لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت اسمبلی کی طلبی، دستور کی تصدیق اور اسمبلی پر 120 یوم کی پابندی کے حقوق سے دستبردار ہو جائے۔

9 مارچ کو اعلان کیا گیا کہ اسمبلی اجلاس کی تیاری کے سلسلے میں یحییٰ خان جلد مشرقی پاکستان کا دورہ کرے گا۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے ڈھاکا میں فوجی کمک کا سلسلہ رواں رہا۔ بنگالیوں، بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان فسادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مظاہرین پر گولیاں بھی چلتی رہیں۔ تناؤ کے اس ماحول میں مذاکرات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ خان کی جانب سے ان مذاکرات میں نیک نیتی سے حصہ لیا گیا ہو لیکن یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ یحییٰ خان بذات خود یہ آس لگائے بیٹھا ہو کہ مجیب الرحمان سے قابل اطمینان سمجھوتہ ہو جائے گا۔ دوسری جانب یہ حال تھا کہ شیخ مجیب چھ نکات سے کم کسی سمجھوتے پر تیار ہی نہیں تھا کیونکہ عوامی لیگ کے سخت گیر گروہ کی جانب سے اس پر خاصا دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس مرحلے پر یہ واضح ہو گیا کہ یحییٰ خان عوامی لیگ میں پھوٹ ڈال کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا بنگالی علیحدگی پسندوں کے خلاف فوجی

کارروائی کی مکمل تیاری کے لیے وقت حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ان پیچیدہ اور حد درجہ مفصل مذاکرات میں آٹھ یوم صرف ہو گئے۔ان مذاکرات کے اہم موضوعات یہ تھے:

ان انتظامات کی نوعیت جن کے تحت قومی اسمبلی کے اجلاس کا انعقاد یا
اس سے قبل انتقال اقتدار ممکن ہو سکے۔
چھ نکات پر عوامی لیگ کی پوزیشن کی مکمل تشریح
اجلاس کے انعقاد کے موقع پر اسمبلی کی ہیئت

اب یہاں اصل سوال یہ تھا کہ اسمبلی کا متحدہ اجلاس ہوگا یا ملک کے دونوں بازوؤں کے ارکان الگ اجلاس برپا کریں گے۔ یہ نازک مسئلہ بھٹو نے یحییٰ خان کے قیام ڈھاکا کے دوران اٹھایا تھا اور اسی نے بالا آخر مذاکرات کے اختتام کے لیے حکومت کو جواز مہیا کیا۔بھٹو نے کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر مجیب کی طرف سے عائد کردہ چوتھی شرط کے مطابق دستور کی تشکیل سے پیشتر انتقال اقتدار ہونا ہو تو اقتدار کی منتقلی دونوں بازوؤں کی اکثریتی پارٹیوں کو بیک وقت عمل میں آنی چاہیے۔عوامی لیگ نے یہ بات تسلیم کر لی کہ اقتدار دونوں بازوؤں کی اکثریتی جماعتوں کو منتقل کر دیا جائے۔ یوں عوامی لیگ کے علیحدگی پسند رجحانات کا ثبوت بھی سامنے آ گیا۔

ابتدائی چند یوم میں اس مسئلے پر مذاکرات ہوتے رہے کہ اسمبلی اجلاس سے قبل اقتدار کیونکر اکثریتی جماعت کے سپرد کیا جائے۔صدر کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی رہی تھی کہ اس طرح قانونی خلا پیدا ہو جائے گا کیونکہ اسطرح انتقال اقتدار سے اسمبلی کی قانونی جانشینی اور مارشل لاء کے ان اختیارات کے خاتمے میں رخنہ پڑ جائے گا جن کے تحت انتخابات ہوئے اور اسمبلی کا قیام عمل میں آیا تھا۔جب یحییٰ خان نے اس بات کا اظہار کیا کہ صدارتی اعلان کے ذریعے فوری انتقال اقتدار کا فارمولا اسے قبول ہے تو عوامی لیگ میں حیرت کے بجائے مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

مارچ کے اختتام پر اتفاق ہو گیا کہ اسمبلی اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے تا کہ صدارتی اعلان کی تیاری میں یحییٰ کو وقت مل سکے۔ عوامی لیگ کے تیار کردہ مسودہ اعلان میں یہ تجویز شامل تھی کہ آغاز ہی سے قومی اسمبلی کے دو الگ اجلاس ہوں۔ ان میں ایک مشرقی پاکستان کی دستوری کمیٹی کا اجلاس ہوگا جبکہ دوسرا مغربی پاکستان کی دستوری کمیٹی منعقد کرے گی۔ یہ تجویز اس پہلی تجویز سے مختلف تھی جس کے تحت قومی اسمبلی کا متحدہ اجلاس ہونے کے بعد اسے دونوں بازوؤں کے ارکان پر مشتمل دو کمیٹیوں میں تقسیم ہو جانا تھا۔ عوامی لیگ کی تجویز سے متعلق بعد میں حکام نے کہا کہ "یہ علیحدگی کے دستوری فارمولے کے مترادف تھی"

علیحدگی کی شروعات

اسی دوران 23 مارچ کا دن آن پہنچا۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر نے بازاروں میں مظاہرے کیے۔ جا بجا بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرائے اور علی الاعلان یوم پاکستان کو "یوم آزادی" قرار دیا۔ رائفلوں کے ساتھ پریڈ کرتی ہوئی عوامی لیگ کی خواتین کے دستوں کی تصاویر اتاری گئیں۔

قومی اسمبلی میں مغربی پاکستان کی اقلیتی پارٹیوں کے قائدین نے عوامی لیگ کے رہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ متحدہ اسمبلی کے تصور کو پھر سے تسلیم کر لیں۔ آخری کوشش کے طور پر انہوں نے شیخ مجیب کو بھٹو کے مقابلے میں اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا مگر مجیب ٹس سے مس نہ ہوا۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق 25 مارچ کو صدر یحییٰ خان مغربی پاکستان روانہ ہو گئے۔ ڈھاکا کے سیاسی حلقوں میں کسی کو یحییٰ کی روانگی کی توقع نہیں تھی۔ اس روانگی کا کوئی پیشگی اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ اسی روز غیر ملکی صحافیوں کو ڈھاکا کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں جمع کر لیا گیا اور باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ دو روز بعد انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ 25 مارچ کو ہی حکومت مخالف اخبارات کے دفاتر پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔

عوامی لیگ کے حامیوں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ بیشتر بنگالی لیڈر پہلے ہی روپوش ہو چکے تھے۔ رات ایک بجے شیخ مجیب کو ڈھاکا کے علاقے دھان منڈی میں ان کے گھر سے گرفتار کرلیا گیا۔

اگلے روز یحییٰ خان نے ریڈیو پر تقریر کی اور اس وقت عوامی لیگ پر مسلح بغاوت کے منصوبے کا کوئی الزام نہ لگایا۔ یہ الزام پہلی مرتبہ مئی 1971ء میں عائد کیا گیا تھا۔ صدر کی نشری تقریر میں مجیب کا یہ جرم ضرور بتایا گیا کہ وہ ''بلاخوف سزا ہر قدم اٹھانے کے لیے قانونی بنیاد تعمیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا''۔

مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے فیصلے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جب ایسٹرن کمانڈ کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل یعقوب علی خان نے مارچ 1971 میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تو صدر جنرل یحییٰ خان نے ان کے متبادل کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو منتخب کیا۔

میدان جنگ میں متعدد کامیابیاں حاصل کرنے کی بنا پر جنرل ٹکا خان فوج میں خاصے مقبول تھے۔ انھوں نے بلوچ قبائلیوں کے خلاف فوجی ایکشن کر کے انھیں ہتھیار ڈالنے یا ملک سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب بھارتی افواج نے پاکستان کے علاقے رن آف کچھ میں دراندازی کرتے ہوئے کچھ علاقے پر قبضہ جما لیا تھا تو یہ جنرل ٹکا خان ہی تھے جنھوں نے سرعت سے کارروائی کی اور جارح بھارتی فوج کو شکست دے کر اسے پاکستان کی سرزمین سے نکال باہر کیا تھا۔

بعدازاں ستمبر 1965 کی جنگ میں انھوں نے سیالکوٹ سیکٹر میں پاک فوج کے دستوں کی کمان سنبھالی تھی۔ بطور کمانڈر انھوں نے دشمن پر جوابی حملہ کرتے ہوئے بہت سا پاکستانی علاقہ جس پر بھارتی فوج قابض تھی، واگذار کروالیا تھا۔ اس فوجی پس منظر کے حامل ٹکا خان کے بارے میں فوج میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ 'وہ کم الفاظ اور زیادہ ایکشن' پر

یقین رکھنے والے فوجی افسر ہیں۔ان کی بطور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ تقرری صدر یحییٰ خان کی طرف سے مشرقی پاکستان کے عوام اور سیاسی قیادت کے لئے صلح یا دوستی کا پیغام نہ تھا۔

یہ تقرری اس بات کا اشارہ تھی کہ صدر نے مشرقی پاکستان کے حوالے سے اپنی پالیسی اور ترجیحات تبدیل کر لی تھیں۔ وہ مشرقی پاکستان میں 'فاختاؤں' کی بجائے 'عقابوں' پر انحصار کی پالیسی اپنا رہے تھے۔ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں چارج سنبھالنے کے بعد بیان دیا کہ ''ہمیں بنگالی نہیں بلکہ بنگال چاہیے'' یہ اعلان بنگالیوں کے خلاف حتمی اعلان جنگ اور انہیں قومی دھارے سے خارج کرنے کے مترادف تھا۔ٹکا خان کو مشرقی پاکستان میں ہر سطح پر پھیلی باغیانہ سوچ کو طاقت کے زور پر کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور انہوں نے یہی کام کیا۔

جی ایچ کیو میں موجود بہت سے دیگر سنیئر افسروں کی طرح جنرل ٹکا خان بھی مشرقی پاکستان کے زمینی حقائق سے یا تو بے خبر تھے یا پھر ان کی معلومات بہت کم تھیں۔ انھوں نے اپنے فوجی کیریئر میں کبھی بھی مشرقی پاکستان میں خدمات سرانجام نہیں دی تھیں۔یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے بارے میں ان کا علم انتہائی سطحی تھا۔ جنرل ٹکا خان جی ایچ کیو میں کوارٹر ماسٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے تھے۔انھوں نے اس حیثیت میں مشرقی پاکستان کے وقتاً فوقتاً جو دورے کیئے تھے اور ان دوروں کے دوران انھیں فوجی اور سویلین افسر جو بریفنگ دیا کرتے تھے، پاکستان کے اس صوبے کے بارے میں ان کی معلومات انہی تک محدود تھیں۔

انھیں اس امر کا ادراک نہیں تھا کہ اس مرتبہ انھیں جو مشن سونپا گیا تھا اس میں کامیابی ناممکن تھی۔ان کے پاس سیاسی مینڈیٹ نہیں تھا جب کہ مسئلے کی نوعیت بنیادی طور پر سیاسی تھی اور اس کا حل بھی فوجی نہیں بلکہ خالصتاً سیاسی تھا۔ یہ خام خیال تھا کہ اس سیاسی مسئلے کو فوجی طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔

بنگالی عوام اس مرتبہ اپنے ناقابل تنسیخ حقوق حاصل کرنے کے لئے پرعزم تھے۔اور موجود صورت حال سے بخوبی واضح ہورہا تھا کہ اگر انھیں اُن کے یہ حقوق نہ دیئے گئے تو وہ آزادی سے کم کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔ برسراقتدار افراد کو متعدد مواقع ایسے ملے جنھیں استعمال کرتے ہوئے دگرگوں سیاسی اور انتظامی صورت حال میں بہتری لائی جاسکتی تھی لیکن فیصلہ ساز قوتوں کا رجحان مذاکرات اور سمجھوتے کی بجائے طاقت کے استعمال کی طرف تھا۔ چنانچہ ٹکا خان نے بنگالیوں کے خلاف بھرپور طاقت استعمال کی جس کے نتائج تاریخ کا حصہ ہیں اور طاقت کے استعمال کی اس سوچ کا اختتام ناکامی پر ہونا طے تھا۔

27 مارچ کو میجر ضیا الرحمان (بعد میں بنگلہ دیش کے صدر بنے) نے چٹاگانگ میں ایک نشریے کے دوران اعلان آزادی پڑھا۔ اس کی قیادت میں فوج کی باغی بنگالی رجمنٹ نے شمال کی جانب پسپائی اختیار کی اور بعض اہم پل اڑا دیے۔ بعدازاں دو ہفتوں تک بھارتی اخبارات میں بنگالیوں کی کامیابیوں کا ڈھول پیٹا جاتا رہا۔ بھارت میں انتخابات ختم ہوئے فقط چند روز ہی گزرے تھے۔ بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے مشرقی پاکستان کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا۔ جب اندرا گاندھی پر مشرقی پاکستان میں مداخلت کے لیے دباؤ بڑھا تو راجیہ سبھا میں تقریر کرتے ہوئے اس کا کہنا تھا کہ ایک غلط لفظ یا ایک غلط قدم کے باعث ہم سب کی خواہشات کے برعکس نتیجہ نکل سکتا ہے۔

مارچ کے اختتام پر بھارتی پارلیمان کے دونوں ایوانوں نے اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی جس کا لہجہ تیکھا تھا۔ اس قرارداد کے مطابق مشرقی بنگال کا ''بھیانک المیہ'' اس لیے پیش آیا کہ حکومت پاکستان نے مشرقی بنگال کے قانونی طور پر منتخب شدہ ارکان کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ مشرقی بنگال کے ساڑھے سات کروڑ لوگوں کی تاریخی بیداری فتح سے ہمکنار ہوگی اور ایوان کی جانب سے یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی جدوجہد اور قربانیاں بہرصورت بھارت کے عوام کی مکمل تائید اور ہمدردی

حاصل کریں گی۔

10 اپریل کو بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا مگر جس عارضی حکومت کے قیام کی بھارت نے سرپرستی کی تھی، اس کو باضابطہ طور پر تسلیم نہ کیا گیا۔ اسی دوران روسی قونصل جنرل نے یحییٰ خان کے نام روسی صدر پڈگورنی کا ایک خط یکطرفہ طور پر شائع کر دیا۔ صدر پڈگورنی نے یحییٰ سے ''فوری اپیل'' کی تھی کہ ''مشرقی پاکستان کی آبادی کے خلاف ظلم وستم اور قتل وغارت گری کے خاتمے کے لیے بعجلت تمام اقدامات کیے جائیں''

اس اپیل کے جواب میں یحییٰ خان نے غیر لچکدار رویہ اختیار کیا۔ پڈگورنی نے انسانی حقوق کے اعلامیے کا حوالہ دیا تھا۔ اس میں یہ رمز پوشیدہ تھی کہ اقوام متحدہ میں روس شاید بھارت کی امداد کرے گا۔ یحییٰ نے پڈگورنی کو جواب میں لکھا کہ ''اگر کوئی طاقت دوسرے ملکوں کے داخلی معاملات میں کسی تیسرے ملک کی مداخلت کی حمایت کرے یا چشم پوشی سے کام لے تو اس طرح اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنڈونگ کانفرنس کے اصولوں کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوگی''

اپریل میں روسی وزیراعظم کوسچن نے یحییٰ خان کو نہایت شائستہ خط لکھا جسے بغرض اشاعت جاری کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ پاکستان اور روس کے درمیان بھرپور تعاون کے خواہش مند ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی دلجوئی کی خاطر معاشی میدان میں متعدد اقدامات بھی کیے۔ یحییٰ خان کے خط کے جواب میں چینی وزیراعظم چو این لائی نے انہیں خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''آپ اور پاکستان کے دیگر قائدین نے وحدت پاکستان کے تحفظ اور اسے شکست وریخت سے بچانے کے لیے خاصا سودمند کام کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حالات جلد معمول پر آ جائیں گے۔ ہمارے خیال میں پاکستان کی وحدت اور مشرقی ومغربی پاکستان کے عوام کا اتحاد پاکستان کی قوت اور خوشحالی کے لیے بنیادی ضمانت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم عرصہ سے نوٹ کر رہے ہیں کہ آپ کے ملک کے

اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے بھارتی حکومت آپ کے مسائل کو الجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔حکومت چین کی رائے میں اس وقت پاکستان کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا خالصتاً اندرونی معاملہ ہے''

بڑی طاقتوں میں سب سے پہلے برطانیہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا جو پاکستانی موقف کے قریب تھا۔ مارچ کے اختتام پر انڈونیشیا اور ایران جبکہ اپریل کے آغاز میں ترکی اور ملائشیا نے پاکستانی موقف کی حمایت میں اظہار رائے کیا۔ جون کے آخر میں بائیس اسلامی ممالک کی کانفرنس منعقدہ جدہ میں پاکستان کی قومی یکجہتی اور جغرافیائی وحدت کے تحفظ کا اظہار کر کے پاکستان کا ساتھ دیا گیا۔امریکا کا اولین ردعمل یہ تھا کہ پاکستان انسانی ہمدردی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بین الاقوامی ادارے کی طرف سے امداد قبول کر لے جس سے پاکستان کی ''اندرونی معاملے'' کی دلیل متاثر نہیں ہوگی۔ چند یوم کے بعد امریکی وزارت خارجہ کے نمائندے نے بیان دیا کہ ''ہمارے لیے اب یہ امر اہم ہے کہ مشرقی پاکستان میں جاری کشمکش کے خاتمے کے لیے پر امن طریقے سے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے'' وائٹ ہاؤس کو سب سے زیادہ تشویش اس امر پر تھی کہ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی سی صورتحال پھیل کر بین الاقوامی بحران میں تبدیل نہ ہو جائے کہ اس سے ایشیا میں طاقت کا توازن متاثر ہوگا۔

اسی اثنا میں اپریل 1971ء کے وسط تک مشرقی پاکستان کے بحران میں اولین اور بظاہر فیصلہ کن تبدیلی ہو چکی تھی۔ 18 اپریل کو پاکستانی فوج نے برہمن باریہ اور اکھنور پر قبضہ کر لیا اور کشتیا میں چراونگہ کے مقام کو بھی قبضے میں لے لیا جسے نام نہاد بنگلہ دیش کا عارضی دارالحکومت قرار دیا جا رہا تھا۔سیاسی سطح پر اکثر حکومتیں اس رائے کا اظہار کر چکی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں پیدا شدہ صورتحال پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ ان حالات میں بھارتی حکومت کو بامر مجبوری دفاعی رویہ اختیار کرنا پڑا۔ اب بھارتی سرزمین پر مقیم مشرقی

پاکستانیوں کے باہمی اختلافات بھی سامنے آنے لگے تھے۔ بھارت میں یہ کہا جارہا تھا کہ بھارت کا قومی مفاد اسی میں ہے کہ پاکستان دولخت ہو جائے۔

اپریل کے آغاز میں بھارت کی سرزمین پر باغیوں کو تربیت دینے کے بعد مسلح کیا گیا اور بنگلہ دیش کی عارضی حکومت کی ہر انداز میں مدد کی گئی تاکہ مشرقی پاکستان میں گوریلا کارروائی ممکن ہو سکے۔ اسی دوران بھارت نے پاکستان کے ساتھ طویل جنگ کی تیاری کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا انجام دونوں ملکوں میں تیسری جنگ کی صورت میں نکلے گا۔ بحران کے پہلے دور میں بھارت کی کوششیں اس امر پر مرکوز رہیں کہ پاکستان کے خلاف عالمی رائے عامہ کو ہموار کیا جائے اور پاکستان پر دوسرے ممالک کا دباؤ ڈالا جائے۔ چنانچہ اس نے پاک بھارت تعلقات کی ہر خرابی کو ڈرامائی رنگ دینے کی بھرپور کوشش کی اور دونوں ممالک کے درمیان طویل چپقلش کو تیز تر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اپریل 1971ء میں مشرقی پاکستان سے بھارت میں نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں ڈرامائی طور پر اضافہ شروع ہو گیا اور اس کی وجہ بھارت کی پالیسی تھی۔ بھارت نے سفارتی محاذ پر اس انخلا سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ مسئلہ عالمی سطح پر بھی تشویش کا باعث بننا شروع ہو گیا۔ ایسے میں پاکستان کے خلاف اور بھارت کے حق میں رائے ہموار ہونے لگی تھی۔ نقل مکانی میں تسلسل کے باعث بھارت کے اس دعوے سے کو بے حد تقویت ملی کہ خواہ مشرقی پاکستان کا بحران پاکستان کا اندرونی معاملہ ہی کیوں نہ ہو اس انخلا سے بھارت کے اندرونی معاملات پر گہرا اثر پڑ رہا ہے۔

اپریل کے آخر میں روس نے پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے پاکستان کو چمڑے کی برآمد دگنی ہو گئی۔ اسی دوران اعلان ہوا کہ روس نے کراچی کے قریب

سٹیل مل لگانے کے منصوبے کی منظوری دے دی ہے حالانکہ اگست 1970ء میں روس نے اس منصوبے کو ناقابل عمل قرار دیتے ہوئے نامنظور کر دیا تھا۔ امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ موجودہ ترقیاتی منصوبوں پر تعاون جاری رکھے گی مگر مستقبل کی ترقیاتی امداد کا دارومدار عالمی ادارے کے ذریعے مشرقی پاکستان میں امدادی کاموں کی نگرانی پر پاکستان کی رضامندی پر ہوگا۔

مئی میں امریکیوں سے صلاح مشورے کے بعد برطانیہ نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ امدادی کاموں کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ ہی مناسب ترین ادارہ ہے۔ ڈھاکا میں امریکی قونصل خانے اور برطانوی ہائی کمشنر کے بعض افسر پاکستان کی پالیسی پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ جون میں ان دونوں کو ان کی حکومتوں نے واپس بلوا لیا۔ مئی میں پاکستان نے مشرقی پاکستان میں اقوام متحدہ کے عملے کی موجودگی میں سیلاب زدگان کے لیے امداد قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ساتھ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ بھارت میں مقیم مشرقی پاکستانیوں کی واپسی کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں اور بین الاقوامی تعلقات میں تناؤ ختم کر کے صورت حال کو معمول پر لایا جائے۔ یہ پالیسی امریکی خواہش کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ صدر نکسن نے یحییٰ خان کو خط لکھا جس میں مشرقی پاکستان میں سیاسی سمجھوتے کی فضا پیدا کرنے کے سلسلے میں اس کی نئی پالیسی کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ نکسن نے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو بھی خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''ہم حکومت پاکستان سے پرامن سیاسی سمجھوتے کی اہمیت پر گفت و شنید کر رہے ہیں تا کہ نا صرف بھارت کی طرف لوگوں کا انخلا ختم ہو بلکہ بھارت کی سرزمین پر موجود مشرقی پاکستانی اپنے گھروں کو لوٹ آئیں۔ ایشیا میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت میں بھارت پر اس علاقے میں امن واستحکام قائم رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔''

وسط مئی تا وسط جون پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھرپور سیاسی کوششیں کی

گئیں جن کا مقصد مشرقی پاکستانیوں کو بھارت سے واپس لانا اور سیاسی سمجھوتہ ترتیب دینا تھا۔ جون میں مشرقی پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ٹکا خان (انہیں صاحبزادہ یعقوب خان کی جگہ یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی) نے مہاجرین کی واپسی کے لیے صدر یحییٰ خان کی اپیل کو دہرایا اور گھروں سے بھاگ کر بھارت میں پناہ گزین ہونے والے تمام لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ ان میں سیاسی قائدین، سیاسی کارکن، مسلح افواج کے ارکان اور دیگر شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ شامل تھے۔

اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے مطالبہ کیا کہ اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جانا چاہیے کیونکہ بیوروکریسی سیاسی بحران پر قابو نہیں پا سکتی۔ فوجی قیادت اور اقلیتی جماعتوں نے اس مطالبے کی مخالفت کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اقتدار دونوں بازوؤں میں بیک وقت منتقل ہونا چاہیے، بصورت دیگر یہ سمجھا جائے گا کہ مغربی پاکستان نے مشرقی بازو کو نوآبادی بنا رکھا ہے۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں دائیں بازو کی جماعتوں (مسلم لیگ، جماعت اسلامی، نظام اسلام پارٹی، پی ڈی اے) نے اعلان کیا کہ وہ یحییٰ خان کے 24 مئی کو اعلان کردہ ضمنی انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ شاید اس طرح مشرقی پاکستان میں بالاآخر دائیں بازو کی جماعتوں کو اکثریت حاصل ہو جاتی۔ جون کے آخر میں حسین شہید سہروردی کی بیٹی بیگم اختر سلیمان ڈھاکا گئیں۔ انہوں نے عوامی لیگ سے متعلق مشرقی پاکستان میں مقیم قومی اسمبلی کے ارکان سے صلاح مشورے کیے۔ بعدازاں یہ کہا گیا کہ عوامی لیگ کے 109 ارکان قومی وصوبائی اسمبلی نے نظریہ پاکستان کی تائید اور جداگانہ انتخابات کی دوبارہ ترویج کی حمایت کے بیان پر دستخط کیے ہیں۔

اس دورے میں انہوں نے ڈھاکا ریڈیو سے ایک نشری تقریر میں عوام کو جنرل ٹکا خان کے عفو عامہ کے اعلان سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کی۔ بعدازاں مغربی پاکستان آمد پر انہوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ابھی اقتدار کی منتقلی کے معاملے پر عملدرآمد کا وقت

نہیں ہے۔ اگلے روز مشرقی پاکستان کے گورنر نورالامین (مشرقی پاکستان میں بحرانی کیفیت پیدا ہونے کے بعد ایڈمرل ایس ایم احسن کی جگہ نورالامین کو گورنر مقرر کیا گیا تھا) نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کے مسئلے کے سیاسی حل کے لیے عوامی لیگ کے ارکان قومی اسمبلی کے بجائے ماہرین کی ایک جماعت دستور تیار کرے گی اور تشکیل دستور کے فوری بعد صدر اسے نافذ کر دے گا۔

اس نئی تجویز کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف فوجی حکومت اور دوسری طرف دائیں بازو کی جماعتوں اور متحدہ پاکستان پر یقین رکھنے والے عوامی لیگ کے ارکان اسمبلی کے درمیان تعاون اور اشتراک کی فضا پیدا ہو جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے انتقال اقتدار کے مطالبے پر نورالامین کا کہنا تھا کہ پہلے حالات معمول پر آ جائیں جس کے بعد ہی اس ضمن میں پیش رفت ممکن ہے۔ نورالامین کا اندازہ تھا کہ آئندہ چار پانچ ماہ میں صورتحال بہتر ہو جائے گی۔ اگرچہ انہوں نے عوامی لیگ کی قیادت پر کڑی تنقید کی تاہم شیخ مجیب کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ جہاں تک خارجہ معاملات کا تعلق ہے، جون کے آخر میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پاکستان نے دوبارہ توازن حاصل کر لیا ہو۔

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں پر مشتمل ایسٹ بنگال رجمنٹ میں وسیع پیمانے پر بغاوت پھیل چکی تھی۔ ممکنہ خطرات کے پیش نظر بنگال سے تعلق رکھنے والے بہت سے افسروں اور جوانوں کو فوج سے برخواست کیا جا چکا تھا جنہوں نے کرنل عثمانی کی قیادت میں ''مکتی باہنی'' نامی جنگجو فورس تشکیل دی جس میں بھارت کا نمایاں ہاتھ تھا۔ کرنل عثمانی بنگلہ دیش کی کابینہ کا رکن بھی تھا جبکہ مکتی باہنی کی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ مشرقی پاکستان کی فوجی اور نیم فوجی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے یونٹ اس فورس کا حصہ تھے۔ علاوہ ازیں بھارت میں مقیم بنگلہ دیشی پناہ گزینوں کی بڑی تعداد کو بھی فوجی تربیت دے کر کرنل عثمانی کی کمان میں دے دیا گیا تھا۔ اس فوج کو ہدایات، اسلحہ اور دیگر سہولتیں بھارت

کی باقاعدہ فوج اور بارڈر سیکیورٹی فورس کی جانب سے مہیا کی جارہی تھیں۔

اگرچہ بھارت میں پناہ لینے والے بنگالیوں اور ان کے سیاسی رہنماؤں میں اختلافات تھے مگر بھارت پر مکمل انحصار انہیں اکٹھا رکھے ہوئے تھا۔ ذاتی مخاصمتوں اور گہرے نظریاتی اختلافات کے باعث اہم امور پر اتفاق رائے عنقا تھا۔ وسط مئی کے بعد یحییٰ خان کی سلسلہ جنبانی اور اس کے ساتھ ہی امریکیوں کے اشاروں کے جواب پر اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ خوف بھی تھا کہ شاید شیخ مجیب کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہو یا شاید وہ بقید حیات ہو اور صدر یحییٰ خان سے تعاون پر آمادہ ہو جائے۔ اس صورت میں بھارتی سرزمین پر بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کا مستقبل تاریک ہو جاتا تھا۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں عوامی لیگ کے قائدین کو اپنے مخالفین کی جانب سے سخت چیلنج درپیش تھا۔ مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی، نیپ کا منظر گروپ اور بائیں بازو کی دیگر جماعتیں یہ سوچ رہی تھیں کہ پاک فوج کے خلاف گوریلا کارروائیاں پھیل کر کسانوں کی بغاوت میں مدغم ہو جائیں گی اور یوں بائیں بازو کی انقلابی جماعتیں عوامی لیگ کے بورژوائی دستور پسندوں کے ہاتھ سے قیادت چھین لیں گی۔ دوسری طرف عوامی لیگ کا دعویٰ تھا کہ عارضی حکومت کی تشکیل کا اختیار صرف اسی کو ہے کیونکہ اسی نے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کا عوامی لیگ سے تعلق نہیں تھا انہیں جلاوطن حکومت میں شامل نہ کیا گیا حتیٰ کہ مکتی باہنی کی تشکیل کے وقت بائیں بازو کے رضاکاروں کو چن چن کر نکال باہر کیا گیا۔

اگرچہ بیگم اختر سلیمان کی اپیل کے جواب میں بعض عوامی لیگی ارکان اسمبلی نے جون میں دست تعاون دراز کیا تھا مگر بھارتی سرزمین پر موجود ارکان کی اکثریت پر پاکستانی حکام کی سلسلہ جنبانی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگرچہ بھارتی حکومت سرکاری سطح پر تاج الدین کی عارضی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی مگر ساتھ ہی بھارتی حکومت دوطرفہ کوششوں

میں بھی مصروف رہے۔ ان میں پناہ گزینوں کی حوصلہ افزائی خاص طور پر اہمیت کی حامل تھی تاکہ یحییٰ خان کی دعوت اور عفو عامہ کے اعلان پر عملدرآمد نہ ہو سکے اور دوسری کوشش یہ تھی کہ غیر عوامی لیگی عناصر کو جلاوطن حکومت کی قیادت تسلیم کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

جون میں تاج الدین احمد نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''پاکستان کے چوکھٹے میں کسی تصفیے کی گنجائش نہیں۔ بنگلہ دیش خودمختار اور آزاد ہے جبکہ ہم ہر قیمت پر اس کے الگ اور آزاد تشخص کو برقرار رکھیں گے''۔ بھارتی شہر کلکتہ میں قائم اس نام نہاد حکومت کے وزیر داخلہ اے ایچ ایم قمر الزماں نے کہا کہ ''بنگلہ دیش آزاد قوم ہے اور شیخ مجیب اس کا صدر ہے۔ اگر بنگلہ دیش کے مسئلے پر گفتگو کا کسی کو استحقاق حاصل ہے تو وہ عوام کے منتخب کردہ نمائندے یعنی شیخ مجیب کی حکومت ہے''۔

اسی دوران بھارتی مسلح افواج نے بنگالیوں کی فوجی مدد کے لیے کام کا آغاز کر دیا مگر سرکاری سطح پر بھارتی حکام عالمی رائے عامہ اور بڑی طاقتوں کی مداخلت پر اپنے انحصار کا اظہار کرتے رہے۔ تاہم دو ماہ یعنی مئی اور جون کے عرصہ میں اقوام متحدہ سے متعلق پاکستانی اور بھارتی رویے میں انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ابتدا میں بھارت بین الاقوامی مداخلت کے لیے کوشاں اور پاکستان اس کے خلاف تھا مگر جون میں دونوں نے الٹی زقند لگائی۔ پاکستان نے اپنی ہمدرد خارجی طاقتوں اور اداروں کی مشرقی پاکستان میں موجودگی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جبکہ بھارت نے اس ''مداخلت'' کے خلاف زیادہ سے زیادہ زور لگایا۔

جولائی کے آغاز میں مشرقی پاکستان کے بحران کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مون سون کے آغاز پر مکتی باہنی نے مسلح مداخلت کا آغاز کر دیا اور بھارت میں مقیم مشرقی پاکستانیوں کی اپنے گھروں کو واپسی کے سلسلے میں یحییٰ خان کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ چھ جولائی کو امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر دہلی پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان کو اسلحے کی ترسیل کا تسلسل افسروں کی غلطی کی وجہ سے قائم ہے۔ بھارت میں اس وقت یہ خیال عام تھا کہ

ہنری کسنجر کے دورے کا مقصد عوامی لیگ اور یحییٰ خان میں تصفیہ کرانا ہے۔

جولائی میں کہا گیا کہ ہنری کسنجر کے پیٹ میں درد ہے اور یہ افواہ اڑی کہ کسنجر دراصل شیخ مجیب کے قانونی مشیر ڈاکٹر کمال حسین (جو شیخ مجیب کے ساتھ قید تھے) سے خفیہ مذاکرات کر کے اسے تصفیے کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہنری کسنجر خفیہ مذاکرات ضرور کر رہے تھے مگر یہ مذاکرات ڈاکٹر کمال حسین کے ساتھ نہیں بلکہ بیجنگ میں چینی وزیراعظم کے ساتھ ہو رہے تھے۔ ان مذاکرات میں پاکستان بھی امریکا اور چین کا معاون تھا اور اسے امید تھی کہ دونوں طاقتیں کسی بحرانی کیفیت میں اس کی مدد کریں گی۔

جولائی کے وسط میں امریکی صدر نکسن نے اعلان کیا کہ وہ ایک سال کے عرصہ میں کسی بھی وقت چین کا دورہ کریں گے۔ اس اعلان سے بھارت میں کھلبلی مچ گئی کہ پاکستان کے دو دوستوں یعنی چین اور امریکا کے درمیان مفاہمت ہوئی تو اس سے مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یحییٰ خان نے پیش قدمی کی اور اعلان کیا کہ وہ مسز اندرا گاندھی سے کسی جگہ اور کسی بھی وقت ملاقات کے لیے تیار ہیں اور یہ کہ وہ مشرقی پاکستان میں مہاجرین کی واپسی کے لیے قائم کردہ مراکز میں اقوام متحدہ کے نمائندوں کو خوش آمدید کہیں گے۔ تاہم اندرا گاندھی نے یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات سے انکار کر دیا۔ انہی دنوں یحییٰ خان نے برطانوی اخبار فنانشل ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اگر مشرقی پاکستان کے کسی علاقے پر قبضہ کر کے اسے باغیوں کا مرکز بنایا گیا تو دنیا کو آگاہ کر دیجیے کہ میں عام جنگ کا اعلان کر دوں گا۔

اقوام متحدہ کی جانب سے 19 جولائی کو اعلان کیا گیا کہ مسٹر جان کیلی کو ڈھاکا میں مہاجرین کا ہائی کمشنر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی روز اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نے دونوں حکومتوں کو یادداشت روانہ کی جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ دونوں ممالک کی سرحدوں کو پر اقوام متحدہ کے رفیوجی ہائی کمشنر کے نمائندے تعینات کیے جائیں۔ اس تجویز

کو پاکستان، امریکا اور برطانیہ کی حکومتوں نے سراہا، مگر دو ہفتے بعد بھارتی وزیر خارجہ نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا۔ بعد ازاں اوتھانٹ نے پال مارک ہنری کو ڈھاکا میں اپنا نمائندہ نامزد کر دیا۔ دونوں حکومتوں کو یادداشت کی ترسیل سے ایک دن بعد اوتھانٹ نے سلامتی کونسل کے دو ارکان کو یادداشت پیش کی جس میں مشرقی پاکستان کی خطرناک صورت حال بیان کرتے ہوئے سفارش کی گئی تھی کہ سرحدوں پر اقوام متحدہ کے رفیوجی ہائی کمشنر کے نمائندے مقرر ہونے چاہئیں۔

بھارت پر ان تجاویز کے مضمرات واضح ہو گئے تھے اور بڑی طاقتوں کا دباؤ پڑنے کی صورت میں مشرقی پاکستان میں گوریلا کارروائیوں کے خاتمے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ بھارت اس نتیجے پر پہنچا کہ پاکستان کو دولخت کرنے کی غرض سے مشرقی پاکستان میں کارروائی کسی بڑی طاقت کی حمایت کے بغیر ناممکن ہو گی۔ اسے یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اگر اسے سلامتی کونسل میں کوئی مدد نہ ملی تو پاکستان اقوام متحدہ کی امداد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ کے دورہ روس کے موقع پر مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا تھا جس میں روس نے بھارت سے اس حد تک اتفاق کیا تھا کہ ''مشرقی پاکستان میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ پناہ گزین گھروں کو لوٹ جائیں۔ انہیں تحفظ کی ضمانت دی جائے اور ان کے لیے پر امن زندگی گزارنے اور کام کرنے کے مواقع پیدا کیے جائیں'' تاہم روس نے سیاسی سمجھوتے کو اہمیت دینے کے بارے میں بھارتی رائے کی تائید سے گریز کیا۔ اسی دوران روسی وزیر اعظم نے پاکستانی سفیر کو یقین دہانی کروائی کہ روس کے نزدیک مشرقی پاکستان کا مسئلہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ مغربی طاقتوں نے پاکستان کو اقتصادی امداد معطل کرنے کی فرداً فرداً تحریک کی مگر روسی امداد جاری رہی یہاں تک کہ روسی حکام کے لیے بھارت کو یہ یقین دلانا مشکل ہو گیا کہ پاکستان کی فوجی امداد ایک سال سے بند ہے۔

جولائی کے وسط میں امریکی صدر نکسن کے اعلان کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ اب یوں محسوس ہونے لگا کہ چین اور امریکا کو اسلام آباد میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ 1969ء میں روسی صدر برزنیف کے پیش کردہ ایشیا کی اجتماعی سلامتی کے منصوبے کی فائل سے گرد جھاڑ دی گئی۔ اگست کے پہلے ہفتے میں روسی وزیر خارجہ گرومیکو بھارت پہنچے اور دوسرے روز اہم ترین منصوبے پر دونوں ملکوں کے دستخط ہو گئے۔ اسے ''معاہدہ مابین بھارت و روس برائے امن، دوستی اور تعاون'' کا نام دیا گیا۔ معاہدے پر دستخط کے بعد دونوں ملکوں کے مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ ''مفصل گفتگو کے بعد طرفین نے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ مسئلے کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی حل کے حصول اور پناہ گزینوں کی واپسی کے لیے پر امن حالات پیدا کرنے کے لیے فوری اقدامات کیے جانے چاہئیں''

بعد ازاں کہا گیا کہ معاہدے کا مسودہ تو ستمبر 1969ء سے تیار تھا۔ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ برزنیف کی دراز میں سے 1971ء میں کس نے یہ مسودہ نکالا اور جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تاہم مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ بھارتی حکام کی دعوت پر مسٹر گرومیکو دہلی پہنچے ہیں۔ اس معاہدے کے لیے خواہ کسی نے بھی پہل کی ہو تاہم یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ معاہدے کی تیاری اور تکمیل میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا۔ دستخط ہونے کے بعد چوبیس گھنٹے میں ماسکو سے بھی اس کی توثیق ہوگئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس روز اس معاہدے پر دستخط ہوئے اسی روز اسلام آباد سے اعلان جاری ہوا کہ ''پاکستان کے خلاف جنگ کرنے'' کے الزام میں فوجی عدالت اور بند کمرے میں شیخ مجیب پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ بہر حال بھارت روس مشترکہ اعلامیے میں یہ بھی کہا گیا کہ ''یہ معاہدہ کسی کے خلاف نہیں ہے'' البتہ اگست کے بعد روس نے ہر ایسی تجویز کی مخالفت کی جس سے اقوام متحدہ کی مداخلت کا پہلو نکلتا ہو اور جس سے یہ ممکن ہو سکتا ہو کہ یحییٰ خان ایسا سیاسی حل ڈھونڈ نکالے جو

بھارت کو نا قابل قبول ہو۔ 11 اگست کو اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے آغا شاہی نے سلامتی کونسل کے صدر کو تجویز پیش کی کہ تناؤ دور کرنے کے لیے کونسل کی ایک جماعت پاکستان اور بھارت کی سرحدوں کا دورہ کرے۔ اس کے فوری بعد یہ انکشاف کیا گیا کہ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ امور کا دورہ روس ملتوی ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 17 اگست کو یحییٰ خان اور پاکستان میں متعین روسی سفیر اے اے روڈیونوف کی ملاقات میں تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

20 اگست کو یہ اطلاع سامنے آئی کہ اقوام متحدہ میں روسی نمائندے نے سیکرٹری جنرل کو مطلع کیا کہ اس کا ملک مشرقی پاکستان کے مسئلے پر بحث کے لیے سلامتی کونسل کے اجلاس کی طلبی کے خلاف ہے۔ 18 اگست کو جب بھارت نے دوسری مرتبہ اس خیال کو رد کیا کہ اقوام متحدہ کے مبصر یا کونسل کی جماعت دونوں ممالک کی سرحدوں کا معائنہ کرے تو اس کا یہ عمل ایسے بین الاقوامی ماحول میں وقوع پذیر ہوا جو اس ماحول سے یکسر مختلف تھا جس میں دو ہفتے بھارت نے اوتھانٹ کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔

اب بھارتی سرپرستی میں لڑنے والی مکتی باہنی کی کارروائیوں میں شدت پیدا ہو گئی تھی اور اس میں فضائیہ اور بحری فوج کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں مغربی سے مشرقی پاکستان سپلائی لے جانے والے بحری جہازوں پر حملے شروع ہو گئے۔ 23 اگست کو چٹاگانگ کی بندرگاہ پر بارودی سرنگیں بچھا کر دو جہاز ڈبو دیے گئے۔ آئندہ چند روز میں ایسی بحری کارروائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ بحری راستے سے مشرقی پاکستان کو سازوسامان اور فوجیوں کی آمد اور مشرقی پاکستان کے اندرونی علاقوں میں خشکی اور دریائی نقل و حمل کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اگست کے آخر میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکتی باہنی کے ''نمائندے'' وارننگ دے رہے تھے کہ اگر اقوام متحدہ کے کارندوں نے ان کی کارروائیوں میں مداخلت کی تو ان کی زندگی و موت کی کوئی پروا نہیں کی

جائے گی اور وہ اس کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

مغربی ممالک کے پاکستانی مشنز کے بنگالی افسر ساتھ چھوڑ رہے تھے اور غیر ممالک میں پاکستان مخالف پروپیگنڈے کے لیے خاص اقدامات کیے گئے تھے۔ 27 اگست کو لندن اور 30 اگست کو دہلی میں دفاتر کھلتے ہی اسلحے اور دولت کے بہاؤ میں اضافہ ہو گیا۔ اگست کے آخری ہفتے میں بھارتی وزارت خارجہ کے پالیسی پلاننگ ڈائریکٹوریٹ کے چیئر مین ڈی پی دھر نے مشرقی پاکستان کے قائدین سے سلسلہ وار ملاقاتیں کیں۔ ایک انٹرویو میں اس کا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی حل سے متعلق بھارت کی عمومی کمٹمنٹ اب مکمل آزادی کی اس قرارداد سے مخصوص ہوگئی ہے جو مشرقی پاکستان کے منتخب ارکان نے منظور کی تھی۔ قومی اسمبلی کے 110 اور صوبائی اسمبلی کے 200 ارکان نے یحییٰ خان کی سیاسی پیش قدمی کے جواب میں جولائی میں ''آخر تک جنگ'' کا حلف اٹھایا تھا۔

30 ستمبر کو مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کا تقرر عمل میں آیا۔ اس سے پہلے ان تمام شہریوں اور فوجیوں کو معاف کرنے کا اعلان ہوا جن پر مشرقی پاکستان میں یکم مارچ سے قانون شکنی کا الزام تھا، مگر ان میں وہ لوگ شامل نہ تھے جن پر فوجداری مقدمات بن چکے تھے۔ 8 ستمبر کو اقوام متحدہ کے 26 ویں اجلاس کے لیے پاکستانی وفد کا اعلان ہوا۔ اس وفد کی قیادت مشرقی پاکستان کے سیاسی لیڈر محمود علی کے سپرد کی گئی۔ 18 ستمبر کو ڈاکٹر اے ایم مالک کی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ اس میں عوامی لیگ کے دو سابق ارکان کے علاوہ پی ڈی پی، جماعت اسلامی اور کونسل مسلم لیگ کے ارکان شامل تھے۔ 20 ستمبر کو الیکشن کمشنر نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان میں 79 خالی نشستوں کے انتخابات 25 نومبر اور 9 دسمبر کے درمیان ہوں گے مگر دو روز بعد اطلاع آئی کہ یہ انتخابات اکیس یوم کے لیے ملتوی ہو گئے ہیں اور اب 12 اور 23 دسمبر کے درمیان ہوں گے۔

اگرچہ روسی مشرقی پاکستان میں اقوام متحدہ کی مداخلت کی منظوری دینے کو تیار

نہیں تھے تاہم انہیں امریکی حکومت کے اس موقف سے اتفاق تھا کہ برصغیر میں جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ ان دنوں یہ خیال تھا کہ صدر نکسن کا مجوزہ دورہ روس دونوں ملکوں کے مابین تعلقات میں بہتری لائے گا۔ برصغیر میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ان بڑی طاقتوں کے تعلقات بھی منفی طور سے متاثر ہو سکتے تھے۔ ابھی اس دورے کی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا تاہم امریکیوں کی خواہش تھی کہ یہ دورہ صدر نکسن کے دورہ بیجنگ کے بعد ہونا چاہیے۔

یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر روسی بھارت کو پاکستان پر کھلم کھلا حملہ کرنے سے روک رہے تھے اور بھارت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ یحییٰ خان اور بنگالی لیڈروں کے درمیان مذاکرات پر کوئی خاص شرط عائد نہ کرے۔ روسیوں کا نکتہ نظر یہ تھا کہ بھارت کو بنگلہ دیش کی آزادی کی شرط ترک کرنی چاہیے۔ ادھر امریکا نے اپنے طور پر پاکستان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنگالیوں سے ارتباط و صلح کی طرف قدم بڑھائے۔

28 اور 29 ستمبر کو اندرا گاندھی کے دورہ ماسکو کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا وہ بھارت کے نزدیک قطعی غیر اطمینان بخش تھا۔ اس اعلامیے پر اختلافات میں ڈرامائی عنصر اس بات نے پیدا کیا کہ انگریزی عبارت میں شروع سے آخر تک مشرقی بنگال تحریر تھا جبکہ روسی عبارت میں مشرقی پاکستان کا ذکر تھا۔ ٹائمز آف انڈیا میں خبروں اور اداراتی نوٹ میں روسی پالیسی پر تنقید کی گئی۔ ممکن ہے روسیوں نے اندرون خانہ بھارتی حکومت کو بتا دیا ہو کہ وہ امریکیوں کو اس طرز عمل سے کچھ اور تاثر دینا چاہتے ہیں۔ تاہم ڈپلومیسی کے میدان میں روس کی کوششوں کی توجیہ کرتے ہوئے بھارتیوں نے اندازہ لگایا جیسے روس بھارت معاہدے میں پوشیدہ حکمت عملی ناکام ہو گئی ہو۔ 8 اکتوبر کو بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے اعلان کیا کہ آزادی ہی بھارت کے نزدیک مسئلے کا واحد حل نہیں ہے اور یہ کہ بھارت تین امکانات میں سے کسی ایک پر اصرار نہیں کرتا۔ ان میں مشرقی پاکستان کی آزادی، پاکستان کے اندر رہتے ہوئے مشرقی پاکستان کی خودمختاری اور پہلے کی طرح مشرقی پاکستان

کا پاکستان میں ادغام شامل تھے۔

ظاہر ہے کہ بھارت نے یہ پوزیشن روس کے سخت دباؤ کے تحت طوعاً وکرہاً اختیار کی تھی۔ 12 اکتوبر کو امریکی صدر نکسن کے روسی دورے کی قطعی توثیق کا اعلان ہوا اور اب شاید روسیوں کے لیے چوکسی میں تخفیف کرنا آسان ہو گیا۔ اسی دن یحییٰ خان نے قوم سے خطاب کیا۔ اس سے دو روز قبل روسی اخبار پراودا نے شیخ مجیب پر مقدمہ چلانے کے فیصلے کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے ''عدالت کے توسط سے انتقامی کارروائی'' قرار دیا اور کہا کہ ''خود پاکستان کی تاریخ کا تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ سیاسی وجوہات کی بنا پر جور و جبر کی کارروائیاں ملکی مسائل کے تعمیری حل پر منتج نہیں ہوتیں''

12 اکتوبر کو یحییٰ خان نے اپنے خطاب میں روسیوں کو بالواسطہ جواب دیا۔ اس میں شیخ مجیب کا تذکرہ شامل نہیں تھا مگر صدر نے مشرقی پاکستان میں ضمنی انتخابات کے انعقاد اور دسمبر میں قومی اسمبلی کے اجلاس سے متعلق اپنی تجاویز کو دہرایا۔ ان حالات میں ظاہر تھا کہ وہ عوامی لیگ کے جلاوطنوں یا شیخ مجیب سے مذاکرات کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یحییٰ خان نے روسی وزیراعظم کوسیجن کی 28 ستمبر کی تقریر کا خیر مقدم کیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ''وزیراعظم کوسیجن نے ان متعدد اقدامات کا ذکر نہیں کیا جو میں نے عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے اٹھائے ہیں''

شیخ مجیب یا عوامی لیگ کی شرکت کے بغیر قومی اسمبلی کو انتقال اقتدار منصوبے سے انحراف نہ کرنے سے متعلق یحییٰ خان کا فیصلہ روس کی مصالحانہ کوششوں کو ٹھکرانے کے مترادف تھا۔ یحییٰ کے فیصلے نے بھارت کو ایسا موقع دیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے روسی دباؤ کے تحت قبول کردہ پوزیشن یکدم تبدیل کر لی۔ 14 اکتوبر کو مسز گاندھی نے بتایا کہ سورن سنگھ سے منسوب اعلان کہ بھارت ''پاکستان کے فریم ورک'' میں مشرقی پاکستان کے حل کو قبول کرلے گا دراصل غلط تحریر ہو گیا تھا۔

13 اکتوبر کو مشرقی پاکستان کے سابق گورنر عبدالمنعم خان کو قتل کردیا گیا جس کے بعد سیاسی بنیاد پر قتل عام کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی دوران سلطنت ایران کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کے موقع پر 15 اکتوبر کو یحییٰ خان کی روسی صدر پڈ گورنی سے ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر پاکستانی اخبارات میں کہا گیا کہ یحییٰ خان نے پاکستانی افواج کی سرحدوں سے واپسی کی تجویز دہراتے ہوئے مطالبہ کیا کہ بھارت کو مشرقی پاکستان کی سرحد سے اپنی فوجیں ہٹا لینی چاہئیں اور دیگر معاندانہ کارروائیوں کے علاوہ تخریب کاروں کی مشرقی پاکستان میں ترسیل بند کردینی چاہیے۔ پانچ روز کے بعد روسی حکومت نے یحییٰ خان کو ایران میں دیے گئے مشورے کا اعادہ کر کے اسے عام کر دیا۔ 20 اکتوبر کو روسی وزیراعظم کوسچن نے بیان جاری کیا کہ ایران میں ہونے والی ملاقات کے دوران صدر پڈ گورنی نے تاکید کی تھی کہ مشرقی پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے اقدامات کیے جانے چاہئیں جن میں شیخ مجیب الرحمان کی رہائی بھی شامل ہو۔ ستمبر میں بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان کی سرحد پر بھی اگلی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور اب یہ ہوا کہ بھارتی فوج نے مغربی پاکستانی سرحد پر بھی ڈیرے ڈال دیے۔

17 اکتوبر کو یحییٰ خان نے فوجوں کی واپسی کی تجویز کا دوبارہ ذکر کیا جسے دو روز بعد بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے رد کر دیا۔ اسی روز پاکستان میں کہا گیا کہ بھارتی توپ خانے نے میڈیم رینج گنوں سے مشرقی پاکستان کے سرحدی دیہات میں گولہ باری شروع کر دی ہے جبکہ اس سے پیشتر وہ فیلڈ گنوں اور مارٹرز سے شیلنگ کیا کرتے تھے۔

تیزی سے بگڑتے پاک بھارت پس منظر میں 20 اکتوبر کو سفارتی سرگرمیوں کا آخری دور شروع ہوا۔ فوجوں کی واپسی کے سلسلے میں یحییٰ خان کی 12 اکتوبر کی تجویز کی روشنی میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نے یحییٰ خان اور اندرا گاندھی کو ایک سی یادداشت بھیجی جس میں ''برصغیر میں جنگ کے خطرے کے پیش نظر اقوام متحدہ اور اس کے

جملہ ذرائع'' امن کے لیے وقف کرنے کی پیش کش کی گئی۔ انہی دنوں اندرا گاندھی کو مغربی ممالک کے اکیس روزہ دورے پر روانہ ہونا تھا۔ دورے کے آغاز سے دو روز قبل 22 اکتوبر کو روس کے نائب وزیر خارجہ نکولائی فریوبن کی قیادت میں ایک وفد بھارت پہنچا اور کہا گیا کہ یہ وفد سالانہ معمول کے مطابق دوطرفہ گفتگو کے لیے آیا ہے۔ صلاح مشورے کے باوجود روسی وفد اور بھارتی حکام نے اوتھانٹ کی تجویز کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بجائے 27 اکتوبر کو ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جس میں کہا گیا کہ روس بھارت معاہدے کی شق 9 کے تحت دونوں حکومتوں میں مشورے ہوئے۔ مذکورہ شق میں تحریر ہے کہ جب کسی فریق پر حملے کا خطرہ موجود ہو تو آپس میں مشورہ ہونا چاہیے۔ 28 اکتوبر کو ویانا میں اندرا گاندھی نے کہا کہ سرحدوں سے فوج کی واپسی کی نگرانی کے ضمن میں بھارتی سرزمین پر اقوام متحدہ کے مبصرین کی تعیناتی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

8 نومبر کو اعلان ہوا کہ حکومت پاکستان کی رضامندی سے پاکستان کو امریکی اسلحہ کی برآمدگی کے بقیہ لائسنس معطل کیے جارہے ہیں۔ امریکیوں نے بعد میں بتایا کہ اندرا گاندھی نے یہ بات مان لی تھی کہ امریکا مشرقی پاکستان اور یحییٰ خان میں گفت و شنید کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ایک اور کوشش کرے۔ مگر اسی روز پیرس پہنچنے کے بعد اندرا گاندھی نے بیان جاری کیا کہ ''موجودہ حالات میں بنگلہ دیش کی آزادی ناگزیر ہے''

امریکی کوششوں کے باوجود اندرا گاندھی کے طرز فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بھارت واپسی پر 13 نومبر کو اس نے لوک سبھا کو بتایا کہ اب صورت حال نہایت عجلت کی متقاضی ہے، اگر اس مسئلے کے سیاسی حل کا حصول درکار ہے تو شیخ مجیب کو رہا کرنا ہوگا۔

جنگ کا آغاز

بھارت کو کھلی جارحیت سے باز رکھنے کے لیے پاکستان نے دو اقدامات کیے۔

مغرب میں فوج نے جارحانہ پوزیشن اختیار کی جبکہ مشرق میں دفاعی انتظامات کیے گئے۔ ادھر بھارت کے جنگجویانہ طرزعمل میں شدت پیدا ہونے لگی جبکہ پاکستان نے بھارتی حملوں کے خلاف اپنی پوزیشنوں کو مستحکم کرتے ہوئے مشرق میں فوج کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ جونہی نومبر کے دن بیتنے لگے، دونوں فوجوں کے مابین تند و تیز جھڑپوں میں اضافہ ہونے لگا جن میں ٹینک اور طیارے بھی استعمال ہورہے تھے۔ 10 نومبر کو بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے اعلان کیا کہ بھارت سے کشمکش کے دوران پاکستان کی امداد کے لیے چینی مداخلت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ چنانچہ دسمبر میں جب کھلی جنگ چھڑی تو بھارت نے ہمالیہ کے محاذ سے اپنے ڈویژن لاکر مشرقی پاکستان کے حملے میں جھونک دیے تھے۔جن دنوں اندرا گاندھی واشنگٹن کے دورے پر تھی انہی دنوں بھٹو چین کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔اب امریکا اور دیگر مغربی طاقتوں نے ازسرنو کوشش کی کہ عوامی لیگ کے ان معتدل عناصر (جواب بھی شیخ مجیب کو اپنا قائد تصور کرتے تھے) سے مل کر یحییٰ خان کو سیاسی حل نکالنے کی ترغیب دلائی جائے۔

3 دسمبر کو چھڑنے والی عام جنگ کے ایام میں امریکی حکام نے دعویٰ کیا تھا کہ مذکورہ کوششیں کامیابی کے قریب تھیں جب نومبر کے اواخر میں مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بھارت کی اشتعال انگیزی میں اضافے سے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ 25 مارچ کے بعد تمام عرصے میں بھارتی نکتہ نظر یہ رہا کہ شیخ مجیب کی رہائی کے بغیر پاکستانی بحران کے سیاسی حل میں پیش قدمی ناممکنات میں سے ہے۔ 10 اکتوبر کے بعد روس کی شہ ملنے پر بھارت نے اصرار شروع کر دیا کہ یحییٰ خان شیخ مجیب اور اس کے ان منتخب رفقاء کے ساتھ بات چیت کرے جن میں سے بیشتر بھارت میں جلاوطنی اختیار کر کے بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کا تہیہ کر چکے تھے۔

9 اگست کے بعد پاکستانی حکام نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا تھا کہ شیخ مجیب سے

مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امریکا اور اس کے دوستوں کے سامنے یہ مسئلہ رہا کہ ان دو نکتہ ہائے نظر کا تفاوت کیسے دور کیا جائے۔ پہلے دور میں جب امریکا نے یحییٰ خان کو سیاسی حل پر آمادہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا تو مئی اور جون میں عوامی لیگ کے بعض جلاوطن ارکان اور کلکتہ و دہلی میں مقیم امریکی افسروں میں غیر رسمی رابطہ ہوا تھا مگر یحییٰ خان کے 28 جون کے بیان کے بعد یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔

اکتوبر کے آخر میں خبر آئی کہ امریکی حکام نے قیام امن کی کوششوں کو تیز کر کے بنگلہ دیشی حکومت کے قائدین سے غیر رسمی رابطہ پیدا کر لیا تھا۔ گو کلکتہ میں قائم بنگلہ دیش کی نام نہاد حکومت کے وزیر خارجہ اے ایچ قمر الزماں نے اس کی تردید کی مگر یہ حقیقت ہے کہ نومبر میں اندرا گاندھی کو باخبر رکھ کر امریکیوں نے پاکستانی حکام اور شیخ مجیب کے منظور کردہ عوامی لیگ کے ارکان میں مذاکرات کی کوشش کی تھی۔

امریکی منصوبہ کچھ یوں تھا کہ وہ صدر یحییٰ کی اجازت سے شیخ مجیب کے وکیل اے کے بروہی سے مل کر انہیں ترغیب دلائیں کہ وہ ایسا چینل (وسیلہ) بننے پر آمادہ ہو جائیں جس کے ذریعے شیخ مجیب عوامی لیگ کے ان ارکان کی ''خصوصی نامزدگی'' کریں جو یحییٰ خان سے مذاکرات میں حصہ لیں گے۔ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ:

(الف) عوامی لیگی جلاوطنوں اور شیخ مجیب میں امریکیوں اور مسٹر بروہی کے ذریعے رابطہ پیدا کرنے کے لیے یحییٰ خان کی منظوری حاصل کی جائے۔

(ب) اس طرح رابطہ پیدا کرنے کے لیے شیخ مجیب اور مسٹر بروہی کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جائے۔

(ج) بھارت میں مقیم عوامی لیگیوں کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ مسٹر بروہی کو بطور ترجمان قبول کر لیں۔

(د) شیخ مجیب کی خصوصی نامزدگی کی بنیاد پر انہیں پاکستانیوں کے ساتھ مذاکرات شروع

کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

(ر) عوامی لیگ کے نامزد شدہ ارکان سے گفتگو کے لیے پاکستانی حکام کو راضی کرنے کی کوششیں کی جائیں۔

یہ بات تاحال غیر واضح ہے کہ اس ملاقات میں امریکیوں کو کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ بھارت میں متعین امریکی سفیر مسٹر کیٹنگ کو جو رپورٹ ملی اس کے مطابق یحییٰ خان مسٹر بروہی اور پاکستان میں متعین امریکی سفیر جوزف فارلینڈ کی ملاقات پر تو رضامند ہو گیا تھا مگر اس نے یہ شرط بھی عائد کی کہ اس ملاقات میں فارلینڈ شیخ مجیب کے خلاف مقدمے اور اس کے طریق کار کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ مگر چار روز کے بعد یحییٰ خان نے فارلینڈ کو مطلع کیا کہ مسٹر بروہی کو اس ملاقات میں کوئی دلچسپی نہیں۔

20 نومبر کے بعد جنگ کی طرف تیزی سے قدم بڑھائے گئے اور 21 نومبر کو جیسور کے بالمقابل بورا سیکٹر اور 27 نومبر کو ہلی کے محاذ پر تند و تیز لڑائی شروع ہو گئی۔ بورا کے محاذ پر بھارتی ٹینک پاکستانی علاقے میں گھس آئے۔ بھارتی فضائیہ نے بھی لڑائی میں حصہ لیا اور اس کا یہ جواز گھڑا گیا کہ پاکستانی فوج مکتی باہنی کا تعاقب کرتے ہوئے بھارتی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

24 نومبر کو اندرا گاندھی نے اس واقعے پر پارلیمنٹ میں بیان دیا اور اسی شام بھارتی ترجمان نے کہا کہ بھارتی فوج کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ ''پاکستانی حملے'' کی صورت میں وہ آئندہ پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ بھارتی بیان کے مطابق اس موقع پر بھارتی فوج پاکستانی علاقے میں آٹھ میل تک اندر گھس گئی تھی۔ یادداشتوں اور احتجاجات کے ایک سلسلے میں پاکستان نے دعویٰ کیا کہ یہ صورت حال مشرقی پاکستان پر بڑے بھارتی حملے کی غماز ہے۔ بھارت اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ سفارتی محاذ پر روس ہی بھارتی پوزیشن کا محور تھا۔ 12 اکتوبر کو جب یحییٰ نے اپنے نشریے میں شیخ مجیب کی

غیر مشروط رہائی سے بالواسطہ انکار کیا تو روس نے بھارت کو کھلی چھٹی دے دی اور اگلے دور کے لیے بھارت اور روس کی متفقہ حکمت عملی کے منصوبوں کی توثیق شاید مسٹر فریوبن (روسی نائب وزیر خارجہ) کے دورہ دہلی کے دوران اکتوبر کے آخر میں ہوئی تھی۔ دونوں ممالک کی سرکاری پوزیشن یہ تھی کہ انہیں شیخ مجیب، عوامی لیگ اور صدر یحییٰ خان کے درمیان سمجھوتہ قابل قبول ہوگا۔

بھارتیوں نے متعدد بار کہا تھا کہ اس سمجھوتے کا نتیجہ بنگلہ دیش کی آزادی پر ہوسکتا ہے۔ روس نے یہ بات اپنے ذمے لے لی کہ عالمی نگرانی میں فوجوں کی واپسی، برصغیر میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے دورے اور پاکستانی سرحدوں پر اقوام متحدہ کے مبصروں کی تعیناتی سے متعلق پاکستانی تجاویز کی مخالفت کر کے اقوام متحدہ کو مداخلت کا کوئی بھی موقع نہیں دیا جائے گا۔

برصغیر میں کشمکش کو وسیع ہونے سے روکنے کے لیے روس نے نومبر میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان طے شدہ اقوام متحدہ کے کردار کو عمل پذیر ہونے سے روکنے کے لیے روسی اثر و رسوخ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ بحران کے آخری مرحلے سے قبل روس نے بھارت کی حمایت میں تسلسل سے یہ موقف اختیار کیا کہ مشرقی پاکستان کے بحران میں بین الاقوامی کشمکش کے امکانات موجود نہیں اور بدیں وجہ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو روس نے سلامتی کونسل میں بھارت کے تحفظ کی خاطر اپنی ویٹو کی چھتری تان دی۔ 29 نومبر کو یحییٰ خان نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ کو تجویز پیش کی کہ سرحدی خلاف ورزیوں کی رپورٹ کے لیے اقوام متحدہ کے مبصر تعینات کیے جائیں۔ پہلے وہ دونوں ملکوں کی سرحد پر مبصروں کے تقرر کا مطالبہ کرتا رہا تھا۔ اب اس نے یہ کہا کہ مبصروں کو مشرقی پاکستان کی سرحد پر تعینات کیا جانا چاہیے۔ بھارت کو

روسی امداد کے بل پر کامل یقین تھا کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکے گی کیونکہ کسی بھی فیصلے پر عملدرآمد سے قبل سلامتی کونسل کی منظوری لازمی تھی۔ بھرپور جنگ سے قبل جب بحران آخری مرحلے کی جانب بڑھا تو مغربی طاقتوں کی پالیسی میں اختلاف رائے پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ گزشتہ ماہ ان طاقتوں نے عوامی لیگ اور اسلام آباد میں گفتگو کے سلسلے میں امریکی کوششوں کی حمایت کی تھی۔

اب فرانس اور برطانیہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نئے انتخابات سے قبل مشرقی پاکستان کو اقوام متحدہ کے کنٹرول میں لے لیا جائے۔ 24 نومبر کو امریکا نے بھی چین کی طرح فوجوں کی واپسی کے لیے پاکستانی تجویز کی حمایت شروع کر دی۔ ایک ہفتے بعد یکم دسمبر کو امریکا نے یہ اعلان کیا کہ بھارت کو اسلحے کی برآمد بند کر دی گئی ہے اور موجودہ لائسنس منسوخ ہو چکے ہیں۔ یہ پاکستان کے اس الزام کی تائید تھی کہ مشرقی پاکستان کی سرحد پر نازک صورت حال کی ذمہ داری بھارت کی ہے۔

یکم دسمبر تک شطرنج کی بساط پر تمام مہرے جمع کر دیے گئے تھے۔ بس اب بازی شروع ہونے کو تھی۔ 3 دسمبر 1971ء کی شب جب بھارت اور پاکستان میں عام جنگ چھڑی تو فریقین کی فوجی طاقت میں بہت زیادہ تفاوت تھا۔ چین سے 1962ء کی سرحدی جنگ کے بعد بھارت کی فوج میں بلحاظ تعداد، تربیت اور ساز و سامان میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ روس اور مغربی طاقتوں کی مدد سے اس کی اسلحہ ساز صنعت نے بے حد ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ جب 1965ء کے بعد بھارت اور پاکستان کی فوجی امداد پر پابندی لگی تو بھارت زیاہ متاثر نہ ہوا۔ اس نے وسیع پیمانے پر روسی اسلحہ حاصل کیا اور 1965ء کے بعد بھی اس کی ترسیل جاری رہی۔ دوسری طرف چین کی خاصی امداد کے باوجود پاکستان پر مغربی بالخصوص امریکی اسلحے کی بندش کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں دہشت پسندوں بالخصوص مکتی باہنی نے مشکلات پیدا کی تھیں۔ مغربی پاکستان

میں متعین بنگالیوں نے 1965ء کی طرح جنگ میں بھرپور حصہ نہ لیا۔ یہاں کی فضائیہ اس سے زیادہ بری طرح متاثر ہوئی۔ 1965ء میں ایوب خان نے برطانوی طرز کی پیروی میں جائنٹ چیف آف سٹاف سسٹم کے ذریعے بری، بحری اور ہوائی فوج میں باہمی اشتراک عمل پیدا کیا تھا مگر 1971ء میں صورت حال مختلف تھی۔ سیاسی تقاضوں کے تحت یحییٰ خان کو فوج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ اپنے پاس رکھنا پڑا کہ اسی بنا پر وہ صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا تھا۔

یحییٰ خان صدر ہونے کے ناطے افواج پاکستان کا سپریم کمانڈر بھی بن گیا تھا۔ اسی طرح فوجی کمان کا جو نظام ابھرا اس میں بہت زیادہ مرکزیت تھی جبکہ بری فوج کو غالب حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مغرب میں آپریشنل کنٹرول کی تفصیلات طے کرنے اور جنگ سے متعلق ہدایات جاری کرنے کا کام جی ایچ کیو راولپنڈی میں ہوتا تھا جہاں صدر یحییٰ خان کو تمام تر اختیارات حاصل تھے۔ یحییٰ خان کا پرنسپل سٹاف افسر جنرل پیرزادہ، بری فوج کے چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید اور چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان فوجی امور میں یحییٰ خان کی مدد کرتے تھے۔ ایئر مارشل رحیم خان کی فضائیہ کا ہیڈ کوارٹر ان لوگوں سے تین سو میل دور پشاور میں تھا جبکہ بحریہ کا ہیڈ کوارٹر تو مزید دور کراچی میں تھا۔ مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی کی مشرقی کمان کو رسمی آزادی حاصل تھی۔ جنرل نیازی کو واضح طور پر معلوم نہیں تھا کہ ان کے اختیارات کی حدود کہاں تک ہیں۔

جس حربی ماحول میں جنگ ہوئی اس میں پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں بدترین حالات کا سامنا تھا۔ بھارتی فوج کی تنظیم کئی برس سے اس مفروضے پر ہوئی تھی کہ دو محاذ اس کے سپرد ہوں گے جن میں پہلا محاذ ہمالیہ میں چین کے خلاف جبکہ دوسرا مغرب میں پاکستان کے خلاف تھا۔ دوسری جانب پاکستانی فوج کی تنظیم اس مفروضے پر کی گئی تھی کہ اسے مغربی سرحد پر بھارت کے خلاف محاذ سنبھالنا ہوگا۔ مگر اس جنگ میں یہ مفروضے غلط

ثابت ہو گئے۔ پاکستان کو مجبوراً اپنی فوج کو مشرقی و مغربی پاکستان کے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ تیسرا محاذ (ہمالیہ میں چین اور بھارت کی جنگ) مختلف وجوہ کی بنا پر کھلنے سے بچ گیا۔ ان وجوہ میں بھارت اور روس کی ڈپلومیسی، چین کا ضبط نفس، ہمالیہ کے دروں میں شدید موسمی اثرات (سردی) اور مغربی سرحدوں پر بھارت کی احتیاط شامل ہیں۔

ایک اور محاذ کو جنگی اہمیت دینا قدرے دور از کار سی بات ہوگی۔ اس چوتھے محاذ کے کھلنے کا امکان جنگ کے دوسرے ہفتے میں اس وقت پیدا ہوا جب امریکا نے اپنے طیارہ بردار بحری جہاز انٹرپرائز کو ساتویں بحری بیڑے سے الگ کر کے خلیج بنگال میں بھیجا تھا۔ اگرچہ مشرق میں جنرل نیازی نے مکتی باہنی کے خلاف دفاعی پوزیشن پر اکتفا کیا تھا تاہم ملک کی فوجی ڈپلومیٹک کمزوری اور مجموعی جنگی منظر کے پیش کردہ خطرات کے باوجود اسلام آباد میں پاکستانی حکمرانوں نے فیصلہ کیا کہ بھارت پر دباؤ بڑھانے کے لیے مغربی سرحد سے اس پر حملہ کر دیا جائے۔ اس فیصلے نے بھارت کو نادر موقع فراہم کر دیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے مشرقی پاکستان کے خلاف اپنی پوری قوت جھونک دی۔ دوسری جانب پاکستان کی جانب سے مغربی محاذ کھولے جانے کا سوال دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اگر بھارتی چیلنج قبول نہ کیا جاتا تو بزدلی کا طعنہ سہنا پڑتا اور اس کے ساتھ یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ اگر چیلنج قبول نہ کیا گیا تو بھارت مزید دیدہ دلیری سے مشرقی پاکستان پر حملہ کرے گا۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صلح کی طرف مائل ہونے اور جنگ سے دامن بچانے کے سلسلے میں یحییٰ خان کی آزادی کو اس کے ''مشکل پسند'' ساتھی جرنیلوں کے اثر و رسوخ نے محدود کر رکھا تھا۔

نومبر کے اواخر میں مشہور امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ میں میجر جنرل راؤ فرمان علی کا انٹرویو شائع ہوا جس میں اختلاف رائے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ عام جنگ نہیں ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر صدر جنگ نہ چھیڑے تو کرنل اور میجر لڑائی میں نہیں

کود سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پاکستان کے طے شدہ دفاعی نظریے (یعنی مشرقی بازو کا دفاع مغرب سے کیا جائے گا) کے تحت حملے کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ اس نظریے پر 1965ء کی جنگ میں کامیابی سے عمل ہو چکا تھا۔ اگر مزاحمت کی پالیسی میں ناکامی ہو اور جنگ چھڑ جائے تو یہ فرض کرلیا گیا کہ مغربی سرحد پر پاکستانی قبضے میں بھارتی علاقہ مشرقی پاکستان میں بھارتی پیش قدمی کے عوض تبدیل کرلیا جائے گا۔

چنانچہ اسی حکمت عملی کے تحت یحییٰ خان نے ستمبر اور اکتوبر میں یہ فیصلہ کرلیا کہ مغربی سرحد پر پاکستان کے حملے کی دھمکی دے کر بھارت کو باز رکھا جائے اور مشرق میں پاکستان میں جنگ پھیلنے سے روکنے کے لیے ہمالیہ میں چینی حمایت کے امکان کو روبہ عمل لانے کے لیے سفارتی کوشش کی جائے۔ پاکستانی قیادت یہ قیاس کیے بیٹھی تھی کہ شاید مشرقی پاکستان کا کماحقہ دفاع نہ ہو پائے گا چنانچہ مغرب میں پاکستان کی سرحدوں کی توسیع کر کے یہ نقصان پورا کرلیا جائے گا۔ اس ضمن میں کشمیر کے متنازع علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے کی منصوبہ بندی بھی کی گئی تھی۔ یہ وہ ڈپلومیٹک حربہ بھی ہوسکتا ہے جس پر یحییٰ خان اکتوبر سے عمل پیرا تھا یعنی مغربی محاذ پر جنگ کو پھیلا دیا جائے تاکہ اقوام متحدہ میں پیدا شدہ تعطل کا خاتمہ ہو اور بڑی طاقتیں بھی برصغیر میں بھرپور جنگ کے خطرے کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ بظاہر یہی وہ پالیسی ہے جس کی طرف جنرل راؤ فرمان علی نے اشارہ کیا تھا۔

انہوں نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا تھا کہ ''جب تمام دنیا جان لے کہ یہ سیاسی کھیل ہے تو میری رائے میں وہ جنگ کی اجازت نہیں دے گی'' چنانچہ نومبر میں یہ محسوس کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کے ڈپلومیٹک دفاع کا انحصار مغرب میں فوجی اقدام پر ہے۔ ایسی جنگ (جو علاقہ حاصل کرنے کے لیے لڑی جائے تاکہ یہ مقبوضہ علاقہ بعد کے مذاکرات میں تبادلے کے لیے استعمال ہو) کی منطق کا تقاضا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کرلیا جائے اور اس قبضے کے لیے کسی ایک سیکٹر کو مخصوص نہ کیا جائے۔ ایسی جنگ (جس کا مقصد کوئی علاقہ

مستقل طور پر حاصل کرنا ہو) اس امر کی متقاضی تھی کہ کشمیر کے حصول کے لیے پاکستان ایڑھی چوٹی کا زور لگائے مگر وہ جنگ جس کا مقصد ایک تنازعے کو بین الاقوامی حیثیت دینا ہو یہ بات اپنے دامن میں سمیٹے تھی کہ پاکستان کی جانب سے ضبط اور اکراہ کا تاثر دیا جائے۔

اقوام متحدہ میں بھارت کو روسی ویٹو کی حفاظت حاصل تھی اور بھارت کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو ناقابل مدافعت حالت میں پہنچانے کے لیے تیز اور فیصلہ کن طرز عمل اختیار کیا جائے اور ساتھ ہی مغربی سرحد پر بھی اپنا دفاع مضبوط بنایا جائے۔ مغربی پاکستان پر بڑا حملہ کرنے کے لیے بھی بھارت نے یقیناً ہنگامی منصوبے بنا رکھے ہوں گے اور جنگ کے دوران ان میں تفصیلی غور و فکر بھی ہوا ہوگا مگر ہمارے پاس اس بات کے شواہد موجود نہیں ہیں کہ ان پر عملدر آمد کے لیے بھارتی قیادت کو کبھی بھی سنجیدہ خواہش رہی ہو کیونکہ اس پالیسی میں دو خطرات مضمر تھے۔

پہلا خطرہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان پر حملے کی صورت میں چین بھی مداخلت کر سکتا ہے جبکہ اس اقدام کی صورت میں بھارت کے لیے روسی حمایت کی ڈور اپنی حدود سے بڑھ جانے پر ٹوٹ سکتی تھی۔ ایسی جنگ کے آغاز سے دونوں فریقوں کی دونوں محاذوں پر ہر دو جنگی حکمت ہائے عملی ایک دوسرے کا عکس تھیں۔ مغرب میں پاکستان نے جارحانہ پوزیشن اختیار کی اور بھارت نے دفاعی پوزیشن لی جبکہ مشرق میں پاکستان کی حکمت عملی دفاعی تھی اور بھارت جارحانہ پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھا۔

3 دسمبر 1971ء کو پاکستان اور بھارت میں مشرقی و مغربی محاذوں پر باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی اعتبار سے پاکستان اور بھارتی فوج کی طاقت میں نمایاں فرق تھا۔ پاکستان کی بری، فضائی اور بحری فوجی طاقت بھارت کے مقابلے میں سات گنا کم تھی۔ بنگلہ دیشی عوام مکتی باہنی کے شانہ بشانہ پاک فوج کے خلاف لڑ رہے تھے تاہم ایسے ماحول میں بھی پاک فوج کے جوانوں نے امید کی تمام راہیں مسدود ہو جانے

کے باوجود تمام خطرات سے بے پروا ہو کر داخلی بے وفائی وغداری اور بھارت کی ننگی جارحیت وفوجی کشی کا مشرقی محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی عظیم الشان قربانیوں کے بغیر حوصلہ شکن حالات میں ان کے معرکہ آراء کارنامے اور ان کی شجاعت پر مشتمل رزمیہ داستانیں جنم نہ لیتیں۔ ان غازیوں کے معرکوں اور شہیدوں کے خون سے پاکستان کی فضا ہمیشہ کے لیے عطر بیز ہے۔

اس جنگ میں مکتی باہنی بھارتی فوج اور انٹیلی جنس ایجنسی را کی بھرپور رہنمائی کر رہی تھی۔ را نے 1968 میں سرحد پار دہشت گردی کی فصل بونی شروع کر دی تھی جو مکتی باہنی کی صورت میں پک کر سامنے آئی۔ مکتی باہنی سے قبل 'مکتی فوج' ہوتی تھی جس نے خود سنگرام پریشاد کے بطن سے جنم لیا تھا۔ بھارتی ریاست مغربی بنگال، اروناچل پردیش، بہار، آسام، ناگالینڈ، میزورم اور تری پورہ میں را کے ایجنٹوں اور بھارتی فوجیوں نے مکتی باہنی گوریلوں کے ٹریننگ کیمپس قائم کر رکھے تھے۔ دوران جنگ مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان میں قائم بجلی گھروں، ریلوے، صنعتوں، پلوں اور ایندھن ڈپوؤں کو نشانہ بنایا، بینکوں و گوداموں کو لوٹا، بحری جہازوں کو بارودی سرنگوں سے اڑایا اور غیر بنگالیوں کو قتل کیا۔

جنگ سے قبل مارچ 1971 میں پاکستانی فوج نے ریاستی رٹ قائم کرنے اور مشرقی پاکستانیوں کی جان و مال کے تحفظ کیلئے سرچ لائٹ کے نام سے آپریشن کیا تھا۔ مارچ 1971ء تک مشرقی پاکستان میں تعینات پاکستانی فوجیوں کی کل تعداد 12 ہزار تھی اور وہ بھی صرف چھوٹے ہتھیاروں سے لیس تھے۔

روزنامہ جنگ کے معروف صحافی فرخ سلیم نے اپنی ایک تحقیقی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اپریل 1971 کے آخر تک آپریشن سرچ لائٹ کے ذریعے مکتی باہنی کو واپس بھارت میں دھکیل کر اس کی ''مون سون بغاوت'' کو کچل دیا گیا تھا۔ راہ فرار اختیار کرنے والی مکتی باہنی کی تنظیم نو کے لیے مئی 1971ء میں بھارتی فوج کی مشرقی کمان نے سرکاری طور

پر ''آپریشن جیک پاٹ'' کا آغاز کیا۔ بھارتیوں نے مکتی باہنی کے گوریلوں کو اطالوی توپیں، ڈکوٹا DC-3 طیاروں، اوٹر DHC-3 لڑاکا طیاروں اور آلوئٹ ہیلی کاپٹروں سے لیس کردیا۔ آپریشن جیک پاٹ کے ذریعے بھارت نے ہر ماہ 5 ہزار تربیت یافتہ گوریلے پاکستان میں داخل کرنے شروع کردیے۔ مکتی باہنی کے گوریلے را کے ایجنٹوں اور بھارتی فوجیوں کے ساتھ تریپورہ اور مغربی بنگال میں قائم لانچنگ اڈوں کے ذریعے مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے تھے۔

امریکی سفارت کار آرچیبالڈ، ڈھاکہ میں امریکا کے آخری قونصل جنرل رہے، وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ مکتی باہنی کے سپلائی ڈپوؤں، تربیتی کیمپوں اور ہسپتالوں کے لیے بھارتی سرزمین فراہم کی گئی۔ بھارت مکتی باہنی کی محفوظ پناہ گاہ تھا جہاں اس کے کارندوں کو آرام کرنے، کھانے پینے، طبی امداد اور ہتھیاروں کے حصول کی سہولیات فراہم کی گئیں۔

ناگالینڈ میں بھارتی مسلح افواج نے مکتی باہنی کے لئے جنگل میں فضائی پٹی قائم کی جہاں بھارتی فضائیہ کے تربیت یافتہ پائلٹ اوٹر DHC-3 طیاروں کی پروازیں کرتے۔ بھارت کی مشرقی کمان نے چٹا گانگ، چاند پور اور نارائن گنج میں جہازوں کو ڈبونے کیلئے 400 سے زائد بحری کمانڈوز اور غوطہ خوروں کو تربیت دی۔ ڈیرہ دون میں بھارتی میجر جنرل اوبان نے مکتی باہنی کے بہترین افراد کو منتخب کیا اور انہیں سیاسی اور فوجی تربیت دی۔ مکتی باہنی کے ایک سیکٹر کمانڈر قاضی نور الزمان لکھتے ہیں کہ تربیت حاصل کرنے کے بعد سیاسی کمانڈوز کو خود کو بھارتی حکام کی پیداوار کہلوانے پر شرمندگی محسوس ہوئی، اس لیے انہوں نے خود کو بنگلا دیش لبریشن فورس کا نام دیا۔

مکتی باہنی نے اپنی کارروائیوں میں پاکستان کے وفادار کم و بیش ڈیڑھ لاکھ بہاریوں کو قتل کیا۔ قطب الدین عزیز نے اپنی کتاب ''خون اور آنسو'' میں 55 شہروں میں

بہاریوں اور دیگر غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں 170 چشم دید گواہوں کے بیانات قلم بند کیے ہیں اور ایسے 110 مقامات کا ذکر ہے جہاں معصوم اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام ہوا۔ فار ایسٹرن اکنامک ریویو کی رپورٹ کے مطابق مکتی باہنی کے رہنما عبدالقادر صدیقی نے خود غیر بنگالیوں کو سنگینیں گھونپ گھونپ کر قتل کیا اور اس پورے واقعے کی غیر ملکی فلم ساز عملے نے فلم بندی کی جسے عبدالقادر صدیقی نے یہ سارا منظر دیکھنے کے لیے بلایا تھا۔ 1951 کی مردم شماری کے مطابق مشرقی پاکستان میں بہاریوں کی تعداد 6 لاکھ 71 ہزار تھی اور ذرا تصور کریں کہ مکتی باہنی نے 20 فیصد بہاری آبادی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یاسمین سائیکیا کی کتاب ''خواتین، جنگ اور بنگلہ دیش کی تشکیل'' کے مطابق مکتی باہنی نے ہزاروں بہاری خواتین کی عصمت دری کی اور تشدد کا نشانہ بنایا۔

تین دسمبر 1971 کو جب عام جنگ چھڑی تو اس وقت مشرقی پاکستان میں تعینات پاکستانی فوجیوں کی کل تعداد 34 ہزار تھی جن میں سے 23 ہزار انفنٹری تھے۔ مشرقی پاکستان کو گھیرے میں لیے ہوئے بھارتی فوجیوں کی کل تعداد ڈیڑھ لاکھ سے چار لاکھ تک تھی جب کہ بھارتی تربیت یافتہ مکتی باہنی کے ایک لاکھ گوریلے اس کے علاوہ تھے۔ بھارتی ایئر فورس نے چار ہنٹر سکواڈرن، ایک سخوئی سکواڈرن، تین Gnat سکواڈرنز اور تین مگ 21 سکواڈرنز بھی جنگ میں شامل کیے تھے۔ بھارتی بحریہ نے طیارہ بردار بحری جہاز وکرانت خلیج بنگال میں تعینات کر دیا تھا جو 47 طیاروں، آٹھ بحری جنگی جہازوں، دو آبدوزوں اور تین لینڈنگ شپ ٹینکس پر مشتمل تھا۔

جنگی ریکارڈ کے مطابق بھارت نے 4 انفنٹری ڈویژن، 9 انفنٹری ڈویژن، 20 ماؤنٹین ڈویژن، 6 ماؤنٹین ڈویژن، 8 ماؤنٹین ڈویژن، 57 ماؤنٹین ڈویژن اور 23 ڈویژن کے ساتھ مشرقی پاکستان پر حملہ کیا۔

جن تکلیف دہ اور غیر مناسب حالات میں پاکستان فوج نے مشرقی پاکستان کا

دفاع کیا وہ اصولاً پوری قوم کے لئے باعثِ فخر ہونا چاہیے تھا۔ وہاں لڑنے والے سب پاکستان کے بیٹے تھے اور پاکستان کے۔ لئے ہی انہوں نے جانیں قربان کیں۔ بہتوں کو کفن نصیب ہوئے نہ قبریں اور سب سے زیادہ تکلیف دہ امر قوم کی بے حسی ہے جس نے ان کی قربانیوں کی قدر ہی نہ کی۔ ان کی کوئی یادگار تعمیر ہوئی اور نہ ہی ان کی یاد میں کوئی دن منایا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی میتیں وطن واپس لائی گئیں۔

پاکستان نے یہ جنگ دراصل مغربی محاذ پر ہاری تھی۔ مشرقی پاکستان کی ہائی کمان کو 16 دسمبر کے المیے میں شرکت کے الزام سے مبرا قرار دیے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان میں بیٹھی قیادت پر ہی سانحے کی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

''امریکی بحری بیڑے اور چینیوں کی مدد کی آمد کا انتظار کرتے کرتے مشرقی پاکستان کی قیادت 7 دسمبر کو ہی مایوس ہو چکی تھی۔ مغربی محاذ پر پاک فوج کو کسی قسم کی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ تاریخی حوالوں کے مطابق صدر یحیٰی خان صورت حال کو سنبھالنے کے بجائے ''غم غلط کرنے'' میں مصروف تھے۔ انہوں نے 3 دسمبر سے ہی جنگ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی اور پھر کبھی اپنے دفتر نہ آئے۔ بالعموم ان کا ملٹری سیکرٹری ان کے پاس نقشہ لے جایا کرتا تھا، بعض اوقات وہ اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈال لیتے اور یوں تبصرہ کرتے کہ ''مشرقی پاکستان کے لیے میں دعا کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں'' بیان کیا جاتا ہے کہ ان دنوں وہ مشہور فارسی شاعر حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

(بہتر ہے کہ ان لایعنی کاغذات کو شراب سے بھرے مٹکے میں غرق کر دیا جائے)

دونوں محاذوں کی قیادت کے اس چلن کے باوجود ہر میدان میں فوجی جوانوں اور جونیئر افسروں نے غیر مربوط چھوٹی چھوٹی کارروائیوں میں بے پایاں جرات کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ یہ فوجی کارروائیاں جنگی چالوں اور حربی مقاصد سے عاری تھیں تاہم پاک فوج

کے جوانوں نے مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی حوصلے اور بے جگری سے کام لیتے ہوئے شجاعت کی ایسی داستانیں تخلیق کیں کہ دشمن بھی دنگ رہ گیا۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ پاک فوج کی جونیئر قیادت نے چھ سال سے بھی کم عرصے میں دوسری مرتبہ ہائی کمان کی قومی مقاصد سے بے وفائی کا کفارہ ادا کیا۔

1971ء کی تباہ کن صورتحال میں سب سے بڑا کردار بری فوج کا تھا۔ فوج کی ہائی کمان نے نئے پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ نہیں لیا تھا۔ بھارت روس سمجھوتے کے پیش نظر فوجی تیاریوں اور پاک بھارت مسلح افواج کی اہلیت میں فرق کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی کی حیثیت کے بارے میں بھی تضاد ہے کہ آیا وہ ایک تھیٹر کمانڈر تھا یا محض کور کمانڈر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فضائیہ اور بحریہ براہ راست اپنی کمان کے ماتحت تھیں۔ تمام حالات کے باوجود تین دسمبر 1971ء کے بعد جب مغربی پاکستان بھی حالت جنگ میں تھا تو وہ ہر لحاظ سے آزاد کور کمانڈر بن چکے تھے۔ اس کے بعد ان کی تبدیلی کا امکان نہیں تھا۔ ان کے آخری اقدام یعنی ہتھیار ڈالنے کے عمل کو اسی تناظر میں لینا چاہیئے۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کرنے کا سوال ہے تو یہ کام اسی وقت کر دینا چاہیئے تھا جب 21 نومبر کو بھارتی فوجیں ننگی جارحیت کرتے ہوئے مشرقی پاکستان میں داخل ہوئی تھیں۔ بدقسمتی سے مغربی محاذ کھولنے میں تاخیر اور اس پر مستزاد یہ کہ جوابی کارروائی کے نیم دلانہ اقدامات نے بھی پاکستان کو شدید نقصان سے دوچار کیا۔ ڈھاکا اور دوسرے شہروں میں قلعہ بندیاں کر کے کم از کم 30 دن تک لڑا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں ہر شہر کی کمان اپنے فیصلے خود کرتی۔ جنرل نیازی فوج کو کسی ایسے علاقے میں اکٹھا کر کے بچا سکتے تھے جہاں قدرتی رکاوٹیں پائی جاتی ہوں۔ جنرل نیازی سے متعلق یہ وہم المیہ ہے کہ بھارتی فوج کے بڑے پیمانے پر جمع ہونے کے باوجود اس سے کوئی بڑی جنگ نہیں لڑی جائے گی۔ جنرل نیازی اپنی اس بات کو ملحوظ کے

ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ انہیں مزید آٹھ بٹالینز دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جو پورا نہ ہوا۔ اگر یہ بٹالینز مل جاتیں تو وہ موثر انداز سے دفاع کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ انہیں جو مشن دیا گیا تھا اس کے تحت انہیں چپے چپے کا دفاع کرنا چاہئے تھا۔ جنرل نیازی کی اس بات کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی کمان کو جو مشن دیا گیا تھا اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی اور جی ایچ کیو نے انہیں واضح پیغام دیا تھا کہ علاقے کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور فوج کو صرف دفاعی اہمیت کے علاقوں کے لیے لڑنا چاہیے۔

ہتھیار ڈال دیے گئے

شواہد بتاتے ہیں کہ منصوبہ بندی ہی ناقص تھی جسے ناامیدی پر استوار کیا گیا تھا جبکہ ڈھاکا کے دفاع کا منصوبہ سرے سے بنا ہی نہیں تھا۔ تاریخی دستاویزات کے مطابق جب دشمن نے فرید پور، کھلنا، داؤ کنڈی اور چاند پور سے ڈھاکا کی طرف پیش قدمی شروع کی تو پھر انہوں نے فوج کو پیچھے ہٹا کر ڈھاکا کے دفاع کا سوچنا شروع کر دیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور دریائے جمنا کو عبور کرنے کے لیے کشتیاں مکتی باہنی لے گئی تھی جب اس علاقے میں گاڑیوں کی نقل و حمل بھی ناممکن ہو چکی تھی۔

جنگ شروع ہونے کے چوتھے روز ہی پاکستانی فوج نے جیسور، جھانی ڈاؤن اور برہمن باریا جیسی بڑی قلع بندیاں لڑائی کے بغیر ہی چھوڑ دیں۔ اگلے دن گھیرا پڑ جانے پر کومیلا کی قلعہ بندی بھی الگ تھلگ ہو کر رہ گئی۔ 9 دسمبر کو ایک ڈویژنل کمانڈر نے اپنے ہیڈ کوارٹر سمیت انتہائی اہم علاقہ خالی کر دیا اور اپنی فارمیشن پیچھے لے آیا۔ اسی دن کشتیا اور لکشمن پور سمیت مزید قلعہ بندیاں بھی خالی کر دی گئیں۔ آخری قلعہ بندی میں بیمار اور زخمی فوجیوں کو بھی وہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہلی میں 16 دن تک جوانمردی سے لڑائی لڑی گئی مگر 10 دسمبر کو اسے بھی خالی کر دیا گیا۔ میمن سنگھ سے آنے والے بریگیڈ کو بھارتی چھاتہ برداروں نے گھیرا تو

بریگیڈ کمانڈر سمیت بہت سے فوجیوں کو قیدی بنالیا گیا اور پھر 16 دسمبر کا سانحہ پیش آ گیا۔

اگر جنرل نیازی آخری دم تک لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے تو تاریخ میں ہیرو کہلاتے لیکن حالات بتاتے ہیں کہ وہ دس یوم پہلے ہی حوصلہ کھو چکے تھے۔ سب سے المناک پہلوان کے ہتھیار ڈالنے کے انداز کا تھا جو انہوں نے بھارت اور مکتی باہنی کی مشترکہ کمان کے سامنے ڈالے۔ انہوں نے بھارتی جنرل اروڑا کا ہوائی اڈے پر استقبال کیا اور انہیں گارڈ آف آنر پیش کیا اور پھر ریس کورس گراؤنڈ میں ہتھیار ڈالنے کی عوامی تقریب میں بھی شرکت کی جو پاکستان اور مسلح افواج دونوں کے لیے شرمناک بات تھی۔ یہ دراصل جنرل نیازی کے مورال کی موت تھی۔ اس لحاظ سے اس کی ناکامی کی ذمہ داری مشرقی کمان پر ڈال دی جاتی ہے مگر اس ضمن میں جی ایچ کیو کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ملک کے دونوں بازوؤں میں افواج کے درمیان رابطہ آخری وقت تک قائم تھا۔

مشرقی کمان کے چند اعلیٰ افسروں کے سوا بقیہ فوج نے یہ فیصلہ ڈسپلن کے تحت کیا حالانکہ ان افسروں اور جوانوں کی بڑی تعداد آخری دم تک لڑنا چاہتی تھی۔ ان کی بہادری کو دشمن نے بھی خراج تحسین پیش کیا۔

10 دسمبر کو گورنر مشرقی پاکستان کے مشیر برائے فوجی امور میجر جنرل راؤ فرمان علی نے سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کے نمائندے پال مارک ہنری کے دفتر میں آ کر اس سے کہا کہ وہ اقوام متحدہ کے مواصلاتی پیغام کے ذریعے صدر یحییٰ تک اس کی درخواست پہنچا دے۔ اس درخواست میں ڈھاکا میں مقیم پاکستانی حکام کے مجوزہ اقدامات کی منظوری طلب کی گئی تھی۔ اس میں فی الفور جنگ بندی، مشرقی پاکستان میں متعین پاکستانی فوج کی واپسی کے لیے انتظامات، بھارتی فوج کی واپسی اور مشرقی پاکستان کے منتخب عوامی نمائندوں کو بلا کر پرامن انتقال اقتدار کی شرائط تحریر تھیں۔

جنرل فرمان علی نے انہیں بتایا کہ جنرل نیازی سے مشورہ کر لیا گیا ہے اور یہ کہ

گورنر نے اس ''قطعی مگر منحوس فیصلے'' کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی ہے۔ اس آخری نکتے پر ڈھاکا میں مقیم سیکرٹری جنرل کا نمائندہ اور نیویارک میں سیکرٹریٹ کا عملہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ اگرچہ فرمان علی واضح طور پر صدر یحییٰ کی منظوری طلب کر رہے تھے مگر ان کے تحریر کردہ نوٹ کو ڈھاکا کے پاکستانی حکام کی جانب سے جنگ بندی کی اٹل پیشکش تصور کرتے ہوئے سلامتی کونسل کو مطلع کر دیا گیا۔ مگر 11 دسمبر کو اسلام آباد سے ڈھاکا کا پیغام پہنچایا گیا کہ کوئی جنگ بندی نہیں ہونی چاہیے۔ پاکستان کے سرکاری ترجمان نے اسلام آباد میں بتایا کہ پاکستان نے دوست طاقتوں سے سمجھوتوں کے تحت مدد طلب کر لی ہے۔

ڈھاکا کو بتایا گیا کہ دوستوں کی مدد آنے کو ہے اور ڈھاکا میں اس سے مراد چین کی حمایت اور امریکا کی بحری اور فضائی مداخلت لی گئی۔ یہی امر یقینی ہے کہ جنگ بندی کے لیے جنرل فرمان علی کی تجویز کی نامنظوری اسی وجہ سے ہوئی کہ اسلام آباد کو چین اور امریکا کی مالی امداد کی امید بندھ گئی تھی۔ آئندہ چار روز میں ڈھاکا کی قیادت پر واضح ہو گیا کہ حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں اور مشرقی پاکستان میں جنگ بندی اب تاخیر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ 14 دسمبر کو مشرقی پاکستان کے گورنر اور اس کی کابینہ کے ارکان نے استعفے دے دیے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کے زیر نگرانی غیر جانبدار علاقے یعنی ڈھاکا کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پناہ لے لی۔ بعد ازاں اسی سہ پہر کو جنرل نیازی اور جنرل فرمان علی نے امریکی قونصل جنرل سے ملاقات کی۔ نیازی نے امریکی نمائندے سے مشروط جنگ بندی کی تجویز بھارت ارسال کرنے کو کہا۔ اس تجویز میں مغربی پاکستان واپسی کے لیے فوجوں کی گروپ بندی کی سہولتیں اور نیم فوجی افراد کے علاوہ مارشل لاء انتظامیہ سے تعاون کرنے والوں کی زندگی کی ضمانت مطلوب تھی۔ یہ تجویز 15 دسمبر کی سہ پہر بھارتی فوج کے سربراہ جنرل مانک شا کو روانہ کر دی گئی۔ اس نے جواباً کہا کہ ڈھاکا پر فضائی حملے اس روز شام پانچ بجے تک ملتوی کر دیے جائیں لیکن مشرقی پاکستان میں فوج کو غیر مشروط ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔

بصورت دیگر 16 دسمبر کی صبح حملہ دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔ پیغام رسانی کی مشکلات کے سبب جنرل نیازی نے عارضی صلح میں توسیع چاہی اور پھر 16 دسمبر کو بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

مشرقی پاکستان میں باقاعدہ جنگ 3 دسمبر سے شروع ہوئی مگر بھارت نے اس سے بہت پہلے پاکستانی علاقوں میں حملے شروع کر دیے تھے۔لڑائیوں کا آغاز ہونے کے بعد نہ تو صدر، نہ کمانڈر انچیف اور نہ ہی ان کے نائبین نے مشرقی پاکستان جانے کی تکلیف گوارا کی۔ جب پاکستان کی سلمیت کی جنگ لڑی جارہی تھی اس مرحلے پر بھی فوجی حکام کا رویہ کچھ یوں تھا جیسے مشرقی پاکستان ملک کا حصہ ہی نہ ہو۔

اگست کے آخر سے نومبر تک مشرقی پاکستان کے ہر علاقے میں بھارت نے بٹالین اور بریگیڈ کی سطح کے متعدد حملے کئے۔نومبر کا وسط حملے کے لئے انتہائی سازگار تھا، بارش کا موسم ختم ہو چکا تھا۔مون سون گزرنے کے بعد زمینی فوجی نقل وحرکت کے لئے ہموار ہو چکی تھی۔سب سے بڑھ کر یہ کہ نومبر کے آخر میں حملہ کرنے سے چینی حملے کے ممکنہ خطرے کا بندوبست بھی ہو گیا۔کیونکہ اس وقت تک سلسلہ کوہ برف سے ڈھک چکے تھے۔

میجر جنرل فضل مقیم کے مطابق بھارتی افواج نے 20,21 نومبر کی درمیانی شب جب چاندرات تھی اور صبح عید کا دن تھا مشرقی پاکستان پر ہر طرف سے حملہ کر دیا۔ بھارتی میجر جنرل لچھمن سنگھ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ بھارت نے حملہ کرنے کے لیے 22 نومبر کا دن مقرر کیا تھا۔لیکن عید کی وجہ سے ایک روز پہلے حملہ کر دیا گیا کیونکہ یہ امید تھی کہ پاکستان فوجی عید منا رہے ہوں گے۔ حملے کے فوری بعد مشرقی پاکستان کے چیف آف سٹاف نے جی ایچ کیو میں اس کی اطلاع دی۔

جنرل نیازی نے چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھارتی اندازوں کے عین مطابق عید منانے لاہور گئے ہوئے

تھے۔ اس نازک موقع پر صدر مملکت جنرل یحییٰ خان اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید بھی جی ایچ کیو میں نہیں تھے بلکہ وہ دونوں عید کے روز بظاہر فوجیوں سے ملنے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے جبکہ اخباری رپورٹس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تیتر کا شکار کھیل رہے تھے۔ عموماً عید کے روز کوئی بھی کمانڈر انچیف فوجیوں سے ملنے نہیں جایا کرتا۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بھارتی حملے کی خفیہ اطلاعات کے باوجود فوج کی اعلیٰ کمان بیک وقت جی ایچ کیو سے غائب کیوں تھی؟ میجر جنرل فضل مقیم کے بقول جب صدر یحییٰ اور جنرل عبدالحمید دوپہر کے بعد واپس آئے تو تمام افسر ایئر فیلڈ پر ان کے منتظر تھے۔ جہاں سے انہیں ایم آئی آپریشن روم لایا گیا، وہاں بریفنگ کا اہتمام تھا۔ اس حساس لمحے پر بھی وفادار سی او ایس جنرل حمید نے صدر کو ستانے اور میٹنگ مؤخر کرنے کا مشورہ دیا تاہم مختصر میٹنگ ہوئی۔ بریفنگ کے بعد صدر نے کہا کہ انہیں صورتحال پر غور کرنے کے لئے چند گھنٹے درکار ہیں اور شام ساڑھے چھ بجے ایوان صدر میں کانفرنس ہوگی۔ فضل مقیم کے مطابق ایک عینی شاہد کا کہنا ہے کہ کانفرنس میں یحییٰ خان نے یہ کہا کہ میں مشرقی پاکستان کے لئے دعا کے سوا کیا کرسکتا ہوں؟ تو گویا اس نے خود کو مشرقی پاکستان سے علیحدہ کرلیا تھا۔ تمام فوجی کمانڈروں کی پختہ رائے تھی کہ پاکستان کا دفاع مغرب سے ہوگا، اس طے شدہ نظریے کے مطابق ہماری ریزرو فوج کو فوراً مغربی محاذ پر جوابی حملہ کرنا چاہئے تھا جو نہیں کیا گیا۔ کیا یہ 1947 سے 1971 تک جی ایچ کیو کے پالیسی سازوں اور متحدہ پاکستان کے دفاع کے لئے بھاری بھر کم دفاعی بجٹ صرف کرنے کا مذاق نہیں اڑایا جارہا تھا؟

بھارت نے مربوط طریقے سے تیز حملے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ نیم فوجی دستوں سمیت اسکی حملہ آور فوج کی تعداد پانچ لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنی پانچ لاکھ وہ فوج بھی دستیاب تھی جسے چینی سرحد پر تعینات کیا گیا تھا۔ جنگی تاریخ میں شاید ہی کسی لیفٹیننٹ جنرل نے اتنی بڑی فوج کی کمان کی ہو۔ بھارت دو ہفتوں میں مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا، جنرل

اروڑا نے کہا تھا کہ وہ بارہ دن میں مشرقی پاکستان کو فتح کر لے گا۔ میجر جنرل فضل مقیم کا خیال ہے کہ مغربی پاکستان میں ایک محدود کامیابی بھی مشرقی چھاؤنی کو نتائج کی پروا کئے بغیر جنگ جاری رکھنے کے لئے پرامید بنا سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

نا صرف یہ کہ مغرب سے حملہ نہیں کیا گیا بلکہ معاملے کو اقوام متحدہ میں بھی نہیں لے جایا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں موجود مختصر سی فوج کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا۔ سلامتی کونسل میں معاملہ اس لئے نہیں بھجوایا گیا کہ کوئی سیاسی تصفیہ نہ ہو جائے، مغرب سے حملہ نہ کر کے بھارت کو پورے تیرہ دن دیئے گئے تا کہ جنرل اروڑہ بارہ دنوں میں کامیابی کا خواب پورا کر لے۔ فوج میں نظم وضبط کا فقدان اس المیے کو منطقی انجام کی طرف لے گیا جب قوم کی ناموس داؤ پر لگی ہوئی تھی اس وقت بھی یہ جرنیل اپنی اپنی جھوٹی انا کے خول میں قید رہے۔ جنرل نیازی کا کہنا ہے کہ ڈائریکٹر آف ملٹری آپریشنز بریگیڈیئر ریاض نے جنگ کی پوری مدت میں ایک بار بھی مجھ سے یا میرے سٹاف آفیسرز سے بات نہیں کی۔ جنرل کمال متین تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ جب یہ جنگ لڑی جا رہی تھی ان دنوں چیف آف اسٹاف جنرل حمید اور انکے چیف آف جنرل اسٹاف جنرل گل حسن کی آپس میں بول چال ہی بند تھی اور نہ گل حسن کے تعلقات جی ایچ کیو کے دوسرے پرنسپل اسٹاف افسروں کے ساتھ خوشگوار تھے۔ خود جنرل گل حسن اپنی یاداشتوں کے صفحہ 299 پر رقمطراز ہیں کہ "میں نہیں سمجھتا کہ جی ایچ کیو کبھی اتنا غیر موثر رہا جتنا وہ 1971 میں بھارت کے خلاف جنگ شروع ہونے سے چند مہینوں پہلے تھا۔ فوج کے اعصابی مرکز میں احکام کی غیر موجودگی اور اتفاق واتحاد کے فقدان نے ہم پر بڑے بے رحم تھپیڑے لگائے"۔

ان حالات میں فیصلے بروقت کیسے ہو سکتے تھے۔ جب مغرب سے حملے کا وقت تھا تب کیا نہیں گیا مگر بعد میں 30 نومبر کو فیصلہ کر لیا کہ 3 دسمبر کو حملہ کریں گے اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ اس جنگ میں بالخصوص فضائیہ اپنے سربراہ کے حکم کی تعمیل میں خاموش

رہی۔ بے وقت حملے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت نے ہمیں جارح قرار دے دیا۔ بھارت نے بارہ دنوں میں ہماری ہزاروں مربع میل زمین پر قبضہ کرلیا۔ دوسری طرف مشرقی کمان کو یہ بتایا گیا کہ مغرب میں بھی بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ 12 دسمبر کو ناگفتہ بہ صورتحال میں جنرل گل حسن نے پشتو میں نیازی کو پیغام دیا کہ 13 دسمبر دوپہر امریکہ اور چین کی مدد آرہی ہے۔ اگلے دن فون آیا کہ دوستوں کی مدد 48 گھنٹے کیلئے موخر ہوگئی ہے۔ مشرقی کمان کو سی او ایس نے اشارہ دیا کہ یو این سیکورٹی کونسل اسی سیشن میں سیز فائر کروا رہی ہے۔ جنرل کمال متین کے مطابق اسی دوران پاکستان نے 5 دسمبر کی روسی تجویز منظور نہ کر کے اپنی فوجوں کے مشرقی پاکستان سے باعزت انخلا کا آخری موقع بھی گنوا دیا۔ سوویت تجویز میں ایک سیاسی تصفیے کے لئے کہا گیا تھا جسے چین نے ویٹو کر دیا۔ اس وقت سوویت یونین واحد ملک تھا جو بھارت کو روک سکتا تھا۔ اندرا گاندھی نے بھی 13 دسمبر کو جنرل سیکرٹری اقوام متحدہ کے نام خط میں فوجیں واپس بلانے کا عندیہ دیا تھا جسے صدر یحییٰ نے تسلیم نہیں کیا۔

سفارتی محاذ پر ہم کسی کی بات مان نہیں رہے تھے اور کوئی ہماری بات سن نہیں رہا تھا۔ فوجی حوالے سے دیکھا جائے تو 1971 کی جنگ میں فوج کے بڑے حصے نے شرکت ہی نہ کی۔ حالات اس قدر دگرگوں تھے کہ راجھستان کی سرحد سے جو ڈیزرٹ آپریشن سی او ایس جنرل حمید نے کور کمانڈر سے مل کر شروع کروایا تھا وہ جنرل گل حسن نے اپنی ذمہ داری پر رکوا دیا اور تمام فوج کو بھارتی علاقے سے واپس آنے کا حکم دے دیا۔ چیف آف سٹاف اور چیف آف جنرل سٹاف نے باہمی مشورہ اور بات چیت تک نہ کی۔ ہاکی میچ میں بھی کسی کھلاڑی کی جگہ بدلنے کے لئے مینجر، کوچ اور کپتان سے مشورہ لیتا ہے۔ ہماری سرحدوں کے دفاع کے ذمہ داروں نے وطن کے دفاع کو کھیل جتنی اہمیت بھی کیوں نہ دی؟

اس دوران جنگ بندی کے جو بھی مواقع آئے اعلیٰ کمان نے گنوا دیئے۔ جنرل یحییٰ اور انکا ساتھی ٹولہ حالات کو ایم ایم احمد پلان کے مطابق چلا رہا تھا۔ آخر کار بھٹو کو اعلیٰ وفد

کے ہمراہ نیو یارک بھجوا دیا گیا جو چند گھنٹوں کا سفر تین دن میں کر کے امریکا پہنچے۔ وہ کابل اور تہران سے ہوتے ہوئے فرینکفرٹ گئے۔ راستے میں لندن میں مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری مظفر حسین کی بیوی سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ اب وہ بہت دنوں تک اپنے شوہر سے نہیں مل پائے گی جس کا واضح مطلب ہتھیار ڈالنا اور جنگی قیدی بن جانا تھا۔ وہ وہاں سے نیو یارک گئے۔ روسی قرارداد کا وقت آیا تو انہیں نزلہ ہو گیا۔

بہر حال اگلے روز انہوں نے بھر پور جذباتی تقریر کے بعد پولینڈ کی قرارداد کا مسودہ یہ کہہ کر پھاڑ ڈالا کہ آپ اپنی سلامتی کونسل اپنے پاس رکھیں ہم ہزار سال تک لڑیں گے۔ بھٹو کی اقوام متحدہ میں اداکاری میدان جنگ پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ 14 دسمبر کو بھارتی فضائیہ نے گورنر ہاؤس پر بمباری کی۔ گورنر اور اس کے ساتھی مستعفی ہو کر ریڈ کراس کے زیر سایہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں چلے گئے اسی روز چیف آف آرمی سٹاف کے سیکرٹری کا سگنل مشرقی پاکستان بھیجا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ جنگ روکنے کی کوشش کی جائے۔

جنرل نیازی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ 14 دسمبر کو انہوں نے ایوان صدر فون کیا تو جنرل حمید نے کہا کہ صدر یحییٰ غسل خانے میں ہیں۔ وہ غسل خانے میں نہیں تھے بلکہ کثرت شراب نوشی کے باعث حواس کھو چکے تھے۔ تب ایئر مارشل رحیم سے بھی بات ہوئی تو وہ بھی نشے میں معلوم ہوئے انہوں نے صدر کے حکم کی اطاعت کو کہا۔ بعد ازاں امریکن قونصل جنرل کے ذریعے جنرل مانک شا کا مشروط پیغام آیا جسے جی ایچ کیو نے منظور کر لیا۔

یحییٰ خان کے ان دنوں نامزد وزیر اعظم نور الامین نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ پندرہ دسمبر کو غیر معمولی رنج و غم کی حالت میں صدر سے ملاقات کے لئے گئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یحییٰ خان جنرل حمید کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف مزے لے رہے تھے جنگ کے بارے استفسار پر یحییٰ نے ان سے کہا کہ ہم مجبور ہیں مگر جنگ جاری رہے گی۔ اگلے روز فوج نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیے۔ یہ کیسے کمانڈر اور حکمران تھے جنہیں اپنی فوج

کے صحیح اعداد وشمار تک معلوم نہ تھے۔ حقیقتاً مشرقی محاذ پر فوجیوں کی تعداد صرف 34 ہزار تھی رینجرز، سکاؤٹس ملیشیا اور سول پولیس ملا کر گیارہ ہزار بنتی تھی اس طرح کل 45 ہزار تعداد تھی۔ اگر بحری، فضائی دستوں کے لوگوں اور ان تمام لوگوں کو بھی شامل کرلیا جائے جنہیں وردی اور مفت راشن کا استحقاق تھا تب بھی یہ تعداد 55 ہزار بنتی ہے بقیہ سول لوگ، عورتیں اور بچے تھے مگر حمود الرحمٰن کمیشن سمیت ہم آج تک یہی کہتے ہیں کہ ہمارے چھیانوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیئے، یہ کیسا مذاق کیا جارہا تھا۔

کوئی یہ تسلیم بھی نہیں کرتا کہ ہتھیار پھینکنے کے احکامات کس نے دیے اور کیوں دیے، ہماری تاریخ میں آج تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ ہتھیار ڈالنے کا حکم کس نے دیا، نہ یحییٰ نے تسلیم کیا نہ کوئی اور جنرل ماننے کے لئے تیار ہے۔ ملک میں مارشل لا تھا، ملک کا صدر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور فوجوں کا سپریم کمانڈر تھا، صوبوں میں جنرل حکمران تھے جنہوں نے ساری عمر میدان جنگ میں گزاری تھی مگر جب جنگ شروع ہوئی تو کمانڈر انچیف کا حکم فضائیہ کا سربراہ نہیں مانتا، سی او ایس کا آپریشن سی جی ایس منسوخ کردیتا ہے، تحفظ وطن کے لئے سٹرائیک آپریشن تیرہ روز تک شروع ہی نہیں ہو پاتا، ملک دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، بچے کھچے پاکستان کے بڑے حصے پر بھی بھارت قبضہ کرلیتا ہے اور جنرل صاحبان کو یہ تک معلوم نہیں کہ وہ آرڈر کون دیتا تھا۔ وہ احکامات کی تعمیل بھی کرتے رہے اور ملک ٹوٹنے کا تماشہ بھی دیکھتے رہے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کرنے کی حکمت عملی بنائی اور مغربی پاکستان بچانے کے لئے مشرقی پاکستان کو الگ کردیا۔

سانحہ مشرقی پاکستان کی تہہ در تہہ وجوہات میں سے اہم ترین وجہ پاکستان کے فوجی جرنیلوں کی پیشہ وارانہ فرائض سے غفلت برت کر سیاسی شوق پورا کرنے کی ہوس تھی۔ جب تک پاکستان میں فوج کا سیاسی کردار محدود یا ختم نہیں ہوگا اس وقت تک وفاق پاکستان خطرات کی زد میں رہے گا۔

پاکستان کیوں ٹوٹا؟

سقوط ڈھاکا سے قبل پاکستان اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا مگر اب یہ تیسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر ہماری پوری قوم کو اس نقصان کا کوئی زیادہ احساس نہیں اور نہ ہی اس نقصان کا کوئی افسوس ہے۔ ہمارا رویہ یوں ہے جیسے یہ ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ زندہ قومیں اپنے نقصان کی وجوہات کا جائزہ بھی لیتی ہیں اور آئندہ کے لیے اس کا تدارک بھی کرتی ہیں۔ زیر نظر سطور میں ہم ان عوامل کا جائزہ لیں گے کہ آخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ اگر چہ اس حوالے سے متعدد اہم نکات گزشتہ سطور میں بھی بیان کیے جا چکے ہیں تاہم یہاں ان چند بنیادی باتوں کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے جنہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد رکھی۔

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں نے بھی حصولِ پاکستان کے لئے قربانیاں دی جو پاکستان کے نقشے میں آئے اور ان علاقوں کے لوگوں نے بھی بہت قربانیاں دیں جنہیں معلوم تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ اسی طرح مشرقی بنگال کے لوگوں نے بھی بے پناہ قربانیاں دیں۔

مشرقی بنگال ہمیشہ سے مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے۔ 1881 کی مردم شماری کے مطابق پورے ہندوستان میں چار کروڑ دس لاکھ مسلمان تھے۔ جب کہ ان میں سے ایک کروڑ 78 لاکھ اور 63 ہزار مسلمان صرف بنگال میں تھے۔ 1905 میں جب انگریز نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو اس میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان

پیدا ہوا تو ہندوؤں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ 7 اگست 1905 کو مہاراجہ چندر نندی نے ایک احتجاجی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ نئے صوبہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہندو محدود تعداد میں ہیں۔ اگر یہ صوبہ برقرار رہا تو ہم اپنی ہی سرزمین میں اجنبی بن جائیں گے۔

کانگرس نے تقسیم بنگال کی سخت مخالفت کی تھی، اسی وجہ سے 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس ہوئی جس میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس اجلاس میں برصغیر کے کونے کونے سے سرکردہ مسلمان شخصیات نے شرکت کی جن میں نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ، نواب علی چوہدری بوگرہ، جسٹس شاہ دین آف لاہور، مولانا مظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر بھی شامل تھے۔ گویا برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا آغاز ڈھاکہ سے ہوا۔

23 مارچ 1946 کو لاہور میں مینار پاکستان کے مقام پر جلسہ عام میں قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی فضل حق کا تعلق بھی مشرقی بنگال سے تھا 1946 کے انتخابات پاکستان پر ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے جن میں 96% بنگالیوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ مسلم لیگ کو ان انتخابات میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی وہ بنگال کے مسلمانوں کے صحیح جذبات کا مظہر تھی۔ مسلمانوں نے آسام کی چونتیس نشستوں میں سے اکتیس نشستیں جیت لیں۔ اس وقت سلہٹ آسام کا حصہ تھا اور بنگال کی ایک سو اکیس نشستوں میں سے ایک سو انیس پر مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کر لی تھی۔

بنگال کی اسلام اور پاکستان کے لیے یہ والہانہ محبت کسی جذباتی یا وقتی وابستگی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلم بنگال کے عوام نے انگریز اور ہندوؤں کے ظلم وستم کا بھرپور مقابلہ کیا اور جب منزل متعین ہوگئی اور رہنمائی میسر آ گئی تو پھر وہ دیوانہ وار منزل کی جانب دوڑ پڑے۔ راستے کی مشکلات ان کا راستہ نہ روک سکیں اور پاکستان بن گیا۔ مشرقی

بنگال اور سلہٹ باہم ملا دیئے گئے۔

اب سوچنے کا مقام یہ ہے کہ 23 سال میں وہ کیا وجوہات پیش آئیں کہ یہاں کے بنگالی مسلمان مغربی پاکستانی بھائیوں کے خلاف ہو گئے۔ اور اسلامی رشتہ ختم کر کے بنگالی ازم پر متفق ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ایک عجیب وغریب پہلو ہے۔ عام طور پر ملک اقلیتیں توڑتی ہیں۔ وہ اکثریت کی شکایت کرتی ہیں اور ملک سے الگ ہونے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اکثریت نے اقلیت سے الگ ہونے کی جدوجہد کی، حالانکہ یہ اکثریت برصغیر میں مسلمانوں کے مفادات کے لیے سب سے پہلے آواز بلند کرنے والی اور تحریکِ پاکستان میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والی اکثریت تھی۔ بنگال میں انگریزوں اور ہندوؤں کے جبر کا احساس شدید تھا اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بنگالی مسلمانوں میں سیاسی شعور کی سطح بلند تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن بنگالیوں نے 1947ء میں پاکستان بنایا تھا وہ قیام پاکستان کے محض 24 سال بعد پاکستان سے الگ ہونے پر کیوں مائل ہو گئے؟

پاکستان کے ساتھ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ایک سال بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قائداعظم کی اہمیت یہ تھی کہ وہ پاکستان بنانے والے تھے۔ پورے ملک کے عوام پر ان کا گہرا اخلاقی اور تاریخی اثر تھا اور عوام کی عظیم اکثریت ان سے محبت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم پاکستان کی وحدت و سلامتی کی علامت تھے۔ وہ ہر طرح کی تقسیم سے بلند تھے اور ملک کے تمام طبقات ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ صرف قائداعظم میں یہ جرات تھی کہ وہ ڈھاکا میں کھڑے ہو کر کہیں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔

عام طور پر جماعتیں رہنماؤں کے بعد ان کا نعم البدل بن جاتی ہیں، مگر مسلم لیگ کی حالت خستہ تھی اور قائداعظم کے بعد ان کی جگہ لینے کے لیے نہ کوئی شخصیت موجود تھی نہ

جماعت۔ لیکن قائداعظم کی عدم موجودگی سے بھی بڑا سانحہ یہ ہوا کہ پاکستان جس نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا، 1948ء سے 1971ء تک اسے حقیقت بنانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ چنانچہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان قربت اور یگانگت کا وہ احساس پیدا ہی نہیں ہوسکا جو اسلام پیدا کرتا ہے اور جس نے برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کو نسل، زبان، جغرافیہ اور فرقہ و مسلک سے بلند ہونے پر مائل کیا تھا۔

زبان کا مسئلہ

مشرقی پاکستان میں جب یہ اعلان ہوا کہ ملک کی قومی زبان اردو ہوگی تو بھارت نواز ہندوؤں نے طلبہ میں یہ موقف اچھالا کہ اگر ملک کی قومی زبان اردو ہوگی تو بنگلہ بولنے والے لوگ کبھی ترقی نہیں کرسکیں گے۔ چنانچہ ان میں بالخصوص اس تاثر کو گہرا کیا گیا کہ مرکزی حکومت میں پنجابیوں اور مہاجرین کا غلبہ ہے اور یہ اکثریتی آبادی کے صوبے کو اس کی مادری زبان سے محروم کرنے کی سازش کررہی ہے۔ انہوں نے زبان کے مسئلے پر ذرا برابر نرمی دکھائی تو اردو بولنے والے غیر مقامی لوگ ان کے حقوق غصب کرلیں گے اور تمام کلیدی اسامیوں پر انہی کا قبضہ اور تصرف ہوگا۔

طلبہ کے جذبات اس حد تک برانگیختہ کردیے گئے کہ وہ قائداعظم کی بات سننے کے روادار نہ رہے۔ مارچ 1948 میں قائداعظم ڈھاکہ تشریف لے گئے اور انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کیا کہ صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ 24 مارچ 1948 کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلبہ کے خصوصی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جب قائداعظم نے پھر دھرایا کہ پاکستان کی واحد سرکاری زبان اردو ہوگی تو اس کے جواب میں ہال ''نہیں نہیں'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ طلبہ کے اس گروہ کی قیادت طالب علم رہنما شیخ مجیب الرّحمان کررہا تھا۔ رفتہ رفتہ ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس بنگلہ زبان کی

حمایت میں منعقد ہونے والے اجتماعی مظاہروں کا مرکز بن گیا جس کے نتیجے میں 21 فروری 1952 کو ڈھاکہ پولیس فائرنگ کا واقعہ رونما ہوا۔ اس واقعے میں پولیس فائرنگ سے تین طالب علم مارے گئے۔ شرپسند عناصر کو یہی مطلوب تھا۔ اب نہ صرف اردو کے خلاف بلکہ اردو بولنے والوں کے خلاف بھی جذبات نشوونما پانے لگے۔ آخر کار 1956 کے دستور میں بنگلہ زبان کو اردو کے ساتھ دوسری سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور کیمونسٹوں نے اس کامیاب لسانی تحریک سے جو نتائج اخذ کیے وہ یہ تھے۔

عوام کو لسانی مسائل کے ذریعے آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔

کسی بھی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے تشدد ضروری ہے۔

حکومت مخالف تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے طلبہ موثر ترین گروہ ہیں۔

جن تحریکوں میں طلبہ شامل ہوں انہیں قوت کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا۔ ہندو اور کیمونسٹ جس زبان کے لئے لڑ رہے تھے وہ مسلم بنگلہ نہ تھی، بلکہ یہ وہ زبان تھی جس کی تخلیق کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ہندو براہمنوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ترقی وترویج کے لئے ہنگامی اکادمی قائم ہوئی۔ اس اکادمی سے کتابوں کا ایک سیلاب مشرقی پاکستان کی مارکیٹوں میں در آیا اور اس لٹریچر کے ذریعے مشرقی پاکستان میں انتشار کے بیج بوئے جانے لگے۔

مشرقی پاکستان کی آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا 54 فیصد تھی اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کو اسی اعتبار سے پاکستان کے معاشی اور سماجی کیک سے حصہ فراہم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لوگوں سے کہا گیا کہ تمہیں مساوات یا Parity کے اصول کو تسلیم کرنا ہوگا اور وسائل میں تمہارا حصہ 54 فیصد نہیں صرف 50 فیصد ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے اس اصول کو تسلیم کرنا آسان نہ تھا لیکن حسین شہید سہروردی نے پاکستان کی وحدت کے لیے اس اصول کو تسلیم کرنے کی مہم چلائی اور وہ اپنی مہم میں کامیاب رہے۔

لیکن مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے مساوات کے اصول پر بھی عمل نہ کیا۔ یہاں تک کہ حسین شہید سہروردی کی عزیزہ شائستہ اکرام اللہ نے اپنی کتاب ''پردے سے پارلیمنٹ تک'' میں شکایت کی ہے کہ حسین شہید سہروردی نے مساوات کے اصول کے حق میں مہم چلا کر اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگایا لیکن مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے کبھی اُن کی اس خدمت کا اعتراف کرنا تک پسند نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں معاشی استحصال کی شکایات عام ہو گئیں۔ ان شکایات کو عملی زندگی کے تجربات سے تقویت فراہم ہوتی رہی۔ مثال کے طور پر بنگالی' آبادی کا 54 فیصد تھے لیکن برّی فوج میں ان کی موجودگی صرف آٹھ دس فیصد تھی۔ فضائیہ میں ان کی موجودگی زیادہ تھی مگر یہ بھی پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ اگر مشرقی پاکستان میں 50 تھانے تھے تو صرف پانچ چھ تھانوں کے سربراہ بنگالی تھے۔ باقی تھانوں کے ایس ایچ اوز پنجابی' پٹھان یا مہاجر تھے۔

پاکستان کی نوکر شاہی کا معاملہ بھی یہی تھا۔ بیوروکریسی میں بنگالیوں کی موجودگی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ یہ صورت حال بنگالی 24 سال تک اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے، چنانچہ اُن میں مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے خلاف ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے فوج میں بنگالیوں کی کمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی، مگر اُس وقت تک دیر ہو چکی تھی اور جنرل یحییٰ کے اضافے سے بھی بنگالیوں کا فیصد برّی فوج میں دس سے بڑھ کر پندرہ بیس فیصد ہو جاتا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جیسے پاکستان' اس کی فوج' پولیس اور اس کی بیوروکریسی پنجابیوں' پٹھانوں اور مہاجروں کو ''جہیز'' میں ملی تھی اور اس جہیز میں بنگالیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم کاز کے لیے بنگالی 1906ء سے جدوجہد کر رہے تھے جبکہ پنجاب میں 1946ء تک یونینسٹوں اور صوبہ سرحد پر غفار خان کا قبضہ تھا۔ لیکن ناانصافی سے بھی زیادہ افسوس ناک چیز بنگالیوں کی تذلیل اور تحقیر تھی۔

تعلیمی المیہ

قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں 1290 ہائی سکول تھے اور 47 کالجوں میں 95% فی صد ادارے ہندوؤں کے نجی انتظام میں تھے۔ سرکاری سکولوں میں بھی ہندو اساتذہ تناسب زیادہ تھا۔ یہ اساتذہ بڑی کاوش کے ساتھ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے معصوم ذہنوں میں تشکیک کا زہر گھولتے رہے۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ثقافت کے بارے میں مسلمان طلبہ میں انتشار پیدا کیا اور اس انتشار نے بالاخر انہیں صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ مشرقی پاکستان میں پرائمری اور مڈل سطح کے سکول سرکاری سطح پر بنائے ہی نہیں گئے تھے بلکہ پرائیویٹ سطح پر قائم پرائمری اور مڈل سکولوں کو حکومت سالانہ گرانٹ دیتی تھی۔ تعلیمی بجٹ کا بڑا حصہ ان سکولوں پر خرچ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ان سکولوں کے ہندو انتظام میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ چنانچہ ان سکولوں کی انتظامیہ اپنا سٹاف خود بھرتی کرتی تھی جو زیادہ تر ہندو اساتذہ پر مشتمل ہوتا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد ہندو اساتذہ اور پروفیسروں کی بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں ہی رہی لیکن ان کی اکثریت نے اپنے خاندانوں کو مغربی بنگال میں منتقل کر دیا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ طے شدہ پلان تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 90% فی صد سٹاف ہندو تھا۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری سے طلبہ کو ذہن نشین کرایا کہ

پاکستان کا معاشی طور پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

غیر مقامیوں کا مقصد مشرقی پاکستان کو اپنی نوآبادی بنانا ہے۔

اساتذہ کی جانب سے ان نظریات کی مسلسل تشہیر نے آخر اپنا اثر دکھایا اور بے اطمینانی نے طلبہ کے اذہان پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا جس کا حتمی نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں برآمد ہوا۔

بیوروکریسی کا ناروا رویہ

نفرت کا سب سے پہلا بیج ہمارے ان سرکاری افسروں نے بویا جو قیام پاکستان کے بعد سرکاری حکام کی حیثیت سے مشرقی پاکستان گئے تھے۔ان کی اچھی خاصی تعداد نے وہاں کچھ اچھا رویہ اختیار نہ کیا۔ وہ انگریز کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے انگریزوں کے ان طرز عمل کی نقل اتاری جو وہ غیر قوم پر حکومت کرنے پر اختیار کرتا تھا۔ یہ آفیسر انہی انگریزوں کے شاگرد تھے۔

یہی وہ سبب ہے جس نے چند سال کے اندر مشرقی پاکستان کے عام باشندوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ان کو ایک نو آبادی بنا کر رکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ اردو بولنے والے تھے۔ چاہے وہ مغربی پاکستان سے گئے یا بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے۔مشرقی پاکستان کے عام لوگ اردو کو مغربی پاکستان کی زبان سمجھتے تھے۔اس لئے وہاں کے عوام نے یہ سمجھا کہ اصل پاکستان تو مغربی پاکستان ہے۔ہم اس کی ایک کالونی بنائے گئے ہیں۔ لوگوں کا عام احساس یہ بن گیا کہ یہاں تو گورے انگریزوں کی جگہ کالے انگریزوں کی حکومت ہے جو ان پر اچانک مسلط ہو گئی ہے۔

1955 تک مشرقی پاکستان میں جو نظام کارفرما تھا وہ ہو بہو انگریزی نو آبادی نظام تھا۔ اس میں نہ کوئی اسلامی رنگ تھا نہ کوئی پاکستانی خصوصیت تھی۔ وہی سیکولر نظام تعلیم وہی حاکمیت اور محکومی کا سالہا سال پرانا سلسلہ جاری تھا۔ پولیس کی دہشت اور مجسٹریٹوں کی حکومت تھی، جب سب کچھ وہی تھا تو لوگ کیسے سمجھ لیتے کہ یہ افسر جو ایک ہزار میل دور مغربی پاکستان سے آئے ہیں ان کے اپنے ہم وطن ہیں۔ مرکزی حکومت میں اس پر کوئی سوچ بچار ہوئی نہ بڑھتی ہوئی خلیج کا کوئی احساس پیدا ہوا۔ مرکزی حکومت ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ ان بیوروکریٹوں کے ذریعے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

تقسیم برصغیر کے وقت پاکستان کے حصے میں آنے والے 83 انڈین سول سروس افسروں میں صرف ایک بنگالی تھا جبکہ باقی لوگ مغربی پاکستان سے تھے یا ان کا تعلق اردو بولنے والے اس طبقے سے تھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ 1948 میں مشرقی پاکستان سے 01.11 فی صد سول آفیسر لیے گئے جبکہ 1958 تک یہ تعداد 07.41 تک پہنچی۔ اس دوران سول سروس میں مغربی پاکستان کا تناسب 90.88 تک تھا۔ 1958 سے 1962 کے درمیان ایوب خان کے دور میں فیصلہ ہوا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسروں کو مشرقی پاکستان میں رکھا جائے۔ اس تحقیر کا ایک پہلو ''مارشل ریس'' کا نظریہ تھا جس کے تحت صرف چھ فٹ کے جوان فوج کے لیے موزوں سمجھے جاتے تھے، جبکہ بنگالی پستہ قد تھے، چنانچہ وہ پنجابیوں' پٹھانوں اور مہاجروں کے برابر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ تحقیر مغربی پاکستان کے حکمرانوں بالخصوص فوجیوں میں اوپر سے نیچے تک موجود تھی۔ ایم ایم عالم پاک فضائیہ کے بے مثال شاہین تھے۔ انہوں نے 1965ء کی جنگ میں دو منٹ میں بھارت کے چار جہاز گرائے تھے اور یہ ایک عالمی ریکارڈ تھا۔ چند سال پہلے وہ اے آر وائی پر انٹرویو دیتے ہوئے بتا رہے تھے کہ جنرل ایوب کو جب میرے کارنامے کی اطلاع دی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ انجام دینے والا بنگالی ہے تو اُن کا چہرہ سرخ سے سیاہ ہو گیا۔ یعنی انہیں یہ بات پسند نہ آئی۔

کرنل صدیق سالک نے اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا'' میں لکھا ہے کہ وہ سقوطِ ڈھاکا سے کافی عرصہ پہلے ڈھاکا پہنچے تو ہوائی اڈے پر ایک بنگالی نے ان کے لیے قلی کا کام انجام دیا۔ صدیق سالک نے اس بنگالی کو کچھ پیسے دینے چاہے تو ان کو ہوائی اڈے پر ''Recieve'' کرنے والے فوجی افسر نے کہا: ''سر، ان حرام زادوں کا دماغ خراب نہ کریں''۔ یعنی ہمارے فوجی افسر کے لیے ایک عام بنگالی ''حرام زادہ'' تھا۔

جنرل راؤ فرمان علی مشرقی پاکستان کا ایک اہم کردار تھے۔ انہوں نے کئی برس

پہلے ہفت روزہ تکبیر کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ مشرقی پاکستان کے بحران کے دوران میرے گھر میں کام کرنے والی ماسی نے مجھ سے کہا کہ صاحب آپ ''غداروں'' کا سر کچل دیں۔ یعنی بنگالیوں کے غدار ہونے کی داستان ان کے ''غدار'' بننے سے پہلے ہی عام کر دی گئی تھی اور اس غداری کی اطلاع ''نوکرانیوں'' تک کو ہو گئی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بنگالیوں کی تذلیل کا کیسا سلسلہ مدتوں سے جاری تھا۔ اسلام نسل، رنگ، جغرافیے اور زبان کے جن بتوں کو توڑتا ہے پاکستان کے حکمران طبقے کے اراکین مشرقی پاکستان میں ان تمام بتوں کی پوجا کر رہے تھے۔

مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک ہزار کلو میٹر سے زیادہ کا فاصلہ تھا مگر اس کے باوجود مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے یہ تصور عام کیا ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں وہ فوجی قوت موجود ہی نہ تھی جو مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ناگزیر تھی۔ اس پہ طرہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں تعینات فوجی مشرقی پاکستان کو اپنا گھر ہی نہیں سمجھتے تھے۔

صدیق سالک نے اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا'' میں لکھا ہے کہ میں ڈھاکا پہنچا تو مجھے میرے فوجی ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ رہنے کے لیے بھاری سامان نہ خریدنا کیونکہ پتا نہیں ہمیں کس وقت یہاں سے جانا پڑ جائے۔ چند برس پہلے جنرل (ر) حمید گل نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ہماری فوج کا ڈسپلن بہت زبردست ہے، یہ ٹوٹتا نہیں ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ یہ کیسا ڈسپلن ہے کہ ملک ٹوٹ جاتا ہے مگر ڈسپلن نہیں ٹوٹتا! جنرل (ر) حمید گل نے جواباً کہا کہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس مثال کو مشرقی پاکستان کے حالات پر منطبق کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے ہتھیار ڈالنے والے 90 ہزار فوجیوں میں ایسے دس پندرہ ہزار فوجی تو ضرور ہونے چاہیے تھے جو کہتے کہ ہمارا ملک ٹوٹ رہا ہے اس لیے ہم مر جائیں گے مگر دشمن کے آگے

ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ لیکن ادھر جی ایچ کیو سے ایک حکم آیا اور اُدھر تمام فوجیوں نے ڈسپلن کی پاسداری کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ بلاشبہ دس پندرہ ہزار فوجیوں کے ہتھیار نہ ڈالنے سے کچھ نہ ہوتا، لیکن ایک مثال تو قائم ہوتی اور ہم آج فخر سے کہتے کہ ہمارے کچھ فوجیوں نے مشرقی پاکستان کا دفاع ٹھیک اس طرح کیا جس طرح مادرِ وطن کا دفاع کیا جاتا ہے۔ اپنے گھر کا دفاع کیا جاتا ہے

جمہوریت کا اصول اکثریت ہے اور 1970ء کے انتخابات میں اکثریت شیخ مجیب الرحمٰن کو حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ انہیں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اقتدار انہیں منتقل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن نہ بھٹو نے اُن کی اکثریت کو تسلیم کیا، نہ جنرل یحییٰ نے اسے تسلیم کرنے کا کوئی اشارہ دیا۔ لیکن اس صورتِ حال کے اصل ذمے دار جنرل یحییٰ تھے۔ فوج ان کے ہاتھ میں تھی، اکثریت کا اصول ثابت ہو چکا تھا، چنانچہ اگر وہ بھٹو سے کہتے کہ شیخ مجیب کی اکثریت کو تسلیم کرو تو بھٹو کے پاس اُن کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا، بالخصوص اس صورت میں جب کہ بھٹو اور شیخ مجیب کے درمیان شیخ مجیب کے چھ میں سے ساڑھے پانچ نکات پر اتفاقِ رائے کی خبر گرم تھی۔ لیکن جنرل یحییٰ نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔

کہا جاتا ہے کہ سقوطِ ڈھاکا کے ذمے دار تین لوگ ہیں: اندرا گاندھی، بھٹو اور یحییٰ۔ لیکن اگر ایسا ہے تو بھٹو اور یحییٰ پر کبھی ملک توڑنے کے الزام میں مقدمہ کیوں نہیں چل سکا؟ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو ایک شخص کے مشتبہ مقدمے میں سزائے موت دے دی لیکن ان پر سقوطِ ڈھاکا میں ملوث ہونے کا الزام کبھی نہیں لگایا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جنرل ضیاء الحق بھٹو پر ملک توڑنے کا مقدمہ چلاتے تو پھر ان کے فوجی بھائیوں کا کردار بھی ضرور سامنے آتا۔ بلاشبہ بھارت کی مداخلت کے بغیر مشرقی پاکستان الگ نہیں ہوسکتا تھا مگر بھارت کی مداخلت کے لیے سازگار حالات ہمارے حکمرانوں نے خود پیدا کیے تھے۔ بھارت پہلے دن سے پاکستان کی تاک میں تھا اور مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی بڑی آبادی تھی، چنانچہ ہمیں

مشرقی پاکستان کو زیادہ محبت، زیادہ انصاف اور زیادہ مہربان بن کر چلانا چاہیے تھا، لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس کے برعکس طریقے سے مشرقی پاکستان کو چلایا۔ المناک بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں خلیج حائل تھی اور ہمارے ذرائع ابلاغ مشرقی پاکستان میں سب ٹھیک ہے کا سرکاری راگ الاپ رہے تھے، چنانچہ سقوطِ ڈھاکا ہوا تو مغربی پاکستان کے لوگ حیران رہ گئے۔

مشرقی پاکستان کو ہم نے اسی دن جدا کر دیا تھا جب ہم نے بنگالیوں کو کالے کلوٹے جاہل گنوار قرار دیتے ہوئے تمام شعبوں میں ان کی حق تلفی شروع کر دی۔ بنگالی ہم سے زیادہ ذہین تھے اور احساس محرومی کے ساتھ غلاموں کی طرح جینے کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ شیخ مجیب جسے ہمارے ہاں غدار قرار دیا جاتا ہے ان لوگوں میں سے تھا جو تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے وہ خود قائداعظم کا خطاب سننے کئی کئی سو کوس پیدل یا سائیکل پر سفر کر کے آتا تھا۔ ایسا اچانک کیا ہوا کہ قیام پاکستان کی تحریک میں پیش پیش شخص اچانک پاکستان سے اتنا متنفر ہو گیا؟

1970 کے عام انتخابات کے نتائج بہت واضح تھے مشرقی پاکستان نے شیخ مجیب کی عوامی لیگ کو تقریباً تمام نشستیں پلیٹ میں رکھ کر دیں اور یہ وہاں کے ووٹرز کا مغربی پاکستان کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف فیصلہ تھا۔ بھٹو مغربی پاکستان سے انتخابات میں کامیاب ضرور ہوئے تھے لیکن ان کی جماعت کے پاس حکومت بنانے کی اکثریت نہیں تھی۔ شیخ مجیب ہماری اسٹیبلشمنٹ کو کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا چنانچہ اس کے مینڈیٹ کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو کو وزیراعظم بنانے کی ناکام کوشش کی اور اس کے نتیجے میں شیخ مجیب نے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کیلئے مشرقی پاکستان میں فوجیں اتاریں گئیں لیکن مشرقی پاکستان میں بسنے والوں نے شیخ مجیب کا ساتھ دیا ہندوستان نے مکتی باہنی کی تحریک کے ذریعے اور پھر جنگ کے میدان میں مشرقی پاکستان کا ساتھ دیا یوں ہم

مشرقی پاکستان میں جنگ ہارنے کے بعد ہندوستان کی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے جنرل یحیٰی اور بھٹو کو اس سانحے کا مرتکب ٹھہراتے ہیں۔لیکن یہ سانحہ چند کرداروں کے باعث پیش نہیں آیا بلکہ ایک غاصب سوچ اور جھوٹے نظریات کی وجہ سے پیش آیا۔ وہ سوچ جس نے جناح کی فلاحی ریاست کو ایک سیکیورٹی ریاست میں تبدیل کر دیا وہ سوچ جس نے جناح کے پاکستان کو مذہبی شدت پسندی کی آگ میں جھونک ڈالا۔قوی امید تھی کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد یہ سوچ اور اس کا خالق ادارہ کبھی بھی قومی نظریات اور معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا لیکن صورتحال اس کے بالکل برعکس نکلی۔سقوطِ ڈھاکہ کے کسی مجرم کو سزا نہ سنائی گئی۔بھٹو کو تختہ دار پر پہنچا کر فوج نے مارشل لاء لگایا اور ضیاالحق کی صورت میں ایسا بدترین آمر بچے کھچے پاکستان پر قابض ہوا جس نے اس ملک کے کونے کونے میں شدت پسندی تعصب اور نفرت کی آگ پہنچا دی۔

سیاستدان ان تمام واقعات میں یقیناً قصوروار ہیں لیکن ان تمام واقعات کے مرکزی مجرم دفاعی اسٹیبلشمنٹ کے جرنیل اور آمر ہیں جنہیں توپوں کی سلامیوں میں رخصت کیا جاتا ہے اور ملک کے جھنڈے میں تمام اعزازات کے ساتھ دفن بھی کیا جاتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا کارنامہ کیا ہے۔کون سی جنگی فتوحات ہمیں حاصل ہوئیں ہیں ہمیں سوال کرنے کا موقع دیا جائے۔

مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے سبق دو تھے۔ پہلا سبق یہ کہ طاقت کے زور پر کبھی بھی وطن میں بسنے والے لوگوں کو دبایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی بزور طاقت انہیں زبردستی متحد رکھا جا سکتا ہے۔دوسرا اہم سبق یہ تھا کہ حکومت کرنا سیاستدانوں کا کام ہے فوج کے ادارے کا نہیں۔افسوس ہم نے ان میں سے کسی بھی سبق کو سیکھنے سے انکار کر دیا اور قومی مفاد کی ایک ایسی اصطلاح روشناس کروائی جس کی آڑ میں سچ بولنے والوں تحقیق کرنے والوں

اور سوال اٹھانے والوں کو غدار قرار دیکر قصہ ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہ قومی وقار اقتدار پر براہ راست یا بلاواسطہ قبضے کے لیئے خوب استعمال کیا جاتا ہے۔

اس قومی وقار کے گرد ہم نے ایک قومی سوچ اور نظریہ تیار کر رکھا ہے جو اپنے عیبوں سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے محض ایک دفاعی بیانیہ تیار کرتا چلا جاتا ہے۔ جس کے تحت سوال اٹھانے والے اور تحقیق کی راہوں پر گامزن دماغ تیار ہو ہی نہیں پاتے۔ اور اس کے نام پر اس ملک کے بسنے والے کروڑوں افراد کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے۔

جب تک ہم اس قومی مفاد اور وقار کے گرد قائم دفاعی ریاست کے تصور کو تبدیل کر کے جناح کی فلاحی ریاست والے تصور کی طرف واپس نہیں آئیں گے ہم یونہی بھٹکتے رہیں گے۔ جب تک اپنی ہی سرزمین کو فتح کرنے کی عادت ختم نہیں ہو گی سقوط ڈھاکہ جیسے سانحات رونما ہوتے رہیں گے۔ جب تک بچوں کو مسخ شدہ تاریخ پڑھا کر بنگالیوں کو مجرم قرار دے کر تمام جنگیں جیتنے کا پراپیگنڈہ ختم نہیں ہو گا تب تک اس ملک میں بسنے والی قومیتیں یکجا نہیں ہوں گی۔ قومیں محبت اور حقوق کی فراہمی سے یکجا رہتی ہیں نہ کہ بندوق کے زور پر۔ اپنا قومی بیانیہ علم و تحقیق ایجادات اور امن پسندی پر قائم کیجیئے ہمیں سقوط ڈھاکہ جیسا زخم دوبارہ نہیں سہنا پڑے گا۔ آج بھی سقوط ڈھاکہ کے مجرموں کو کم سے کم عوام سے روشناس کروانا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ سچ بہر حال وقتی طور پر دبایا تو جا سکتا ہے لیکن چھپایا نہیں جا سکتا اور تاریخ بہت بے رحم ہوتی ہے یہ تمام واقعات کو اپنے سینے میں محفوظ رکھتی ہے۔ جناح کا پاکستان آج بھی سقوطِ ڈھاکہ کے زخم سے چور چور آپ سب سے اپنے مجرموں کی نشاندہی کا مطالبہ کر رہا ہے اور چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ غاصبانہ اور متعصّبانہ پالیسیاں بنانا بند کیجیئے یہ وطن کسی اور سقوطِ ڈھاکہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

سوشلسٹ فریب

پاکستان دولخت ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود جنرل یحییٰ نے اقتدار سے چمٹے رہنے کی کوشش کی اور انہوں نے ایک آئین کا مسودہ بھی تیار کروالیا تھا جس کے مطابق جنرل یحییٰ خان پاکستان کے صدر ہوتے اور اگر وہ چاہتے تو افواج پاکستان کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

یحییٰ خان کے تیار کردہ آئین کے صرف ان دو نکات سے ہی ان کے عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر عوام اور افواج پاکستان کی طرف سے جنرل یحییٰ خان کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں تو انہیں اقتدار سے الگ ہونا پڑا۔ یحییٰ خان جب اقتدار چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے تو پاک فضائیہ کے سربراہ ائیر مارشل رحیم خان نے کہا کہ وہ میراج طیاروں کو ایوان صدارت پر بمباری کے احکامات جاری کر دیں گے۔ 19 دسمبر 1971 کو یحییٰ خان نے صدر، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پاک فوج کے سربراہ کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔

یحییٰ خان کے استعفے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی صدارت سنبھال لی اور ساتھ ہی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ اس بات کا جواب تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہیں ملتا کہ جنرل یحییٰ خان نے کس حیثیت میں اقتدار بھٹو کے حوالے کیا؟ بہر کیف بھٹو نے صدارت سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ خان سمیت 7 جرنیلوں کو سبک دوش کر کے لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو قائم مقام کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن نے ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے 1942 میں کمیشن حاصل کیا تھا اور انڈین آرمی میں شمولیت

اختیار کی۔ بحیثیت کمانڈر ان چیف ان کی مدت مختصر رہی۔ پاکستان دولخت ہو چکا تھا اور وہ ایک شکست خوردہ فوج کے سربراہ بنے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ماہ بعد ہی لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو مستقل کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا مگر فور سٹار جنرل کے عہدے پر ترقی نہ دی۔ فوج میں ان سے سینئر صرف لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان ابتدائی دنوں میں ہی اختلافات کا آغاز ہو گیا جب پولیس کی طرف سے ہڑتال کی گئی اور حکومت نے اس ہڑتال کو کچلنے کے لیے فوج سے مدد طلب کی تو لیفٹیننٹ جنرل گل حسن نے اس مقصد کے لیے فوج کو استعمال کرنے سے واضح انکار کر دیا۔ گل حسن اپنی کمانڈ میں مداخلت کے قائل نہ تھے اور صدر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے فوجی افسروں کو براہ راست احکامات کو لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کی طرف سے پسند نہ کیا گیا۔

چند روز بعد ہی جب زرعی اصلاحات کی خوشی میں ملک میں عام تعطیل تھی، بھٹو نے بری اور فضائی کمانڈر ان چیفس کو ملاقات کے لیے ایوان صدر طلب کیا۔ ان دونوں حضرات کے پہنچنے پر بھٹو نے انہیں بتایا کہ سیاسی حالات کے پیش نظر انہیں استعفیٰ دینا ہوگا۔ کسی بھی ناخوش گوار صورت حال سے بچنے کی غرض سے ایوان صدر کے ایک اور کمرے میں چیف آف جنرل سٹاف، ڈی جی ملٹری آپریشنز اور ڈائریکٹر انٹیلی جنس کو بھی ملاقات کے بہانے بلا لیا گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کے پاس استعفیٰ دینے کے سوا کوئی راستہ نہ بچا۔ بھٹو نے لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم خان کو غلام مصطفیٰ کھر اور غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھ بذریعہ سڑک ایک گاڑی میں بٹھا کر لاہور روانہ کر دیا تاکہ کمان میں تبدیلی عمل میں آ سکے۔ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی، بھٹو نے ٹی وی پر تقریر کرتے ہوئے فوج سے کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور جنرل ٹکا خان کو پاکستان کا پہلا چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر دیا۔

نیشنلائزیشن پالیسی

بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد صنعتوں اور تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کا عندیہ دیا جس پر اس وقت کے وزیر خزانہ مبشر حسن کی سربراہی میں کام شروع کر دیا گیا۔ صورتحال یہ تھی کہ تقسیم ہند کے وقت پاکستان کے حصے میں آنے والی چند صنعتیں ہماری بنیادی ضروریات پورا کرنے کے لئے ناکافی تھیں۔ آزادی کے بعد پہلے عشرے میں صنعتی پیداوار اتنی قلیل تھی کہ آٹا اور چینی کی بھی راشن بندی کرنا پڑی۔

صدر ایوب خاں کے دور میں صنعت کاری کا آغاز ہوا اور تیزی سے بڑی صنعتیں قائم ہوئیں جن میں ٹیکسٹائل، گھی، چینی، سیمنٹ اور کھاد کے کارخانے شامل تھے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کے ساتھ ساتھ مقامی سرمایہ کار بھی میدان عمل میں آئے اور بظاہر صنعتی ترقی کی رفتار میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں منافع کمانے کی کوئی اخلاقی حد تو مقرر نہیں ہوتی چنانچہ اس دور میں دولت کا ارتکاز 22 خاندانوں تک محدود ہو گیا جبکہ عام آدمی کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آسکی۔ صنعت کاری کے فروغ کے ساتھ صنعتی کارکنوں نے ٹریڈ یونینیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ مزدور کے حالات کار بد سے بدتر ہوتے گئے۔ آجر اور اجیر کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے جس کے نتیجے میں صنعتی ماحول خراب ہوا۔ سرمایہ کار مزدوروں کو سہولتیں دینے سے انکاری تھا اور مزدور نامساعد حالات کی وجہ سے اپنے فرائض میں غفلت برت رہا تھا۔ ستر کی دہائی میں سوویت روس کا کمیونزم دنیا کے بیشتر ممالک کو نظریاتی طور پر متاثر کر چکا تھا۔ پاکستان بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے روٹی کپڑے اور مکان کا نعرہ لگا کر انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پیپلز پارٹی ایوان اقتدار میں بھرپور سیاسی طاقت کے ساتھ داخل ہوئی اور یہ بھاری اکثریت کے بل بوتے پر انقلابی اصلاحات کا ایجنڈا لے کر آئی تھی جس پر عمل درآمد

کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 2 جنوری 1972ء کو منشور کے مطابق بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لانے کا آغاز کیا۔

پہلے فیز میں فولاد، سٹیل، ہیوی انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ، موٹر ٹریکٹر، بجلی کی پیداوار، ترسیل اور تقسیم، گیس اور آئل ریفائنری کی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ پہلے مرحلے کے بعد یکم جنوری 1974ء کو بینکوں اور مالیاتی اداروں کو قومیانے کے لیے پارلیمان میں منظوری دی گئی۔ وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کا کہنا تھا کہ ''کل تک بینک چند پرائیویٹ گروپوں کے قبضے میں تھے جو اپنی مرضی سے صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرتے تھے۔ آج ہم ان کی اجارہ داری کو ختم کر کے انہیں قومی ملکیت میں دیتے ہیں کیونکہ گزشتہ حکومت نے صنعتی طاقت کو چند لٹیروں کے ہاتھوں میں مرکوز کیا ہوا تھا''

اس مرحلے میں 13 بڑے بینکوں 12 انشورنس کمپنیوں، 2 پٹرولیم کمپنیوں اور 10 شپنگ کمپنیوں کو سرکاری تحویل میں لیا گیا۔ لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری سے خطاب کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے یہ موقف پیش کیا کہ بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا مقصد سرمائے کو چند ہاتھوں میں مرکوز کرنے سے روکنا اور چھوٹے درمیانے سرمایہ دار کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ تیسرے مرحلے میں 2000 کے لگ بھگ کاٹن جننگ، رائس ہسکنگ اور فلور ملوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا۔ اس کے بعد پورے ملک میں ردعمل کے نتیجے میں مخالفت کا دور شروع ہو گیا۔ نیشنلائزیشن کے متاثرین میں ملک کے تمام بڑے بڑے صنعتی گروپ شامل تھے۔

نیشنلائزیشن کی یہ پالیسی بری طرح ناکام ہوئی۔ منصوبہ بند معیشت میں تمام پیداواری صنعتوں کا انتظام وانصرام حکومتی کنٹرول میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آزاد منڈی کی معیشت میں تمام بڑی چھوٹی صنعتیں نجی سرمایہ دار چلاتے ہیں۔ 1990ء میں سوویت روس کے انہدام کے ساتھ ہی دنیا بھر میں منصوبہ بند معیشت بھی زوال کا شکار ہو گئی تھی۔

سرمایہ داری نظام میں نجکاری کا عمل کوئی نئی بات نہیں، ساری دنیا میں صنعتیں اور مالی ادارے نجی شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ نجکاری کے عمل کے لئے صرف ان اداروں کو منتخب کیا جانا چاہیے جو خسارے میں جا رہے ہوں۔ دوسری بات شفافیت ہے اور اس کے علاوہ سرمایہ کاروں کو مناسب ماحول مہیا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں نجکاری کا عمل کرپشن اور اقربا پروری کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے جس سے قومی خزانے کو اربوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ نجکاری کے عمل کا مقصد خود انحصاری ہے۔ اگر ہم قومی ادارے بیچ کر بھی آئی ایم ایف کے مقروض ہیں تو پھر کہیں خرابی ضرور ہے۔

بہرحال ذوالفقار علی بھٹو کے ان اقدامات سے جہاں ملکی معیشت تباہی سے دوچار ہوئی وہیں تعلیمی میدان میں بھی بے پایاں نقصان ہوا۔ بڑے سرمایہ داروں نے بچے کھچے اثاثے جمع کیے اور ملک سے باہر منتقل ہو گئے۔ بھٹو نے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو قومی معیشت کی ترقی میں حصہ ڈالنے کی کی ترغیب دی تو انہیں شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں وزیراعظم بھٹو نے کراچی میں صنعتکاروں کے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے یہی بات کہی تو متعدد صنعت کاروں نے ان کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے عدم تعاون کا اعلان کیا۔ ان میں ولیکا ٹیکسٹائل کے بانی چاچا ولیکا بھی شامل تھے جنہوں نے بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ صنعت کاروں کی سالہا سال کی محنت کو برباد کرنے کے بعد ان سے کسی قسم کے تعاون کی توقع نہ رکھی جائے۔

بھٹو نے مشن سکولوں سمیت اعلیٰ تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لیا تو تعلیمی معیار انتہائی پست سطح پر آ گیا۔ یہ ادارے سالہا سال سے معیاری تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے تھے مگر جب انہیں قومی تحویل میں لے کر سرکاری سکولوں میں تبدیل کیا گیا تو نا صرف ان کا تعلیمی معیار پہلے جیسا نہ رہا بلکہ مجموعی طور پر ملک بھر میں اچھی تعلیم کے ذرائع کم ہو گئے جس سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں زوال آ گیا۔ قومیانے کے بعد اگرچہ تعلیم مفت کر دی

گئی تھی مگر ماضی کے مقابلے میں اس کا معیار انتہائی پست تھا۔

حکومت کے کرپٹ نظام نے تعلیم اداروں کو قومیائے جانے کا غلط فائدہ اٹھایا اور وزیروں اور افسروں نے تعلیم کا پیسہ سکولوں پر خرچ کرنے کی بجائے اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں بعد وہ پرائیویٹ سکول جو کبھی جنت کا نمونہ ہوتے تھے کھنڈرات میں بدل گیے۔ تعلیم کا معیار مزید گر گیا کیونکہ اب اساتذہ کی نوکریاں پکی ہو چکی تھیں اور وہ کسی کو جوابدہ بھی نہیں تھے۔ بھٹو کے چند کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی داغ بیل ہے۔ یہ بھٹو ہی تھا جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان واپس بلایا اور انہیں ایٹم بم بنانے کا کام سونپا۔

بھٹو کا دوسرا بڑا کانامہ 1973 کا آئین تھا جو اس نے اپنی چالاکی کے زور پر اس وقت کے جغادری سیاستدانوں سے مک مکا کر کے منظور کروالیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں بھٹو نے خود بھی اس قانون کی دھجیاں اڑائیں۔

بھٹو کا تیسرا بڑا کارنامہ اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد تھا جس میں اسلامی دنیا کے تقریباً تمام حکمرانوں نے شرکت بلکہ اسی بہانے بھٹو نے مشرقی پاکستان کو تسلیم کیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان میں خوش آمدید کہا۔ بیشک یہ کانفرنس بھی باقی کانفرنسوں کی طرح دکھاوا ہی تھی اور اس کے دورس نتائج نہ نکل سکے۔ لیکن بھٹو نے اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کر کے انہیں اتحاد اور یگانگت کی اہمیت سے ضرور آگاہ کیا جس سے انہیں اتحاد اسلامی کے داعی کی حیثیت سے شہرت ملی۔

بھٹو نے عام آدمی کو سیاسی شعور بخشا۔ یہ الگ بات ہے کہ عوام کی اکثریت کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اس سیاسی بیداری کا غلط فائدہ اٹھایا گیا۔ طلبا نے اپنے حقوق کا غلط استعمال کرتے ہوئے بس مالکان کا ناک میں دم کیے رکھا، مزدور یونینوں نے بزنس مینوں کی پیداواری صلاحیت کم کردی۔ مزارع کو مالک بنا دیا جو بعد میں الٹا زمیندار کے

لیے ہی مصیبت بن گیا۔

بھٹو کی غلط پالیسیوں اور احکامات کی وجہ سے قوم کو جو نقصان ہوا اس کا ازالہ آج تک نہیں ہوسکا۔ بھٹو نے شملہ معاہدہ کر کے اپنے فوجی تو واپس لے لیے مگر کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں نہ لے جانے کی شرط منظور کر لی۔ بھٹو نے اپنے دور کے آخری سالوں میں اپنے مخالفین کو بری طرح تنگ کیا۔ جس طرح جنرل مشرف نے کرپٹ سیاستدانوں کو نیب سے ڈرا کر اپنے ساتھ ملا کر حکومت بنائی اسی طرح بھٹو نے 1977ء کے الیکشن میں سیاسی کارکنوں کو چھوڑ کر وڈیروں اور جاگیرداروں کو اسمبلیوں کے ٹکٹ دیے جو بھٹو کی پارٹی کے منشور کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ بھٹو کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں شامل تکون کا ایک کونا تھا۔ اگر بھٹو خود غرضی کا مظاہرہ نہ کرتا اور مجیب الرحمٰن کی پارٹی کو اقتدار دے دیتا تو شائد پاکستان نہ ٹوٹتا۔ بھٹو نے ادھر تم اور ادھر ہم کا نعرہ لگا کر مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی بنیاد رکھ دی۔

بھٹو سیاسی طور پر بہت ذہین شخص تھا۔ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ اسی کی ایجاد تھا جس نے اسے دنوں میں ایک قومی لیڈر بنا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کے دور میں خوراک کے لیے لوگوں کو قطاروں میں کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے دور میں پکی پکائی روٹی کا کارخانہ بھی لگا۔ اس کارخانے کے افتتاح پر بھٹو نے کہا تھا کہ آج اس نے روٹی کپڑا اور مکان میں سے ایک کا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پکی پکائی روٹی کا کاروبار جلد ہی ٹھپ ہو گیا۔

1977ء کے انتخابات

1977ء کے انتخابات سال کے دوسرے نصف میں منعقد ہونا تھے، لیکن بھٹو نے اپنا استحقاق استعمال کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ یہ انتخابات سال کے اوائل میں 7 مارچ کو ہی

منعقد ہوں گے۔جنوری 1977ء میں قومی اور صوبائی اسمبلی کی تحلیل کے ساتھ ہی بھٹو نے ایک بہت بڑی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا،عوامی اجتماعات اور پُر ہجوم جلسوں سے خطاب کے دوران انہوں نے اپنی نام نہاد اسلامی اشتراکیت کی تشہیر کی، یہی نہیں بلکہ مذہبی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے انہوں مذہبی حقوق کے نام پر مختلف احکامات بھی جاری کرنے شروع کر دیے۔

اس وقت دائیں بازو کی نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد پاکستان نیشنل الائنس بھٹو کے مدّ مقابل تھا۔ یہ سیاسی و مذہبی جماعتیں1977ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو بھاری اکثریت حاصل کرنے سے روکنے کے لیے اس کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔انہوں نے بھٹو اوران کے ساتھیوں پر بدعنوانی، بدانتظامی اور ملک کو بحران میں مبتلا کرنے کا الزام عائد کیا۔ پی این اے نے مذہب کو اپنا بنیادی نعرہ بنایا اور ساتھ ہی بھٹو کے خلاف مہم بھی جاری رکھی۔

جب 1977ء کے انتخابی نتائج سامنے آئے تو پیپلز پارٹی ایک بڑی اکثریت کے ساتھ جیت گئی،اس نے قومی اسمبلی کی 200 نشستوں میں سے 155 پر کامیابی حاصل کی تھی۔ پی این اے نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا تاہم اس نے قومی اسمبلی میں صرف36 نشستیں حاصل کیں۔ پاکستان نیشنل الائنس نے انتخابات کے نتائج کو مسترد کر دیا اور سول نافرمانی کی ملک گیر مہم شروع کر دی۔ انہوں نے پیپلز پارٹی پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا اور پیپلز پارٹی کے صدر اور چیف الیکشن کمشنر کے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔ابتداء میں تو بھٹو نے قومی اتحاد کے مطالبات مسترد کر دیے،لیکن بعد میں ان کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے ذوالفقار علی بھٹو،عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی نے مذاکرات میں شرکت کی جبکہ قومی اتحاد کی جانب سے مفتی محمود، پروفیسر عبدالغفور اور نوابزادہ نصر اللہ کو نمائندہ بنایا گیا تھا۔

فریقین میں مذاکرات کے کئی دور ہوئے جن میں متعدد مواقع پر سمجھوتے یا

مذاکرات کے خاتمے کی نوبت آتی رہی۔ بالآخر جولائی 1977ء کے پہلے ہفتے میں فریقین کے مابین سمجھوتہ قریباً طے پا گیا۔ مگر بدقسمتی سے اس سمجھوتے پر عملدرآمد کی نوبت ہی نہ آسکی اور پانچ جولائی کو فوج نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

پاکستان کی تاریخ میں 5 جولائی 1977 کا دن بھلایا نہیں جا سکتا، یہی وہ دن تھا جب پاکستان میں سورج طلوع ہونے سے قبل ہی پورے ملک میں مارشل لا نافذ ہو چکا تھا، فوج کی اس کارروائی کو آپریشن فیئر پلے کا نام دیا گیا تھا، یہ کوئی اچانک اور غیر متوقع اقدام نہیں تھا، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد عرصے سے اس خدشے کا اظہار کر رہے تھے، اس کے لئے پس پردہ تیاریاں ہو رہی تھیں اور فضا کو ایسا سازگار بنایا جا رہا تھا، کہ مارشل لا لگنے کے بعد قوم اسے درپیش مسائل کا واحد حل سمجھ کر خوش دلی سے قبول کر سکے، جون کے آخر اور جولائی کے ابتدائی چند دنوں میں قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان مذاکرات کے مدوجزر نے اس مارشل لا کے لئے مزید راہ ہموار کردی۔

پانچ جولائی 1977 کی صبح چھ بج کر چار منٹ پر مسلح افواج کے ترجمان کی جانب سے اعلان کیا گیا، کہ مسلح افواج نے پانچ جولائی کی صبح سے ملک میں نظم ونسق سنبھال لیا ہے اور تمام سیاسی رہنما عارضی طور پر مارشل لا حکومت کی حفاظت میں ہیں۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیا الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد قوم سے اپنے پہلے خطاب میں اعلان کیا کہ وہ سیاسی بحران کا حل نکالنے کے لیے حکومت میں آئے ہیں اور 90 روز میں انتخابات کروا کر واپس چلے جائیں گے۔ جنرل ضیا نے مری میں بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں یقین دہانی کروائی کہ وہ ان کے خادم ہیں اور بہت جلد اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کر دیں گے۔

جنرل ضیا نے نوے روز میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا جس کے بعد سیاسی جماعتوں نے دوبارہ انتخابی مہمات شروع کر دیں۔ معزول وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے

دوبارہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی مہم کا آغاز ہی کیا تھا کہ حال ہی میں رہائی پانے والے پاکستان نیشنل الائنس (قومی اتحاد) کے رہنماؤں نے ایک پروپیگنڈا مہم شروع کردی کہ پیپلز پارٹی آنے والے انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ اگست 1977ء میں پیپلز پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی کے ایک اجلاس میں بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے اس تصور کو مسترد کردیا، اور اکتوبر کو ہونے والے عام انتخابات میں پارٹی کے بھرپور طریقے سے حصہ لینے کے ارادے کا اعادہ کیا۔ اس کے بعد بھٹو نے ملک بھر کا دورہ کیا اور اپنی پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں سے ملاقاتیں شروع کردیں۔ چھ اگست کو وہ اپنے کارکنوں سے ملاقات کے لیے ملتان پہنچے، جہاں ہزاروں کارکنان تمام حفاظتی رکاوٹیں توڑتے ہوئے بھٹو کو سننے اور انہیں دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ گیارہ اگست کو پشاور میں پارٹی کے کارکنوں کا ہجوم بے قابو ہوگیا اور پولیس کو آنسو گیس اور لاٹھی چارج کا استعمال کرنا پڑا۔ یہ ضیاالحق کی حکومت کے لیے ایک انتباہ تھا کہ بھٹو واپس آگیا تھا۔

جیسے ہی بھٹو نے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ شروع کیا، جنرل ضیاالحق نے آٹھ اگست کو ایک ''الیکشن سیل'' تشکیل دے دیا۔ یہ الیکشن سیل سیاسی رہنماؤں سے ملک میں فوجی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ان کے سیاسی نکتہ نظر جاننے کے لیے ملاقات کررہا تھا، تاکہ ہر سیاسی جماعت کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس سیل کی تشکیل کا ایک مقصد مقررہ مدت میں انتخابات کی صورت میں پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کی پارٹی پوزیشن کا تعین کرنا بھی تھا۔

الیکشن سیل کے نتائج پر مستقبل کی حکمت عملی ترتیب دینے کے لیے جنرل ضیاء نے یہ ٹاسک اپنے قابل اعتماد ساتھی جنرل فیض علی چشتی کے حوالے کیا۔ جنرل فرمان علی، جنرل جمال سید میاں اور جنرل انوارالحق ان کے معاون تھے۔ الیکشن سیل نے اکیس اگست سے انفرادی اور گروہی صورت میں سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو شروع کیے۔ یہ سیل ہر اس شخص

کے لیے کھلا تھا، جو انتخابات سے متعلق معاملات پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا تھا۔ اس الیکشن سیل میں سب سے پہلے پیپلز پارٹی کی اتحادی جماعت پاکستان مسلم لیگ (قیوم) کے رہنما اور سابق وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان اور بجلی، پٹرول اور قدرتی وسائل کے سابق وزیر یوسف خٹک نے ملاقات کی۔ ان کے بعد تحریک استقلال کے اصغر خان، نامور وکیل ایس ایم ظفر اور پھر جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد نے بھی ملاقات کی۔ اصغر خان نے الیکشن سیل کو بتایا کہ قومی اتحاد ایک خلاف فطرت اتحاد تھا اور اگر فوج اس کو بطور ایک اتحاد قائم رکھنا چاہتی ہے تو اس کو ایک اور مارشل لا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انہوں نے دلیل دی کہ بھٹو کی بے دخلی کے بعد قومی اتحاد ناکارہ ہو گیا ہے۔ اصغر خان نے کہا کہ وہ تحریک استقلال کو کسی اور پارٹی میں ضم نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کو ملاؤں کی پارٹی میں تبدیل کریں گے۔

انہوں نے قومی اتحاد کی قیادت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قومی اتحاد کی بے روح قیادت نظامِ مصطفیٰ کے معنی تک نہیں جانتی۔ تحریک استقلال کے رہنما نے دعویٰ کیا کہ ''وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہاتھ کاٹ دینا چاہیے اور سنگسار کر دینا چاہیے'' انہوں نے دلیل دی کہ وہ ایک دوسرے کی اقتدار کے نام پر حمایت کر رہے تھے، جس سے صورتحال مزید خراب ہو جائے گی۔

اصغر خان نے شیڈول کے مطابق انتخابات کے انعقاد کی قطعی طور سے مخالفت کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی جانب سے انتخابات کے بائیکاٹ سے یہ صورتحال ختم ہو جائے گی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد قومی اتحاد ٹوٹ جائے گا اور فوجی حکومت مطلوبہ نتائج حاصل کر لے گی۔ لیکن موجودہ حالات میں اگر انتخابات کا انعقاد کرایا جاتا ہے تو حکومت علاقائی جماعتوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور قومی جماعتیں ایک طرف کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتی رہ جائیں گی۔ اصغر خان نے جرنیلوں سے کہا کہ اگر وہ پیپلز پارٹی کو خلیج میں پھنسا کر رکھنا چاہتے ہیں تو حکومت کی درخواست پر وہ

نئی صورتحال کے انتظامات کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ تحریک استقلال کے سربراہ نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ بھٹو کو گرفتار کر لیا جائے کہ وہ اور ان کی پارٹی کے کارکن بہت سی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور ضروری ہے کہ ان سے باز پرس کی جائے۔ اصغر خان کے مطابق فوجی کونسل کو بھٹو کی گرفتاری سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے، اس کے بجائے انہیں ان کے غنڈوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

اس سے پہلے نامور وکیل اور سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر نے ایک نہایت سادہ سا فارمولہ تجویز کیا۔ ان کا خیال تھا کہ بدنام سیاست دانوں کو ایوب خان کے الیکٹیو باڈیز ڈسکوالیفکیشن آرڈر (ای بی ڈو) کے ذریعے نااہل قرار دے دینا چاہیے۔ ایس ایم ظفر نے دلیل دی کہ اقتدار مضبوط پارٹی کو منتقل کیا جانا چاہیے اور بھٹو کو عدالتی مقدمات کے ذریعے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

الیکشن سیل سے رابطہ کرنے والے تیسرے سیاست دان جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد تھے۔ انہوں نے دلیل دی کہ مارشل لا حکام نے اپنی کارروائی کے ذریعے بھٹو کی پوزیشن کو مضبوط کر دیا ہے۔ صحافی اور مصنف اظہر سہیل کے مطابق غلام مصطفیٰ کھر جو پنجاب میں پیپلز پارٹی کا فخر کا سمجھے جاتے تھے، وہاں موجود تھے، انہوں نے پچیس اگست کو غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھ اس سیل سے ملاقات کی تھی۔ انہی دنوں مارشل لا حکومت کی ایما پر سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمات تلاش کرنے کا آغاز ہوا اور بالآخر ریاستی اداروں نے ایک ایسا مقدمہ تلاش کر لیا جس کے شکنجے میں ذوالفقار علی بھٹو کی گردن پھنسا کر بالآخر انہیں تختہ دار دار تک پہنچایا گیا، یہ پیپلز پارٹی کے رہنما احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد قصوری کے قتل کا مقدمہ تھا جنہیں گیارہ نومبر 1974ء کو لاہور میں اس وقت قتل کیا گیا جب وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ایک شادی میں شرکت کے بعد اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔

مارشل لا حکام نے اس مقدمہ کی فائل از سر نو کھول دی۔ ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ بنائے جانے کے وعدے پر بیان دیا کہ یہ قتل ایف ایس ایف کے اہلکاروں نے کیا تھا اور انہیں اس کا حکم خود سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے دیا تھا۔ تین ستمبر 1977 کو بھٹو کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا مگر دس دن بعد تیرہ ستمبر 1977 کو پنجاب ہائی کورٹ کے جج جسٹس کے ایم اے صمدانی نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے کے احکامات جاری کردیئے۔

سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ضمانت پر رہائی جنرل ضیاالحق اور ان کے رفقا کو سخت ناگوار گزری، ان دنوں جنرل اقبال پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے، انہیں اس بات پر جنرل ضیاالحق کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے بھٹو کو رہا کیوں ہونے دیا اور اگر عدالت نے ضمانت منظور کرلی تھی تو انہیں کسی اور مقدمے میں گرفتار کیوں نہیں کرلیا گیا۔

ضمانت پر رہائی کے بعد بھٹو ملتان میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد کراچی پہنچے اور وہاں بھی ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کردیا، مارشل لاحکومت اور فوجی حکام کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہوگیا، اس دفعہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو مارشل لا کے ضابطہ نمبر بارہ کے تحت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، تاکہ کسی اپیل، دلیل اور وکیل کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے اور کوئی عدالت ان کی ضمانت نہ لے سکے، نئی منصوبہ بندی کے تحت ان کی گرفتاری سترہ ستمبر 1977 کو عمل میں لائی گئی، یہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی آخری نظر بندی تھی جو ان کی موت تک مختلف صورتوں سے قید میں تبدیل ہوتی رہی۔

گیارہ اکتوبر 1977 کو پنجاب ہائی کورٹ میں پاکستان کی تاریخ کے اس سب سے اہم مقدمہ قتل کی سماعت کا آغاز ہوا، ذوالفقار علی بھٹو کو نواب احمد خان کے قتل کے الزام میں 18 مارچ 1978 کو سزائے موت سنا دی گئی۔ انہوں نے اس سزا کے خلاف 25 مارچ

1978 کو سپریم کورٹ میں اپیل کی مگر یہ اپیل 6 فروری 1979 کو مسترد ہوگئی۔

بعدازاں سپریم کورٹ نے چوبیس مارچ 1979 کو نظر ثانی کی اپیل بھی مسترد کردی، دنیا بھر کے 54 سربراہان مملکت، بہت سی عالمی تنظیموں اور ملک کے اندر بہت سی نمایاں شخصیات نے صدر ضیاالحق سے رحم کی اپیل کی مگر یکم اپریل 1979 کو صدر مملکت نے ان تمام اپیلوں کو مسترد کر کے بھٹو کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔

تین اپریل 1979 کو محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کی، یہ ملاقات تقریباً چار گھنٹے جاری رہی۔ اسی رات دو بج کر چار منٹ پر ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی میں پھانسی دے دی گئی۔ ان کی میت ایک سی ون تھرٹی طیارے کے ذریعے جیکب آباد پہنچائی گئی جہاں سے اسے ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے گڑھی خدا بخش لے جایا گیا جہاں انہیں خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم باب اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ پاکستان کے سیاسی اور جمہوری حلقوں کا واضح ترین موقف ہے کہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی تمام تر سیاسی غلطیوں اور خطاؤں کے باوجود ان کی پھانسی پاکستانی سیاست کا ایک ایسا المیہ ہے جس نے ہمارے قومی دھارے کا رخ تبدیل کردیا۔ جنرل ضیا سمجھتے تھے کہ قبریں ایک ہیں اور امیدوار دو۔ ان امیدواروں میں سے انہوں نے اپنے آپ کو بچالیا اور بھٹو کو دفنا دیا۔ آج تک بھٹو کی پھانسی متنازع رہی ہے، مگر تجزیہ نگاروں اور تاریخ دانوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ ایک سیاسی پھانسی تھی۔ بھٹو کی موت پر ان جاگیرداروں نے بھی خوشی کا اظہار کیا جن کو بھٹو نے اپنے کارکنوں پر فوقیت دے کر پارٹی ٹکٹ دیے تھے۔ اگر بھٹو سیاسی کارکنوں کو پہلے الیکشن کی طرح اپنے ساتھ ملا کر رکھتے تو وہ ضرور انہیں موت سے بچانے کی کوشش کرتے۔ اس دور کے نوستاروں پر مشتمل سیاسی اتحاد کے رہنماؤں نے جنرل ضیا کی حکومت میں شامل ہو کر اس کیلیے بھٹو کو پھانسی دینا اور آسان بنا دیا۔ ان سیاستدانوں نے اپنے پیٹی بند بھائی کے ساتھ غداری کی

اور جمہوریت کے مخالف کی مجلس شوریٰ میں جوق در جوق شامل ہو گئے۔

بھٹو کی خود اعتمادی اسے لے ڈوبی جس کی وجہ سے اسے آخر تک یہ یقین تھا کہ جنرل ضیا اسے پھانسی نہیں دے سکے گا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ عالمی لیڈر اس کو بچانے کی کوششیں کریں گے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی پارٹی کے کارکن اسے بچانے کیلیے بھرپور تحریک چلائیں گے۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا کہ وہ پھانسی سے نہیں بچ سکے گا تو اپنی بیٹی کی طرح وہ بھی جلاوطنی اختیار کر لیتا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی اولاد نے اسے بچانے کی کوشش کی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

تیسری آمریت

اسلام کے بھی قریب ہے۔ جنرل ضیا نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی خاطر اسلام کا نام

بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاالحق ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بن گئے۔ اقتدار پر قبضے کے بعد ان کی یہی کوشش رہی کہ پیپلز پارٹی کو اقتدار سے دور رکھا جائے اس مقصد کے لیے انہوں نے منصفانہ عام انتخابات سے گریز کیا۔ اور بار بار الیکشن کے وعدے ملتوی کرتے رہے۔ ضیاالحق کے اقتدار سنبھالتے ہی سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ امریکا نے اسے روس کو شکست دینے کے لیے موقع غنیمت جانا اور پاکستان بھی اس جنگ میں شامل ہو گیا۔ افغان جنگ ضیاالحق کے اقتدار کو دوام دینے میں معاون ثابت ہوئی۔

جنرل ضیا نے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر بھی پابندی عائد کر دی۔ 1977 میں وہ ایران کے دورے پر تھے، وہاں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل ضیا نے کہا کہ آئین کیا چیز ہے؟ ایک 12 صفحے کی کتاب ہے، میں جب چاہے اسے پھاڑ کر پھینک سکتا ہوں۔ کیا مجھے ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ہے؟ میں جب سیٹی بجاؤں گا تمام سیاست دان میرے پیچھے دُم ہلاتے ہوئے آ جائیں گے۔

یکم اکتوبر کو جنرل ضیا نے ایک بار پھر قوم سے خطاب کیا اور مجوزہ انتخابات کو تا حکم ثانی ملتوی کر دیا گیا۔ جنرل ضیا نے کلمہ طیبہ کی قسم کھا کر 90 روز میں انتخابات کا وعدہ کیا اور پھر ایک تقریر میں کہا کہ یہ کوئی قرآن کی آیت نہیں ہے کہ انتخابات اکتوبر میں کروائے جائیں، میرے خیال میں پاکستان کے لیے صدارتی نظام حکومت بہترین ہے کیوں کہ یہ اسلام کے بھی قریب ہے۔ جنرل ضیا نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی خاطر اسلام کا نام

استعمال کیا۔ افغانستان میں روس کی مداخلت کے بعد بین الاقوامی سطح پر بھی جنرل ضیا کی تنہائی ختم ہوئی۔ 1978 میں انہوں نے از خود صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ جنرل ضیا نے اپنی حلف برداری کی تقریب کے بعد کہا کہ جوں ہی صدارت کے لیے کوئی موزوں شخصیت ملی تو وہ صدارت چھوڑ دیں گے، بدقسمتی سے جنرل ضیا کو اپنی موت تک منصب صدارت کے لیے کوئی موزوں شخصیت نہ مل سکی۔ جنرل ضیا نے سیاسی جماعتوں کو بھی اقتدار میں شریک کیا مگر یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔

سویلین کابینہ سے بھٹو کی پھانسی کی منظوری لے کر اس فیصلے پر عمل درآمد کروانے کے بعد جنرل ضیا نے انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے سویلین وزراء کو فارغ کر دیا۔ اور پھر انتخابات ملتوی کر کے سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی اور اخبارات پر سنسر شپ نافذ کر دی گئی۔ جنرل ضیا نے ایوب خان کی طرح فوجی عہدہ چھوڑنے کی غلطی نہیں کی، بلکہ صدارت اور فوج کی کمان اپنے پاس رکھی اور وائس چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ تخلیق کیا۔ جنرل ضیا نے فوج میں نماز با جماعت میں شرکت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ تبلیغی جماعت کے ارکان کو اجازت دی کہ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں باقاعدہ درس دیا کریں۔

جنرل ضیا کے خلاف کم از کم دو بار فوج کے اندر سے بغاوت کی کوشش کی گئی، مگر دونوں بار اس کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ افغان جنگ میں پاکستان کے کردار اور جنرل ضیا کی پالیسیوں کی وجہ سے ملک میں منشیات اور اسلحے کی فراوانی ہوگئی اور ملک میں فرقہ ورانہ کشیدگی پیدا ہوئی، یہ جنرل ضیا کی وضع کردہ پالیسیاں ہی تھیں جن کا خمیازہ ملک آج بھگت رہا ہے۔

ان کے دور میں بھارت نے سیاچن پر پاکستانی علاقے پر قبضہ کیا تو جنرل ضیا نے کہا کہ سیاچن پر تو گھاس بھی نہیں اُگتی۔ 8 سال تک بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کے بعد جنرل ضیا نے اپنی صدارت کو جواز دینے کے لیے ریفرنڈم کروایا، اس ریفرنڈم میں سوال تھا کہ کیا پاکستان کے عوام صدر جنرل ضیا الحق کے اس عمل کی تائید کرتے ہیں جو انہوں نے

پاکستان کے قوانین کوقرآن اور سنت رسول ﷺ کے مطابق اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے کے لیےاور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے شروع کیا ہےاور کیا آپ اس عمل کو جاری رکھنےاور اسے مزید استوار کرنے اور اقتدار پُر امن طریقے سے عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔اس سوال کی تشریح یوں ہوئی کہ اگر جواب ہاں میں ہواتو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ جنرل ضیا5 سال کے لیے ملک کے صدر منتخب ہو گئے ہیں۔توقعات کے مطابق جنرل ضیا نے ریفرنڈم میں کام یابی حاصل کر لی،جب کہ پولنگ سٹیشنز سنسان پڑے تھے۔

جنرل ضیا نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات منعقد کروائے جس کے نتیجے میں محمد خان جونیجو ملک کے وزیر اعظم بن گئے۔جنرل ضیا اقتدار میں شراکت کب تک برداشت کرتے۔ 1988 میں انہوں نے جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا، وزیر اعظم جونیجو نے اوجڑی کیمپ کے سانحے کی تحقیقات کروالی تھیں اور خیال کیا جا رہا تھا کہ جونیجو جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل حمید گل کے خلاف سخت ایکشن لینے کا ارادہ رکھتے ہیں اوران کی حکومت کی برطرفی کی یہی وجہ تھی۔جنرل ضیا نے اس موقع پر کہا کہ فوج کو سرپرستوں کی ضرورت ہے،مقدمہ چلانے والوں کی نہیں۔جنرل ضیا کا اقتدار اب ڈولنے لگا تھا،اور پھر وہ ہوا جس کا تصور بھی محال تھا،17 اگست 1988 کو جنرل ضیا کا طیارہ تباہ ہو گیا اور وہ اپنے کئی دیگر فوجی ساتھیوں کے ساتھ جاں بحق ہو گئے۔جنرل ضیا کے دور میں افغان جہاد کے نام پر کروڑوں ڈالرز کی امداد ملی مگر بعد میں آنے والی حکومتوں کو اس امداد کا کوئی حساب نہ مل سکا۔اپنے دور میں انہوں نے مختلف پابندیاں عائد کیں، اسلام کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلتے اور اقتدار کو طول دیتے رہے۔

اسلامی قوانین

عوام میں مقبولیت کے حصول اور امریکہ کے اشارے پر انہوں نے ملک میں

اسلامی دفعات نافذ کیں۔ اس دور میں اسلامی شدت پسندی امریکا کی ایک بہت بڑی ضرورت تھی۔ اسی شدت پسندی کو استعمال کرتے ہوئے سرد جنگ میں کامیابی کو یقینی بنایا گیا اور افغانستان سے روس کا انخلا افغانستان سے ممکن ہوا۔ ضیا الحق نے سرقہ، ڈکیتی، زنا، امتناع شراب، تہمت زنا، اور تازیانے کی سزاؤں سے متعلق حدود آرڈینس اور زکواۃ آرڈینس نافذ کیا، وفاقی شرعی عدالت قائم کی اور قاضی عدالتیں جاری کیں۔

خارجہ پالیسی

ضیا الحق کے دور میں جہاد کو فروغ حاصل ہوا۔ افغانستان جنگ میں پاکستان امریکہ کا اتحادی بنا اور یوں پوری دنیا سے جہادی پاکستان میں جمع ہوئے تاکہ افغانستان سے روس کا قبضہ ختم کرایا جاسکے۔ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ملک کے ایٹمی پروگرام پر ان کے دور میں کوئی سمجھوتہ نہیں گیا گیا اور یہ پروگرام جاری رہا۔ امریکہ کی طرف پاکستان کو فوجی اور اقتصادی امداد بھی دی گئی جس کا فائدہ صرف فوج اور ایک خاص طبقے تک محدود رہا۔ ضیا الحق کا مارشل لا پاکستانی تاریخ کا ایک تاریک دور رہا۔ ملک میں اظہار رائے پر مکمل پابندی لگائی گئی۔ اخبارات سنسر کی زد میں رہے۔ صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان کو کوڑے مارے گئے جبکہ بہت سے صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پابند سلاسل کر کے ان کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ غرض اس مارشل لا نے اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاستدانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کو ترقیاتی فنڈز سے نوازا گیا جس کی وجہ سے سیاست نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کی۔ اور یہی کوٹہ سسٹم آج بھی پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ افغان جنگ کی وجہ سے پاکستان میں ایک طرف اگر شدت پسندی میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف کلاشنکوف کلچر اور منشیات کو بھی

فروغ حاصل ہو جبکہ ملک میں سمگلنگ اور کرپشن جیسی برائیاں بھی عام ہو گئیں۔

جنرل ضیا 17 اگست 1988 کو بہاول پور کے قریب ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان نگران صدر منتخب ہوئے۔ نومبر 1988 کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔ ضیاالحق کی موت کے حوالے سے تحقیقات کا آغاز بھی ہوا لیکن آج تک ان کی موت کے متعلق کوئی حقیقت سامنے نہیں آسکی۔

ضیاالحق کی پالیسیوں نے پاکستان کے مستقبل پر دوررس اثرات مرتب کیے جن میں بیشتر منفی تھے اور وطن عزیز آج بھی ان منفی اثرات سے باہر نہیں آسکا۔ ضیاالحق نے بعض ایسے ظاہری اقدامات کیے جن سے ان کی اسلام اور وطن دوستی مترشح ہوتی ہے اور عام لوگوں میں ان اقدامات کو سراہا بھی گیا۔ مثال کے طور پر صدر بنتے ہی ضیاالحق نے سگریٹ نوشی ترک کر دی عوام کو بچت کی ترغیب دینے کے لیے سائیکل سواری کرنے لگے۔ جنرل ضیا روس کے خلاف امریکہ کی جنگ لڑ کر پاکستان میں خوشحالی لائے۔ قومی لباس شلوار قمیض اور شیروانی کا رواج عام کیا۔ شان و شوکت سے یوم آزادی منانے کی طرح ڈالی۔ اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دور میں مہنگائی قابو میں رہی۔ مسجد مکتب سکولوں کی بنیاد ڈالی گئی۔ بطور حکمران سب سے زیادہ عمرے کیے اور حکمرانی کا دور عبادت میں گزارا۔ بظاہر کوئی کرپشن نہیں کی اور اقربا پروری سے اجتناب کیا۔ ایٹمی پروگرام جاری رکھا۔ فلمی صنعت اور ٹی وی پر بے حیائی کو کنٹرول کیا۔ ولی خان فیملی پر غداری کا مقدمہ ختم کیا اور انہیں رہائی دلائی اور دفاتر میں نماز کا وقفہ متعارف کرایا۔

اگر ضیاالحق کے منفی اقدامات کی بات ہو تو انہوں نے بھٹو کا سیاسی قتل کیا۔ نوے دن میں انتخابات کرانے کے وعدے سے مکر گئے۔ ملک میں کلاشنکوف کلچر متعارف کرایا۔ سپاہ صحابہ جیسی شدت پسند دہشت گرد تنظیموں کی آبیاری کی۔ ایم کیو ایم کی بنیاد ڈال کر کراچی

سے پی پی پی اور اسلامی جماعت کا صفایا کیا اور روشنیوں کے شہر کی تباہی کا موجب بنے۔ افغان جہاد کے نتیجے میں ملک میں ہیروئن عام ہوگئی۔ پاکستان کو لاکھوں افغان پناہ گزینوں کا تحفہ دیا اوجڑی کیمپ کے حادثے کے محرکات کو دبا دیا اپنے ساتھی جرنیلوں کی کرپشن پر آنکھیں بند رکھیں۔ گیارہ سال میں پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں کر سکے۔

جونیجو حکومت ختم کی۔ پی سی او کے تحت ججوں سے حلف لیا اور کئی جج فارغ کیے۔ میڈیا پر پابندیاں لگائیں۔ اسلام کے نام پر روس کی جنگ امریکہ کے لیے لڑی۔ امریکہ کے سٹنگر میزائلوں سے روس کو شکست دے کر اسے اسلام کی فتح قرار دیا۔ اسلامی بینکاری کا فراڈ رچایا جبکہ مستقبل کی توانائی کی ضروریات کیلیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

اگر ہم ان کی اچھائیوں اور برائیوں کا موازنہ کریں تو جنرل ضیا کی نوے فیصد اچھائیاں صرف ان کی ذات کی حد تک محدود تھیں جن کا قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر چند روز سائیکل پر دفتر جانا، شلوار قمیض اور شیروانی پہننا، دکھاوے کی عبادت کرنا، یوم آزادی منانا، اسلامی بینکاری اور دفاتر میں نماز کا وقفہ سب دکھاوے تھے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف روس کی جنگ کے خلاف امریکہ کو مجاہد مہیا کرنا تھا۔ جونہی روس کو شکست ہوئی افغانستان داخلی انتشار کا شکار ہو گیا تو وہی مجاہد دہشت گرد کہلائے۔

جنرل ضیا نے ملک کو گیارہ سال تک جمہوریت سے دور رکھ کر بہت بڑا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ انہوں نے اسلام کے نام پر قوم سے فراڈ کیا اور اسلام کو اپنے گیارہ سالہ دور اقتدار میں بھی مکمل نافذ نہ کر کے اسے ایک مشکل مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جنرل ضیا نے نسلی امتیاز کی بنیاد پر ایم کیو ایم کی بنیاد ڈالی جو آنے والے سالوں میں کراچی کو قتل و غارت کا شہر بنانے کا جواز بنی۔ اس جماعت نے کراچی میں تین عشروں تک خون کی ہولی کھیلی جس میں ہزاروں افراد کی جانیں گئیں۔ ضیاالحق نے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کے لیے ایم کیو ایم کی پرورش کی تھی۔ وہ خود تو دنیا میں نہ رہے مگر ان کا

لگایا یہ پودا ملک کے لیے وبال جان بن گیا۔

اسی طرح ضیاالحق کے دور حکومت میں فرقہ وارایت کو بھی ہوا ملی اور سپاہ صحابہ جیسی تشدد پسند مذہبی جماعت نے جنم لیا۔ ضیاالحق نے اس جماعت کی آبیاری کی جس کے نتیجے میں یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے کہ الٹا ریاست کے لیے ہی خطرہ بن گئے۔ انہوں نے ملک میں نہ تو کوئی صنعت لگائی اور نہ ہی ذرائع آمدورفت بہتر بنائے۔ ضیا نے مستقبل کی بجلی کی ضرورتوں کو دھیان میں نہیں رکھا اور کوئی بڑا منصوبہ شروع نہ کیا۔ قصہ مختصر انہوں نے بھی اپنے پیشرو جنرل ایوب خان کی طرح سی آئی اے کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا اور افغانستان کی جنگ کی آڑ میں گیارہ سال تک پاکستان پر آمریت مسلط کیے رکھی۔ انہوں نے ملک کے قیمتی گیارہ سال ضائع کیے اور صرف اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے جنرل مشرف کی طرح دوسروں کی جنگ لڑ کر ملک کو دہشت گردی کی آماجگاہ بنا دیا۔ یہ جنرل ضیا کی باقیات ہی ہیں جن کے تسلسل نے اس وقت ملک کو کرپٹ، غیر محفوظ اور بنانا ریپبلک بنا کے رکھ دیا ہے۔

اقتدار کی میوزیکل چیئر

ضیاالحق کی طیارے کے حادثے میں ہلاکت کے بعد سے مشرف کے طیارے کی آمد کے بیچ 11 سالہ وقفے میں پانچ جمہوری حکومتیں تبدیل ہوئیں۔کبھی کرپشن تو کبھی وسیع تر قومی مفاد کے بہانے حکومت کو فارغ کیا جاتا رہا۔

اس دوران افغانستان میں روس کے خلاف جنگ تو ختم ہو چکی تھی لیکن اس جنگ کے ملبے سے جو عفریت برآمد ہوئے ان کے اثرات ابھی باقی تھے۔جنگ کے بعد امریکی اپنی امداد سمیت فرار ہو چکے تھے اور پاکستان کے پاس صرف بیرونی قرضے اور تربیت یافتہ جنگجو چھوڑ گئے تھے۔جنگ کے خاتمے تک حساس ادارے اور فوج اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ ان کو نکیل ڈالنا اب کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

بینظیر بھٹو کا پہلا دور حکومت:1990-1988

ضیا کی ہلاکت کے بعد جونیجو صاحب نے عدالت عظمیٰ سے درخواست کی کہ ان کی حکومت بحال کی جائے کیونکہ اسے غیر قانونی طریقے سے ہٹایا گیا تھا۔اس اثنا میں فوج کے سربراہ اسلم بیگ نے یہ بیان دیا کہ اگر سپریم کورٹ کے ججوں نے جونیجو حکومت کو بحال کیا تو اس فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

معاملہ بہرحال زیادہ آگے نہیں بڑھا اور عدالت نے تازہ انتخابات کا حکم دیا (اسلم بیگ صاحب کو سپریم کورٹ نے سنہ 1994ء میں توہین عدالت کے الزام میں طلب

کیا تو انہوں نے عدالت میں جواب دیا کہ میں اس عدالت کے آگے جواب دہ نہیں ہوں)۔انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لیے قومی شناختی کارڈ ہونا لازم قرار دیا گیا، جو دراصل پیپلز پارٹی کو طاقت میں آنے سے روکنے کی کوشش تھی۔

اسی طرح حسین حقانی کے زیرِ نگرانی نصرت بھٹو اور بینظیر بھٹو کے خلاف بدنامی کی مہم شروع کی گئی اور انکی تصاویر کو مسخ کر کے پمفلٹ جہاز کے ذریعے بڑے شہروں پر گرائے گئے۔اسی طرح پیپلز پارٹی کو اسکے روایتی انتخابی نشان یعنی تلوار سے محروم کر دیا گیا اور تیر کا نشان عطا کیا گیا۔اپوزیشن میں جنرل حمید گل کی بنائی جماعت 'اسلامی جمہوی اتحاد' دراصل ذوالفقار علی بھٹو مخالف 'پاکستان نیشنل اتحاد' کا ایک نیا روپ تھی۔

ان تمام اقدامات کے باوجود بینظیر بھٹو کی جماعت وفاقی انتخابات میں کامیاب ٹھہری۔ان انتخابات میں حیران کن طور پر 54 آزاد امیدوار قومی اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہوئے (یا کروائے گئے)۔ضیاء دور کے ایک قانون کے مطابق صدر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مقننہ کے کسی بھی رکن کو وزیراعظم کے عہدے کے لیے نامزد کر سکتا ہے البتہ اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینا بھی ضروری ٹھہرایا گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی 207 نشستوں میں سے 93 پر کامیابی حاصل کی جبکہ اسلامی جمہوری اتحاد 55 نشستوں پر کامیاب رہا۔ اتحاد کے سربراہ نواز شریف نے انتخابات سے اگلے روز حکومت بنانے کا اعلان کیا۔اقتداری اونٹ کی کروٹ کا فیصلہ صدر غلام اسحاق خان کے ہاتھ میں تھا۔بالآخر صدر صاحب نے محترمہ بینظیر کی جماعت کو اس شرط پر اقتدار منتقل کیا کہ وہ صدارتی انتخابات میں غلام اسحاق خان کو ووٹ دیں گے۔صدارتی انتخاب میں پیپلز پارٹی ارکان نے ایم آر ڈی (MRD) تحریک کے دوران اپنے حلیف نوابزادہ نصراللہ خان پر اسحاق خان کو فوقیت دی۔

غلام اسحاق خان پاکستانی افسر شاہی کے نشیب و فراز سے گزر کر اقتدار کے ایوان

تک پہنچے تھے۔ایوب خان کے دور میں وہ واپڈا کے محکمے میں تعینات کیے گئے، بعدازاں انہیں وزارت مالیات اور بینک دولت پاکستان میں اعلیٰ درجے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

1950 کی دہائی میں جو کردار سکندر مرزا کو ملا 1980 کے عشرے میں اسی نوعیت کے کچھ کام غلام اسحاق خان کے سپرد ہوئے تھے۔جن ملکوں میں عوامی تائید کے بغیر حکمرانی کا طور جڑ پکڑ لے وہاں ایک نہ ایک ایسا کردار پیدا ہو جاتا ہے جسے سدا بہار سمجھا جاتا ہے۔ اقتدار جس روپ میں بھی رونمائی دے، یہ کسی خوشنما تِل کی صورت رخِ انور کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔روس میں یہ اعزاز گریمکو کو حاصل تھا۔ پاکستان میں یہ منصب غلام اسحاق خان کو ملا۔

بینظیر بھٹو کو پہلی حکومت کے دوران 'مقتدر حلقوں' کی جانب سے مطلع کر دیا گیا تھا کہ دفاع اور خارجی معاملات، خصوصی طور پر پاکستان کے جوہری پروگرام میں مداخلت نہ کی جائے، اور انہی شرائط پر اقتدار منتقل کیا گیا۔جب اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو ان کی حکومت کو دو ہی سال میں صدر کے ذریعے فارغ کروا دیا گیا۔بینظیر صاحبہ نے اپنے دور حکومت میں چند اعلیٰ فوجی افسروں کی تقرری اور معطلی کروانا چاہی لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہیں۔اس دور حکومت میں پنجاب اور بلوچستان میں اپوزیشن کی جماعتیں برسر اقتدار تھیں اور ان حکومتوں کو برطرف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔پنجاب میں اپنی وزارت خطرے میں دیکھ کر نواز شریف اسمبلی کے آزاد نمائندوں اور اپنی جماعت کے چند افراد کو چھانگا مانگا لے گئے تھے اور ان سے وفاداری کا حلف لیا گیا تھا۔وزارت عظمیٰ حاصل کرنے کے بعد اپنی پہلی پریس کانفرنس میں بینظیر نے نواز شریف کو پنجاب کا جی ایم سید قرار دیا۔انہوں نے پنجاب کی صوبائی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کیلئے اپنی جماعت کے سیکرٹری جنرل ٹکا خان کو صوبائی گورنر کا عہدہ عطا کیا۔

1989ء میں اندرون سندھ کے حالات بہت کشیدہ ہو چکے تھے اور امن وامان

کی بگڑتی صورت حال کی ایک وجہ جی ایم سید کی 'سندھو دیش' تحریک تھی۔ جی ایم سید کے پیروکاروں نے سندھ کے مختلف مقامات پر ہنگامہ برپا کیا اور ایک موقعے پر سکھر ائیر پورٹ پر قبضہ کرلیا۔ اسی دوران ممتاز بھٹو کی سربراہی میں سرائیکی صوبے کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ امن وامان پر قابو پانے کے لیے فوج کی مداخلت ضروری ہوگئی اور وزیراعظم کے احکامات پر فوج نے صوبے میں آپریشن شروع کیا۔ یہ سویلین حکومت کے دور میں صوبہ سندھ میں ہونے والا پہلا فوجی آپریشن تھا۔

اسمبلی میں واضح برتری نہ ہونے کے باعث پیپلز پارٹی حکومت مسلسل خطروں کا شکار رہی۔ اسمبلی کی تشکیل کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنے کا شوشہ اٹھا۔ مرکز میں حکمران جماعت کی حلیف عوامی نیشنل پارٹی اور مہاجر قومی موومنٹ نے پیپلز پارٹی سے قطع تعلقی اختیار کرلی۔ قرارداد عدم اعتماد سے قبل اپنی جماعت کے ارکان اسمبلی کو محلاتی سازشوں سے دور کرنے کیلئے محترمہ نے پاک فضائیہ کے طیاروں میں اپنے ایک سو ارکان اسمبلی کو سوات اور مینگورہ بھیج دیا۔ قرارداد عدم اعتماد کامیاب نہ ہوسکی اور حکومت کو اس معرکے میں فتح حاصل ہوئی۔

1990ء میں صوبہ سندھ میں حالات نازک موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ پیپلز پارٹی کے طلبا ونگ اور مہاجر قومی موومنٹ کے کارکنان کے درمیان اغوا کنندگان کے تبادلے چل رہے تھے۔ بینظیر بھٹو نے سنہ 1988ء میں حکومت ملتے ہی فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے سینکڑوں سیاسی کارکنان کو رہا کردیا تھا۔ ان اسیران میں سبھی بے قصور نہیں تھے اور ان کی رہائی کے باعث امن وامان کی صورت حال خراب ہوئی۔ وزیراعظم نے فوج کو طلب کرنے سے اجتناب کیا کیونکہ وہ اپنے بنیادی حلقے میں فوج کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔

مئی 1990ء میں سندھ حکومت نے حیدرآباد میں کرفیو نافذ کردیا۔ حیدرآباد پکا

قلعے سے خواتین اور مرد قرآن اٹھائے نکل پڑے۔ پولیس نے ان پر گولی چلا دی اور فسادات کے نتیجے میں ستر افراد مارے گئے۔ پولیس کے مطابق ان افراد کے عقب میں بندوقیں والے لوگ موجود تھے جبکہ مہاجر قومی موومنٹ کے مطابق نہتی عورتوں پر گولی چلائی گئی۔ اس واقعے کے ردعمل میں کراچی میں بھی فساد پھیلا اور دوسو سے زیادہ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی موقع پر صدر نے فوج کو طلب کیا۔

حکومتی سطح پر کرپشن بھی بہت بڑھ گئی اور کروڑوں روپے کے قرضے لے کر حکومتی وزرا اور انکے رشتہ داروں کو نوازا گیا۔ بینظیر صاحبہ نے اپنی والدہ نصرت بھٹو کو بے محکمہ وزیر جبکہ اپنے سسر حاکم علی زرداری کو اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا۔ سیاسی مخالفین کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کا رواج بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ ایک موقع پر شریف خاندان کی اتفاق فاونڈری کو نقصان پہنچانے کے لیے پاکستان ریلوے کو حکم دیا گیا کہ سکریپ کراچی سے لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔

اس نقصان کے باعث اتفاق فاؤنڈری کو تین ہزار کے قریب ملازم فارغ کرنا پڑے۔ صدر غلام اسحاق خان نے حکومت بننے کے بیس ماہ بعد اسے کرپشن، اقربا پروری، نا اہلی، عدلیہ اور سینیٹ کی توہین کے الزام میں آٹھویں ترمیم کے تحت برطرف کر دیا۔ جوہری پروگرام کے متعلق سخت بیانات دینے پر حساس ادارے کے سربراہ حمید گل نے بینظیر حکومت کے خاتمے کے لیے 1989ء میں ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے دفتر واقع مانسہرہ میں نواز شریف اور اسامہ بن لادن کی ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ منصوبہ پایہء تکمیل تک نہ پہنچ پایا اور اس سے پہلے ہی حکومت کی چھٹی کرا دی گئی۔ صدر مملکت کی جانب سے بینظیر بھٹو کے خلاف کرپشن کے چھ ریفرنس دائر کیے گئے۔

پہلا ریفرنس خفیہ فنڈ میں خورد برد سے متعلق تھا۔ اس ریفرنس میں دی گئی معلومات کے مطابق بینظیر بھٹو نے دو کروڑ روپے اپنے آپ کو دیے، تین کروڑ نصیر اللہ بابر،

ایک کروڑ ملک وارث، ڈیڑھ کروڑ آفتاب شیر پاؤ، ایک کروڑ حنیف خان، چالیس لاکھ محب اللہ شاہ اور چھبیس لاکھ ناہید خان کو دیے گئے۔

دوسرے ریفرنس کے مطابق اسلام آباد میں 287 ایکڑ زمین ایک جعلی کمپنی کو ہوٹل بنانے کی مد میں دی گئی۔

تیسرا ریفرنس مرکزی حکومت کے خلاف پاک فضائیہ کے جہاز استعمال کرنے سے متعلق تھا، ان جہازوں پر صوبائی اسمبلی کے ارکان سوار تھے جن کو قرارداد عدم اعتماد کے لیے خریدا گیا تھا۔

چوتھا ریفرنس ایل پی جی (LPG) گیس کے لائسنس اپنے قریبی دوستوں اور رشتے داروں کو دینے سے متعلق تھا۔

پانچواں ریفرنس خام روئی کے معاہدے کے بارے میں تھا جس کی بدولت سرکاری خزانے کو دس کروڑ روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا۔

چھٹا ریفرنس دوسو کروڑ ڈالر کے قرضوں کی خورد برد کے بارے میں تھا جو اصل میں KESC کو مشاورت دینے کی مد میں حاصل کیے گئے تھے۔

6 اگست 1990ء کو صدر غلام اسحاق خان نے قومی اسمبلی کو برطرف کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس حکم نامے کو لاہور ہائی کورٹ اور سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا لیکن دونوں عدالتوں نے صدر کے حق میں فیصلہ دیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں استدعا کی گئی لیکن ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے بھی فیصلہ برقرار رکھا۔

پہلا نواز دور 1990-1993

1990ء کے الیکشن میں اسلامی جمہوری اتحاد نے واضح برتری حاصل کی اور حکومت تشکیل دی۔ ان انتخابات سے پہلے حساس اداروں نے مختلف سیاست دانوں میں

کروڑوں روپے تقسیم کیے جن کی تفصیل سپریم کورٹ کے مہران بنک کیس والے فیصلے میں موجود ہے۔اس بندر بانٹ کا آغاز جنرل اسلم بیگ کے ذریعے ہوا جن کی ہدایات پر بینکار یونس حبیب نے 14 کروڑ روپے ایک فوجی اکاؤنٹ میں جمع کروائے۔اس رقم میں سے چھ کروڑ صدر غلام اسحاق خان کے الیکشن سیل کو دیے گئے اور آٹھ کروڑ آئی ایس آئی کے اکاؤنٹ میں چلے گئے۔جن حضرات کو یہ پیسے فراہم کیے گئے،ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، جاوید ہاشمی،سرتاج عزیز،محمد خان جونیجو، پیر پگاڑا، عابدہ حسین،آفتاب شیر پاؤ اور انور سیف اللہ کے نام شامل تھے۔یاد رہے کہ خفیہ اداروں کے ذریعے سیاست دانوں کو انتخابات کے لیے نوازے جانے کی رسم بھٹو صاحب کے دور میں شروع ہوئی اور پہلی دفعہ یہ حربہ 1977ء کے انتخابات میں آزمایا گیا تھا۔قومی اسمبلی کے انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد نے 206 میں سے 105 نشستیں جیتیں جبکہ پیپلز پارٹی اور اسکی حلیف جماعتیں محض 45 نشستوں پر کامیابی حاصل کر سکیں۔

پنجاب میں اتحاد نے واضح کامیابی حاصل کی اور غلام حیدر وائیں کو وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔سرحد میں اسلامی جمہوری اتحاد نے عوامی نیشنل پارٹی کے تعاون سے حکومت قائم کی اور میر محمد افضل وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے۔سندھ میں پاکستان جمہوری اتحاد (جس میں پیپلز پارٹی اور اسکی اتحادی جماعتیں شامل تھیں) نے سب سے زیادہ نشستیں جیتیں لیکن جام صادق علی کی 'سیاست' کے باعث حکومت اسلامی جمہوری اتحاد اور مہاجر قومی موومنٹ نے قائم کی۔مسلم لیگ نواز (اور اس سے قبل اسلامی جمہوری اتحاد) کے قائد نواز شریف اور انکے خاندان کا سیاست میں داخلہ 80ء کی دہائی کے آغاز میں پنجاب کے فوجی گورنر جنرل غلام جیلانی کے ذریعے ہوا تھا۔

بھٹو کی صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی کے ہاتھوں ذلیل ہونے والے میاں محمد شریف کے لیے ضیاالحق کی آمد ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ضیاء کے نافذ کردہ گورنر

کو جب لاہور میں گھر بنانے کا موقع ملا تو میاں محمد شریف نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔اس گھر کی تعمیر کے دوران ہی جنرل صاحب کی ملاقات میاں شریف کے ایک صاحب زادے سے ہوئی، جس نے جنرل صاحب کو بہت متاثر کیا۔جب پنجاب میں سویلین کابینہ بنانے کا وقت آیا تو بڑے میاں صاحب نے اپنے فرزند کے لیے سفارش کی۔ جنرل صاحب کی طرف سے میاں شریف کے بیٹے شہباز کو وزیر خزانہ بنانے کا حکم جاری کیا۔اس پر میاں شریف بہت سٹپٹائے کیونکہ انھوں نے تو دراصل اپنے بیٹے نواز کے لیے سفارش کی تھی اور شہباز نے تو کاروبار سنبھالا ہوا تھا۔بہرحال میاں صاحب کی کوشش رنگ لائی اور نواز شریف نے صوبائی وزیر خزانہ کا عہدہ سنبھالا۔نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں صدر اور وزیر اعظم کے مابین چپقلش جاری رہی اور تنازعے کی وجہ ایک بار پھر فوج اور اس کے سربراہ کی تقرری تھی۔پہلی خلیجی جنگ میں الٹے سیدھے بیانات اور مشورے دینے کے باعث نواز شریف نے جنرل حمید گل اور اسلم بیگ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ سے تین ماہ قبل ہی انکے جانشین کا اعلان کر دیا گیا جو اسلم بیگ کی خواہشات کے مخالف تھا۔اسی طرح حمید گل کو کور کمانڈر کی جگہ واہ کینٹ میں اسلحہ خانے کی سربراہی کی پیشکش کی گئی جو انہوں نے ٹھکرا دی اور ریٹائرمنٹ لے کر گھر چلے گئے۔نواز شریف نے کچھ عرصے بعد فوج کے چنگل سے آزادی کی کوشش کی تو ان کے پر کاٹنے کا ارادہ ہو چکا تھا۔اس ضمن میں چوہدری نثار اور بریگیڈیر امتیاز عرف بلاّ نے جنرل آصف نواز کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔آصف نواز کی حادثاتی وفات کے بعد صدر غلام اسحاق خان نے وزیر اعظم نواز شریف کی خواہش کے برعکس جنرل وحید کاکڑ کا بطور آرمی چیف تقرر کیا۔نواز شریف لیفٹیننٹ جنرل اشرف کو آرمی چیف بنانا چاہتے تھے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔

جواب میں نواز شریف نے آٹھویں ترمیم کے خاتمے کی صدا سینٹ میں بلند کی۔

وزیراعظم کے اس اقدام پر اسحاق خان خوب تلملائے اور انہوں نے بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا، ان کے خلاف مقدمات ختم کروائے اور اسمبلی کے چنیدہ ممبران کو استعفے جمع کرانے کا اشارہ دیا۔ 17 اپریل 1993ء کو وزیراعظم نے قوم سے ایک جذباتی خطاب کے دوران یہ عہد کیا کہ وہ اسمبلی برخاست نہیں کریں گے، اور استعفیٰ بھی نہیں دیں گے۔

اگلے ہی روز صدر نے شریف الدین پیرزادہ سے مشورہ کرنے کے بعد کرپشن، اقربا پروری اور نااہلی کے الزام کے تحت نواز حکومت برخاست کر دی اور بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم مقرر کیا۔ نگران حکومت بینظیر بھٹو کی مرضی سے تشکیل دی گئی اور اس میں ان کے شوہر آصف زرداری بھی شامل تھے۔ ایک موقع پر نگران کابینہ میں تریسٹھ (63) وزیر موجود تھے۔ اس دوران نواز شریف نے اپنی برطرفی کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل جمع کروائی اور سپریم کورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا (صرف ایک جج، جسٹس سجاد علی شاہ نے فیصلے سے اختلاف کیا)۔ حکومتی دھینگا مشتی کے دوران پنجاب میں منظور وٹو نے غلام حیدر وائیں کی جگہ وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا۔

وفاقی حکومت کی بحالی پر نواز شریف نے پرویز الٰہی کو وزارت اعلیٰ سونپنے کا فیصلہ کیا۔ وٹو صاحب نے گورنر کو مشورہ دیا کہ پنجاب حکومت برخواست کر دی جائے جبکہ ارکان اسمبلی نے وزیراعلیٰ کے خلاف قرارداد عدم اعتماد کی کارروائی شروع کرنے کا نوٹس گورنر کو بھیج دیا۔ گورنر نے وزیراعلیٰ کے مشورے کی بنیاد پر اسمبلی کو معطل قرار دیا۔ پرویز الٰہی نے گورنر کے اس فیصلے کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے گورنر کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے پنجاب اسمبلی کی بحالی کا حکم جاری کیا۔

وزیراعلیٰ وٹو نے عدالت کا حکم نامہ جاری ہونے کے کچھ گھنٹے بعد ہی دوبارہ گورنر الطاف حسین کو پنجاب اسمبلی برخاست کرنے کی سفارش بھیج دی جو انہوں نے منظور کر لی۔ اس صورت حال کے پیش نظر وفاقی حکومت نے آئین کی شق 234 کے تحت صوبے کا

اختیار سنبھالنے کا حکم جاری کیا۔ وفاق کی جانب سے صوبے کا اختیار سنبھالنے کے لیے ایک نمائندہ مقرر کیا گیا اور رینجرز کو حکم دیا گیا کہ گورنر اور صوبائی پولیس کو بے دخل کر دیا جائے۔

صدر اسحاق نے اس حکم کی آئینی حیثیت ماننے سے انکار کیا اور گورنر کو حکم دیا کہ وفاق کی کاروائیوں کے خلاف مزاحمت کی جائے۔ سرحد اسمبلی میں بھی اسی طرز کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ فوج نے اب کھلم کھلا میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کور کمانڈروں کے اجلاس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ وزیر اعظم اور صدر کو فارغ کیا جائے اور دوبارہ انتخابات کروائے جائیں۔ 18 جولائی 1993ء کو صدر اور وزیر اعظم نے استعفیٰ دیا اور سینٹ کے سربراہ وسیم سجاد نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھالا جبکہ اکتوبر 93ء میں قائم مقام حکومت کی زیر نگرانی نئے انتخابات کروائے گئے۔

نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں پرانے اسباق دہرائے گئے۔ آصف زرداری کو مسلسل جیل کاٹنا پڑی، نجکاری کی لہر کے تلے بہت سی بے ضابطگیاں بھی بہہ گئیں اور قریبی رفقاء کو خوب نوازا گیا۔ صوبوں کے بیچ پانی اور مال (نیشنل فنانس کمیشن) کے معاہدوں میں ایسے وعدے کیے گئے جن کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں پانچ ارب ڈالر ضائع کیے گئے۔ سکریپ پر لگنے والا ٹیکس کم کر دیا گیا۔ باہمی تعاون پر مبنی کمپنیوں (کوآپریٹو فنانس کارپوریشنز) کے زوال کے باعث لاکھوں لوگ متاثر ہوئے اور نواز حکومت کی ساکھ میں کمی آئی۔ اسی دور میں آغا حسن عابدی کے قائم کردہ بینک بی سی سی آئی کی بے ضابطگی کی داستان سامنے آئی اور اسے زبردستی بند کر دیا گیا۔ اس بینک کو امریکی سی آئی اے نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور افغان جنگ ختم ہوتے ہی بینک کے خلاف شواہد اور ثبوت ملنے شروع ہو گئے۔ نواز حکومت نے ایک قانون پاس کیا جس کے تحت نظریہ پاکستان کے خلاف بات کرنے پر دس سال قید کی سزا مقرر کی گئی اور توہین رسالت کے قانون میں ترمیم کر کے قید کی جگہ موت کی سزا معین کی گئی۔ اسی دور میں پہلی

مرتبہ شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ مقرر کیا گیا۔ پنجاب میں امن وامان کی صورت حال سے نمٹنے کیلئے آئین میں بارہویں ترمیم کے تحت دہشتگردی سے نبٹنے کی خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ پہلے نواز دور میں اخبارات اور ان کے کارکنان کو سخت حالات دیکھنا پڑے۔

دی نیوز کے کامران خان پر ان کے دفتر کے باہر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ شیری رحمان کو مسلسل ہراساں کیا گیا اور جیل کی سیر بھی کروائی گئی۔ ظفر عباس، غلام حسین اور شاہین صہبائی کے بیٹوں کو مار پیٹ کا نشانہ بنایا گیا۔ مہاجر جماعت کے بارے میں لکھنے کے باعث ظفر عباس کے گھر پر مسلح افراد نے حملہ کیا اور اہلخانہ کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ تکبیر کے مدیر صلاح الدین کے دفتر میں توڑ پھوڑ کی گئی اور ایک موقعے پر انکے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح ایک بار ہیرالڈ اخبار کی کاپیاں جلا دی گئیں۔

سندھ میں امن امان کی صورت حال کو فوج کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا اور کراچی میں فوج نے مہاجر قومی موومنٹ کے خلاف آپریشن کیا۔ اسی دوران ایم کیو ایم حقیقی بھی سامنے آ گئی۔ جون 1991 میں فوج کے میجر کلیم الدین کو مہاجر قومی موومنٹ کے افراد نے چند ساتھیوں سمیت اغوا کرلیا۔ اس واقعے کے بعد 1992 میں فوج نے کراچی میں آپریشن کیا اور اس واقعے کی ایف آئی آر میں ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین کو نامزد کیا گیا تھا۔ نواز حکومت کے اس دور میں آئی ایس آئی کے سربراہ جاوید ناصر (جنہیں بریگیڈیر امتیاز کی سفارش پر ترقی دی گئی تھی) نے بوسنیا، چین، فلپائن اور وسطی ایشائی ممالک میں لڑنے والے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ بھیجا اور ان تحریکوں کی مدد کی۔

نجکاری کے نام پر میاں منشاء کی قسمت کھل گئی اور نجکاری والے آدھے سے زیادہ یونٹ میاں منشاء کو نوازے گئے۔ مسلم کمرشل بینک کی نجکاری کے موقعے پر سب سے زیادہ بولی لگانے والے کو بوگس بنیادوں پر مسترد کر دیا گیا اور بارہ افراد کی ٹولی کو بینک نواز دیا گیا جس میں میاں منشا بھی شامل تھے۔ اس سے قبل نواز شریف کی پنجاب میں حکومت کے

دوران پسرور شوگرمل کوایک روپے کی قیمت پر بیچا گیا تھا۔نجکاری کی اس لہر میں 68 مختلف یونٹوں کی نجکاری کی گئی جن میں سے بیس یونٹ نئے مالکان کی نااہلی کے باعث بند ہو گئے۔ اسلام آباد اور لاہور کے درمیان موٹروے کی تعمیر کا آغاز سنہ 1992ء میں کیا گیا۔

پہلے نواز دور میں پنجاب کو دوسرے صوبوں کے مقابلے میں غیر متناسب توجہ دی گئی اور یہی پہلو اس حکومت کے زوال کا باعث بنا۔وفاقی کابینہ میں وزراء کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے تھا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک برطرف حکومت بحال کی تھی لیکن پنجاب میں لالچ کی وجہ سے نواز شریف نے وفاقی حکومت بھی گنوا دی۔قائم مقام وزیر اعظم معین قریشی نے نوے دن کی حکومت کے دوران ٹیکس دینے والے شہریوں کی فہرست شائع کروائی، بینکوں کے پانچ ہزار قرض نادہندگان کی فہرست شائع کروائی اور زراعتی آمدنی پر (عارضی) ٹیکس نافذ کرنے کا حکم دیا۔

اسی طرح انہوں نے بینک دولت پاکستان، ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کو خودمختاری عطا کی۔انہوں نے وزیر اعظم اور وزراء اعلیٰ سے سرکاری رہائشی پلاٹ عطا کرنے کا اختیار واپس لیا۔اس سے قبل سرکاری پلاٹوں کو سیاسی وفاداری خریدنے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔قائم مقام وزیر اعظم نے پندرہ غیر ضروری وزارتوں اور دس سفارت خانوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔اپنے تمام تر نیک اقدامات کے باوجود معین قریشی حکومت کے آخری دنوں میں اپنے خاندان کے افراد کو مختلف سرکاری عہدوں پر تعیناتی یا ترقی کا تحفہ دیتے گئے۔

بینظیر بھٹو کا دوسرا دور حکومت 1996-1993

اکتوبر 1993ء میں نئے انتخابات منعقد کروائے گئے۔تعداد میں مسلم لیگ سے کم ووٹ حاصل کرنے کے باوجود پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں 86 نشستوں پر کامیابی حاصل کی، جبکہ مسلم لیگ نے 72 نشستوں پر برتری حاصل کی۔صوبائی انتخابات کے نتیجے

میں پیپلز پارٹی اور جونیجو لیگ پر مشتمل اتحاد نے پنجاب میں حکومت قائم کی، صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اور عوامی نیشنل پارٹی کے اتحاد نے حکومت قائم کی، سندھ میں پیپلز پارٹی نے واضح برتری حاصل کی اور بلوچستان میں مسلم لیگ نے عوامی نیشنل پارٹی کے تعاون سے حکومت تشکیل دی۔ پنجاب میں دو سو چالیس میں سے صرف سولہ نشستوں والی جماعت کے راہنما منظور وٹو نے (پیپلز پارٹی کے بھرپور تعاون کے باعث) وزارت اعلیٰ حاصل کی۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے رکن پیر صابر شاہ وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے، بلوچستان میں مسلم لیگ کے ذوالفقار مگسی اور سندھ میں پیپلز پارٹی کے امیدوار سید عبداللہ شاہ وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

نومبر 1993ء میں صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ اصل مقابلہ پیپلز پارٹی کے نامزد کردہ امیدوار فاروق لغاری اور مسلم لیگ کے وسیم سجاد کے مابین تھا۔ فاروق لغاری نے 274 جبکہ وسیم سجاد نے 168 ووٹ حاصل کیے۔

انتخاب کے بعد مقننہ کے مشترکہ اجلاس میں اپنی پہلی تقریر میں صدر مملکت فاروق لغاری نے آٹھویں آئینی ترمیم کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ بینظیر صاحبہ نے ایوان سے خطاب کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ فاروق لغاری کے انتخاب کے باعث آٹھویں ترمیم اگلے پانچ سال کے لیے غیر موثر ہو جائے گی۔ تازہ انتخابات سے قبل مبینہ طور پر بینظیر بھٹو کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ایک اور منصوبہ تیار تھا جس کی ذمہ داری رمزی یوسف نامی دہشت گرد پر ڈالی گئی تھی۔ شریف حکومت کے خاتمے کے ایک ہفتے بعد مبینہ طور پر رمزی یوسف نے دو افراد کے ہمراہ بلاول ہاؤس کا رخ کیا۔ اس آپریشن کے لیے اسلحہ صوبہ سرحد سے خریدا گیا تھا۔ آخری وقت پر رمزی اور اس کے ساتھیوں کو پولیس نے بلاول ہاؤس کے باہر بم رکھتے دیکھ لیا اور وہ لوگ جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ بم رمزی کے ہاتھ میں ہی پھٹ گیا تو اس کے ساتھیوں نے اسے زخمی حالت میں ٹیکسی میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔

1993ء میں سیلاب کے باعث کپاس، چاول اور گنے کی فصلیں شدید متاثر

ہوئیں اور معاشی لحاظ سے پاکستان کی حالت بد سے بدتر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ان حالات میں نئی حکومت کی توجہ معیشت سے زیادہ سیاسی جوڑ توڑ پر مرکوز تھی۔اس دور میں صدر بھی بے نظیر بھٹو کی اپنی جماعت کا تھا اور اس صورت حال کا بھرپور فائدہ مخالفین کو کچلنے میں لگایا گیا۔صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) میں چھانگا مانگا کی یاد تازہ کی گئی اور آزاد امیدواروں کو مسلم لیگ اور عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت گرانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے کارندے پیسوں سے بھرے بریف کیس لیے آزاد ارکان اسمبلی کو ورغلاتے رہے۔گورنر سرحد کی جانب سے وفاق کو رپورٹ بھیجی گئی کہ صوبائی حکومت اپنی خدمات ادا کرنے سے قاصر ہے اور صدر کے حکم پر صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔صدارتی حکم نامے کے مطابق وزیر اعلیٰ اور صوبائی کابینہ کو برخواست کر دیا گیا۔

اس دوران پیپلز پارٹی کو صوبے میں حکومت بنانے کا موقعہ فراہم کیا گیا۔صابر شاہ نے وفاق کے اس اقدام کو عدالت عظمیٰ میں چیلنج کر دیا، البتہ عدالت نے وفاق کے حق میں فیصلہ سنایا۔اس غیر جمہوری اقدام کی ملامت کرنے کے لیے اپوزیشن جماعتوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور ملک گیر ہڑتالیں منعقد کیں۔

انہی دنوں مہران بنک کے صدر یونس حبیب کی گرفتاری اور انکے انکشافات نے ایک نیا پنڈورا بکس کھول دیا۔یونس حبیب کے بیانات میں سے ایک بیان یہ بھی تھا کہ فاروق لغاری نے بنجر زمین مہنگے داموں بینک کو بیچی اور اس سے منافع کمایا تھا۔نواز شریف صحافیوں کی ایک ٹولی سمیت ڈیرہ غازی خان پہنچے اور اس بنجر زمین کا دورہ کیا۔(یاد رہے کہ یونس حبیب مہران بنک سکینڈل کا مرکزی کردار تھے، راز فاش کرنے کے جرم میں انکی اہلیہ کو ستمبر 1995ء میں دن دہاڑے قتل کر دیا گیا تھا)

جواب میں وفاقی حکومت نے نواز دور میں انٹیلی جنس کے سربراہ بریگیڈیر امتیاز کو پہلی بینظیر حکومت کے خلاف سازش تیار کرنے کے جرم میں گرفتار کرنے کا حکم جاری

کیا۔شریف خاندان کے خلاف کھاتے کھولے گئے اور میاں محمد شریف کو حوالات کی سیر کروائی گئی۔نواز شریف صاحب نے بھٹو صاحب کی یاد تازہ کرتے ہوئے ٹرین پر پشاور سے کراچی کا دورہ کیا اور ہر بڑے شہر میں حکومت مخالف تقاریر کیں۔ان کی جماعت کی پکار پر اکتوبر 1994ء میں ملک گیر ہڑتال کی گئی۔

سرحد کے بعد اقتدار پر قبضے کا کھیل پنجاب اسمبلی میں بھی کھیلا گیا۔ستمبر 1995ء میں وفاق کی جانب سے گورنر کو صوبائی حکومت کے اختیارات سنبھالنے کا حکم نامہ جاری کیا گیا۔اس سے قبل وٹو کابینہ کے پندرہ ارکان نے وزیر اعلیٰ پر غیر قانونی اقدامات میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اپنے استعفے پیش کر دیے تھے۔منظور وٹو کے قریبی ساتھیوں کو مستند الزامات کی عدم موجودگی میں گرفتار کیا گیا۔گورنر نے منظور وٹو کو صوبائی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینے کا پیغام دیا لیکن وٹو اس کوشش میں ناکام ٹھہرے،سوانہی کی جماعت کے عارف نکئی کو وزارت اعلیٰ کے منصب پر منتخب کیا گیا۔

پیپلز پارٹی کے ایک رکن اسمبلی کو سینئر وزیر کا عہدہ اور وزیر اعلیٰ جیسے اختیارات سونپ دیے گئے۔منظور وٹو کو خصوصی فنڈ خورد برد کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ 1993ء کے انتخابات میں بینظیر کے بھائی مرتضیٰ بھٹو نے شہید بھٹو جماعت کی جانب سے صوبائی اسمبلی میں ایک نشست جیتی تھی۔مرتضیٰ نے اپنے والد کی وفات کے بعد معمر قذافی اور یاسر عرفات کے تعاون سے الذوالفقار نامی ایک تنظیم قائم کی تھی جس کا مقصد ضیاء الحق کو قتل کرنا اور انکی حکومت ختم کرنا تھا۔اس تنظیم کا سب سے مشہور کارنامہ ایک پاکستانی جہاز اغوا کر کے اسے کابل لے جانا تھا۔بعد ازاں اس تنظیم کو ہندوستانی حکومت سے بھی کچھ مدد ملی لیکن راجہ انور کی یادداشتوں کے مطابق الذوالفقار بری طرح ناکام رہی۔بینظیر بھٹو نے مرتضیٰ کی کامیابی کے بعد اپنی والدہ نصرت بھٹو پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ہی مرتضیٰ کو واپس پاکستان بلایا اور صوبائی نشست جیتنے میں اسکی مدد کی تھی۔مرتضیٰ نے ایک موقع پر تقریر

کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ پیپلز پارٹی وہ جماعت نہیں رہی جو غریبوں اور کسانوں کے نام پر بنائی گئی تھی۔ انہی دنوں بھٹو کی برسی کے موقع پر نصرت بھٹو اور مرتضیٰ نے پیپلز پارٹی کے کارکنان کو گڑھی خدا بخش پہنچنے سے روکنے کیلئے علاقے کے گرد اپنے کارکنان پر مشتمل ایک حصار بنوا دیا۔ بینظیر نے پولیس کو حکم دیا کہ حصار ختم کروایا جائے اور اس کے نتیجے میں ہونے والی جھڑپ میں کچھ کارکنان مارے گئے۔

اپنے گزشتہ تجربات کی روشنی میں بے نظیر نے دوسرے دورِ حکومت میں فوج کو کھلی چھوٹ دی۔ بینظیر کے دوسرے دور کے آغاز میں ہی فوج کے اعلیٰ عہدے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز پر بریگیڈیئر پرویز مشرف کو تعینات کیا گیا۔ مشرف نے کشمیر میں جاری 'جہاد' کو مزید فروغ دینے کے لیے بینظیر بھٹو سے اجازت طلب کی جو دے دی گئی۔

'مجاہدین' کی تلاش میں مشرف جماعت اسلامی اور جمیعت علمائے اسلام کے پاس گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے لشکر طیبہ سے وعدہ کیا کہ انکے تربیتی کیمپوں کے تمام جنگجوؤں کی ذمہ داری اٹھائی جائے گی۔ اسی طرح افغان جنگ کے دوران قائم کردہ دو جماعتوں کو متحد کر کے 'حرکت الانصار' بنائی گئی۔ اندازے کے مطابق اس دور میں پاکستانی فوج ہر ماہ اوسط ساڑھے سات کروڑ ڈالر ان 'مجاہدین' پر خرچ کر رہی تھی۔

عالمی سطح پر پاکستان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا، جنوری 1994ء میں امریکہ کی جانب سے پاکستان کو 'ممکنہ دہشت گرد ممالک' کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ بینظیر بھٹو نے پاکستانی فوجی، اقوام متحدہ کے امن دستوں میں شرکت کرنے کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا اور صومالیہ میں امن قائم کرنے کے لیے پانچ ہزار پاکستانی فوجی تعینات کیے گئے۔ آخر کار ستمبر 1995ء میں امریکی ایوان نمائندگان نے پاکستان پر عائد معاشی پابندیاں کم کرنے کا بل پاس کیا۔ اسی دوران کراچی میں لسانی تنازعے میں اضافے کے باعث فوج کو طلب کیا گیا لیکن دو سال قیام اور دو ہزار لاشوں کے باوجود امن وامان کی صورت حال پر قابو نہ پایا جا سکا اور

1995ء میں وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کی سفارش پر رینجرز کو شہر میں تعینات کیا گیا۔

اکتوبر 1995ء میں فوجی افسروں کی ایک سازش بے نقاب ہوئی جس کے مطابق چند فوجی افسروں نے فوج کی اعلیٰ قیادت، صدر، وزیر اعظم اور کچھ وزراء بشمول آصف علی زرداری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس سازش (آپریشن خلافت) میں فوج کے اعلیٰ افسر بھی ملوث تھے۔ 26 ستمبر 1995ء کو فاٹا سے آنے والے بریگیڈیئر مستنصر باللہ کی گاڑی کو ایک پولیس چیک پوسٹ پر روکا گیا اور اس کی تلاشی کے نتیجے میں کلاشنکوف اور راکٹ لانچر برآمد ہوئے۔ بریگیڈیئر نے رعب جمانے کی کوشش کی اور جی ایچ کیو سے رابطہ کیا لیکن لائن کٹ چکی تھی۔ تحقیقات کے مطابق چھتیس فوجی افسر اور بیس سویلین اس منصوبے کا حصہ تھے اور یہ سب افراد ٹیکسلا سے تعلق رکھنے والے تبلیغی جماعت کے رکن مفتی صوفی اقبال کے مرید تھے۔ صوفی صاحب اکثر کور ہیڈکوارٹر میں درس دیا کرتے تھے۔ ظہیر الاسلام عباسی کا تعلق بھی تبلیغی جماعت سے تھا اور وہ افغانستان کے علاوہ بھارت میں پاکستانی خفیہ اداروں کی جانب سے اپنی خدمات پیش کر چکے تھے۔ انکا منصوبہ تھا کہ کور کمانڈروں کی کانفرنس کے دوران GHQ پر حملہ کر کے کانفرنس کا شرکاء کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ملک میں شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا جائے۔

اس کارروائی کے بعد قوم سے خطاب والی تقریر بھی تیار کی جا چکی تھی جس کے مطابق ملک کو ایک 'پاکستانی سنی مملکت' قرار دیا جانا تھا جہاں 'مکمل اسلامی نظام' نافذ کیا جانا تھا۔ اس تقریر میں موسیقی، فلموں، مانع حمل کی ادویات، سودی کاروبار اور عورتوں کی تصاویر پر پابندی عائد کرنے کا حکم بھی موجود تھا۔ اس منصوبے میں حرکت الجہاد الاسلامی کا سربراہ قاری سیف اللہ اختر بھی شامل تھا جس نے مستنصر باللہ کی گاڑی سے برآمد ہونے والا اسلحہ فاٹا سے خریدا تھا اور جسکی جماعت کے ارکان نے کانفرنس پر حملہ کرنا تھا۔

مشرف حکومت آتے ہی سب سے پہلے اقدامات میں ایک ظہیر الاسلام کو رہا کرنا

بھی تھا۔ قاری سیف اللہ اختر کو 'مقتدر حلقوں' نے وعدہ معاف گواہ کے طور پر استعمال کیا اور بعد ازاں وہ افغانستان میں ملا عمر کا مشیر رہا۔ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد سیف اللہ اختر سعودی عرب فرار ہوا اور 2004ء میں دبئی حکومت نے اسے گرفتار کر کے پاکستان کے حوالے کیا۔ مشرف اور بینظیر پر قاتلانہ حملوں میں اسکا گروہ ملوث پایا گیا تھا۔

1995ء میں واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانے میں تعینات کردہ ملٹری اتاشی بریگیڈیر خالد مقبول جعلی نوٹوں کا کاروبار کرتے پکڑے گئے۔ ان کے تیار کردہ جعلی نوٹ اس قدر اعلیٰ نوعیت کے تھے کہ امریکی محکمہ خزانہ کو سو ڈالر کے نوٹ کا ڈیزائن تبدیل کرنا پڑا۔ خالد مقبول کو پاکستان بھیج دیا گیا، اور مشرف دور میں وہ پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے۔

اس سے قبل 1994ء میں دیر سے تعلق رکھنے والے صوفی محمد نامی ایک مولوی نے سوات اور مالاکنڈ کے علاقوں میں شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ سرکاری دفاتر بند کر دیے گئے، ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا گیا اور ٹریفک روک لی گئی۔ ٹریفک کو بائیں طرف سے دائیں طرف کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ پشاور سے بھیجے گئے جج صاحبان کو محاصرے میں لے لیا گیا اور فسادات کے دوران صوبائی اسمبلی کے رکن بدیع الزمان خان کو قتل کر دیا گیا۔ والیء سوات کے دور حکومت میں سوات کی آبادی چند دیہات پر مشتمل تھی اور ان حالات میں حکمران کے لیے جرم کی کوئی سزا تجویز کرنا سہل تھا۔ 1970ء میں ون یونٹ کے اختتام پر سوات میں جدید قانون کی بنیاد پر عدالتی نظام شروع ہوا تو وہ بزرگان کرام کو سست رفتاری کے باعث پسند نہیں آیا۔ ایسے میں شریعت کے کندھے پر 'فوری انصاف' کی بندوق رکھ کر چلائی گئی جس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

صوفی محمد نے 1989ء میں دیر کے علاقے میدان میں 'تحریک نفاذ شریعت محمدی' نامی جماعت کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کے بیشتر ارکان مختلف مساجد کے ائمہ اور مدارس کے نگہبان تھے۔ اس جماعت کے مختلف ارکان نے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا لیکن

کامیابی حاصل نہ کر سکے۔صوفی محمد نے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر دیر کے حلقے سے صوبائی انتخاب میں شرکت کی لیکن ناکام ٹھہرے۔

سوات پر حملہ کرنے والوں میں اکثریت کا تعلق کوہستان، دیر اور باجوڑ ایجنسی سے تھا۔عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں جماعت اسلامی نے بھرپور کردار ادا کیا اور سوات کے واقعے سے قبل جماعت کی جانب سے بازاروں میں پمفلٹ تقسیم کیے جاتے رہے جن میں شریعت اور 'اسلامی نظام' کے قیام کی خاطر قربانی دینے کا پیغام موجود ہوتا تھا۔حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ فوج کو طلب کرنا پڑا۔مختصر تنازعے کے بعد امن وامان بحال ہوا اور صوفی محمد کو یہ یقین دہانی کروائی گئی کہ ان کے مطالبات پر بتدریج عمل کیا جائے گا۔

بینظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں عدلیہ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا رواج عروج پر پہنچ گیا۔ایک جج کو صرف اس جرم میں برطرف کر دیا گیا کہ انہوں نے نواز شریف کے والد کو ضمانت پر رہا کیا تھا۔حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ پنجاب کی صوبائی حکومت نے نواز شریف پر بغاوت کا مقدمہ درج کروا دیا۔کئی ارکان اسمبلیوں کے رکن ہونے کے باوجود جیل کاٹتے رہے۔جون 1994ء میں جسٹس نسیم حسن شاہ کی مدت ملازمت پوری ہونے پر سینئر ترین جج جسٹس سعد سعود جان کی جگہ سجاد علی شاہ کو چیف جسٹس کا عہدہ سونپا گیا۔پنجاب اور سندھ کے چیف جسٹس صاحبان کو برطرف کر کے اپنی جماعت سے ہمدردی رکھنے والے ججوں کو نوازا گیا۔اس کے بعد سندھ ہائی کورٹ میں نو اور لاہور ہائی کورٹ میں بیس نئے جج بھرتی کیے گئے جن میں اکثریت کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔

لاہور ہائی کورٹ کے ان ججوں میں سے ایک صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ اعلیٰ عدالت کی عمارت دیکھی تھی جبکہ دیگر افراد میں سے پانچ نے بحیثیت وکیل کبھی ہائی کورٹ میں مقدمہ پیش نہیں کیا تھا۔بلوچستان کے علاوہ تمام صوبائی اعلیٰ عدالتوں میں قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیے گئے۔

اس بندر بانٹ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا اور یہ کیس پاکستان کی قانونی تاریخ میں 'ججز کیس' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ججوں کی تقرری کے لیے اعلیٰ عدلیہ سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا، قائم مقام چیف جسٹس زیادہ سے زیادہ نوے دن تک کام کر سکتے ہیں اور ان کے مشورے پر نئے جج تعینات نہیں کیے جا سکتے، چیف جسٹس کی تقرری کے موقعے پر سینئر ترین جج کو ترجیح دی جائے گی، سپریم کورٹ کے ججوں کو ہائی کورٹ میں تعینات نہیں کیا جائے گا اور حکومت کسی جائز وجہ کے بغیر کسی اعلیٰ عدالت کے جج کا تبادلہ نہیں کرے گی۔ اس تاریخ ساز مقدمے کی سماعت کے دوران اور فیصلے کے بعد ججوں کو تنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ جسٹس سجاد علی شاہ کی سرکاری گاڑی اغوا کر لی گئی، ان کی بیٹی اور داماد کو ہراساں کیا گیا، جسٹس ناصر اسلم زاہد کو شریعت عدالت بھیج دیا گیا، جسٹس فضل الٰہی کے بیٹے کو چترال سے کچھ فاصلے پر واقع قصبے میں تعینات کر دیا گیا۔ ان تمام حرکتوں کے باوجود اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے جون میں صوبائی اور وفاقی عدالت سے چوبیس ججوں کو برطرف کر دیا گیا کیونکہ ان کی تقرری کے لیے حکومت نے عدالت عظمیٰ سے مشورہ نہیں کیا تھا۔

اسی دوران ایک برطانوی اخبار نے یہ انکشاف کیا کہ بے نظیر اور انکے شوہر نے پچیس لاکھ پونڈ کے عوض برطانوی شہر سرّے میں ایک محل نما مکان خریدا ہے۔ برطانوی اخبار نے یہ انکشاف بھی کیا کہ زرداری صاحب نے لندن کے پوش علاقے میں دو فلیٹ خریدے جن کی ادائیگی بیرون ملک واقع بینک اکاؤنٹ سے کی گئی۔ اپوزیشن ممبران نے اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس برطانوی اخبار کی کاپیاں لہرائیں تو جواب میں بے نظیر بھٹو نے عورتوں کے خلاف بے بنیاد الزام لگانے کو مذہبی احکامات کے منافی قرار دیا۔

اپوزیشن کے سربراہ نواز شریف نے قومی اسمبلی کے سپیکر کو وزیر اعظم کے خلاف آئین کی شق 62، 63 کی خلاف ورزی کرنے کی مد میں نا اہل قرار دیے جانے کی درخواست جمع کروا دی۔ اگست 1994ء میں وزیر اعظم نے کابینہ میں توسیع کی اور آصف

علی زرداری صاحب سمیت نواز کھوکھر کو وزارت عطا کی گئی۔ اسی مہینے نیپرا کے چیئرمین ڈاکٹر گلفراز احمد کو کوٹ ادو پاور پلانٹ کی نجکاری پر تنقید کے جرم میں ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اخباری بیان میں کہا تھا کہ نجکاری کے نتیجے میں اسی پاور پلانٹ سے دوگنا مہنگی بجلی حاصل کی جائے گی۔ 14 ستمبر 1996ء کو بینک دولت پاکستان نے روپے کی قیمت میں کمی کا اعلان کیا۔ آئی ایم ایف نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ زرعی آمدنی پر ٹیکس نافذ کیا جائے، فوج پر خرچ کم کیا جائے، برآمدات کا ٹیرف کم کیا جائے، جنرل سیلز ٹیکس کا نفاذ کیا جائے اور مختلف صنعتوں کو حاصل ٹیکس چھوٹ ختم کی جائے۔

20 ستمبر 1996ء کی رات وزیر اعظم کے بھائی مرتضٰی بھٹو کو ان کے گھر کے سامنے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ 17 ستمبر کو مرتضٰی بھٹو کے قریبی ساتھی علی سونارا کو پولیس نے گھر سے گرفتار کیا۔ علی سونارا پر دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ علی کو پولیس کے تشدد اور تفشیش سے بچانے کی تگ و دو میں پیپلز پارٹی شہید بھٹو کے راہنما مرتضٰی نے پہلے سی آئی اے کے گارڈن تھانے کا رخ کیا لیکن وہاں سے مطلوبہ معلومات حاصل نہ ہوئیں۔ مرتضٰی اور ان کے ساتھ موجود مسلح گارڈز مایوسی کی حالت میں ایس ایس پی ساؤتھ تھانے پہنچے لیکن وہاں موجود پولیس اہلکار انہیں علی سونارا کی گرفتاری کے متعلق تسلی بخش جواب مہیا نہ کر سکے۔ البتہ ایک پولیس اہلکار نے مرتضٰی پر پستول تاننے کی کوشش کی جس کے باعث پولیس اور مرتضٰی کے گارڈز کے درمیان تو تو میں میں شروع ہوئی۔ اس چپقلش کے دوران مرتضٰی نے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کو گریبان سے پکڑا اور علی سونارا کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ کچھ دیر گرما گرمی کے بعد مرتضٰی کا قافلہ نیپئر روڈ تھانے کی جانب رواں ہوا لیکن وہاں بھی انہیں مطلوبہ معلومات نہ مل سکیں۔

20 ستمبر کی صبح تک 70 کلفٹن (مرتضٰی کی رہائش گاہ) کے اردگرد چار بکتر بند گاڑیاں تعینات کی جا چکی تھیں۔ اس دوران وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے اسمبلی میں تقریر کے

دوران علی سونارا کی گرفتاری کے باعث دہشت گردی کے واقعات میں اضافے کی پیش گوئی کی۔ 20 ستمبر کی دوپہر مرتضیٰ بھٹو نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سندھ کے وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ کی ہدایت پر پولیس کے اعلیٰ ارکان واجد درانی اور شعیب سڈل ان کی جان کے درپے ہیں۔

پریس کانفرنس کے بعد مرتضیٰ اپنے قافلے کے ہمراہ سرجانی ٹاؤن میں اپنی جماعت کے جلسے سے خطاب کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ جلسے سے واپسی پر مرتضیٰ کی گاڑی کو کلفٹن کے علاقے میں روکا گیا اور پولیس کی فائرنگ کے باعث ان کے چھ گارڈز ہلاک ہو گئے جبکہ مرتضیٰ کو زخمی حالت میں قریبی ہسپتال لے جایا گیا۔ انگریزی اخبار ہیرالڈ کی تحقیق کے مطابق مرتضیٰ کے قافلے کی جانب سے ایک گولی چلائی گئی جس کے جواب میں پولیس نے اپنی کارروائی کی۔ جائے وقوعہ پر حق نواز سیال اور شاہد حیات نامی پولیس افسران موجود تھے۔ فائرنگ کے دوران سٹریٹ لائٹس بند تھیں اور واقعے کے پندرہ منٹ بعد جائے وقوعہ کو پانی سے دھویا جا چکا تھا۔ عینی شاہدین کے مطابق میر مرتضیٰ اپنے قدموں پر چل کر پولیس کی گاڑی میں سوار ہوئے جو انہیں ہسپتال لے گئی۔ ہسپتال میں مرتضیٰ کو انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخل کیا گیا لیکن سپیشلسٹ ڈاکٹر کی عدم دستیابی کے باعث انہیں مطلوبہ نگہداشت نہ مل سکی اور آدھی رات سے دس منٹ قبل ان کی وفات کا اعلان کر دیا گیا۔ حق نواز سیال اور شاہد حیات اس واقعے میں زخمی ہوئے لیکن میڈیکل بورڈ کے مطابق حق نواز اپنی ہی گولی سے زخمی ہوئے تھے۔ بورڈ کے اس فیصلے سے اگلے ہی روز حق نواز کو ان کے گھر میں دو مشتبہ افراد نے قتل کر دیا۔ صدر مملکت نے اس واقعے کی تحقیقات کے لیے تین رکنی عدالتی کمیشن کے قیام کا اعلان کیا۔

اس واقعے سے تین روز بعد ملتان میں فجر کے وقت جماعت پر فائرنگ سے تیئس افراد جاں بحق ہوئے جن میں سپاہ صحابہ کے ایک مدرسے کے دس بچے بھی شامل تھے۔ اس

سے پہلے اگست کے مہینے میں بہاول پور کے ایک شیعہ عالم اور سرگودھا کے کمشنر کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ امن و امان کی صورت حال کے پیش نظر صدر لغاری نے باضابطہ تشویش کا اظہار کیا۔ 26 ستمبر کو انہوں نے اپوزیشن سربراہ نواز شریف سے ملاقات کی اور تمام جماعتوں کو مفاہمت کے ساتھ سیاست کرنے کا مشورہ دیا۔ صدر مملکت نے ایوان زیریں اور ایوان بالا کو مطلع کیا کہ وہ کرپشن کی تحقیقات کے لیے ایک آزاد کمیشن تشکیل دیں گے۔

وزیر اعظم بینظیر بھٹو نے 26 ستمبر 1996ء کو طے پانے والی لغاری نواز ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مقتدر قوتیں ان کی حکومت اور جمہوریت کے خلاف سازشوں میں ملوث ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے والد اور بھائیوں کی موت کی ذمہ دار قوتیں ان کو بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس دوران وہ برطانیہ اور امریکا کے دورے پر روانہ ہو گئیں۔ 20 اکتوبر کو وزیر اعظم نے صدر کے مقرر کردہ پراسیکیوٹر کے سامنے پیش ہونے کا عندیہ ظاہر کیا اور اسی روز وزیر مملکت برائے قانون نے پندرہویں آئینی ترمیم کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیا جس کے مطابق سرکاری عہدے پر فائز کوئی بھی شخص کرپشن میں ملوث ہونے کی صورت میں سزا کا حقدار ہوگا۔ ترمیم پیش کرنے کی وجہ احتساب کی خواہش نہیں بلکہ صدر اور عدالت عظمیٰ کے ججوں کو نکیل ڈالنے کا منصوبہ تھا۔ اگر وہ ترمیم منظور ہو جاتی تو وزیر اعظم کی مرضی کے مطابق صدر پاکستان اعلیٰ عدلیہ کے ارکان کو کسی بھی وقت ان کے عہدوں سے ہٹا سکتا تھا۔

27 اکتوبر کے روز جماعت اسلامی کے ارکان نے قومی اسمبلی کے باہر حکومت کے خلاف احتجاج کیا جس پر لاٹھی چارج ہوا اور آنسو گیس استعمال کی گئی۔ 29 اکتوبر کو نواز شریف نے اسلام آباد میں کل جماعتی کانفرنس طلب کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ احتجاج کے طور پر اسمبلیوں سے استعفیٰ دیا جائے گا۔

5 نومبر کو صدر لغاری نے اپنی ہی جماعت کی حکومت برطرف کر دی اور تازہ

انتخابات کا اعلان کیا۔ پیپلز پارٹی حکومت کے اس دور میں قومی اسمبلی نے صرف ایک قابل ذکر قانون پاس کیا جبکہ 335 صدارتی احکامات جاری کیے گئے۔ گزشتہ حکومت کے ترقیاتی کاموں جیسے موٹروے کے منصوبے کی تکمیل میں روڑے اٹکائے گئے۔ اپنے سیاسی حریفوں کو غیر پارلیمانی القابات نوازنے کا کام بے نظیر بھٹو نے بخوبی انجام دیا اور کبھی مہاجروں کو 'بزدل چوہے' تو کبھی اپوزیشن ارکان کو 'کمینے' کہا گیا۔

صدر فاروق لغاری سے ایک صدارتی آرڈیننس جاری کروایا گیا جس کے تحت مخصوص علاقوں میں پولیس کی زیرنگرانی دیے گئے بیانات کو عدالت میں قابل قبول قرار دیا گیا۔ اقتصادی پالیسی کے میدان میں بے نظیر بھٹو کے مشیران ذاتی اناؤں کے بھینٹ چڑھتے رہے اور ملک دیوالیے کی سطح پر پہنچ گیا۔

شمالی پنجاب کے اضلاع (گوجرانوالہ، شیخوپورہ، نارووال، شکر گڑھ، گجرات) میں امن وامان کی صورت حال اس حد تک بگڑ گئی کہ کئی علاقوں میں مسلح گروہوں کے خلاف پولیس کی کارروائی ناکام ثابت ہوئی اور بہت سے دیہات 'نو گو ایریا' بن گئے۔ مہران بینک سے 1990ء میں خفیہ ادارے مستفید ہوئے تو 1994ء میں اسی مہران بینک کی مالی امداد کے توسط سے آفتاب شیر پاؤ، سلیم سیف اللہ اور زرداری صاحب نے سرحد اسمبلی میں 'جوڑ توڑ' کی سیاست کی۔

عدالت عظمیٰ کے فیصلے کے برخلاف پنجاب میں بلدیاتی نظام کو بحال نہ کیا گیا۔ پاکستان سٹیل مل کے معاملات میں 'دولہا بھائی' اور ملک میں چاول کی تقسیم میں بی بی کی جانب سے بے جا مداخلت کے باعث ملکی خزانے کو کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان بیت المال کی جانب سے وزیر داخلہ کے نام جاری کردہ بیشتر چیک جعلی تھے اور مستحق افراد کے نام پر حکومتی جماعت کے ارکان عیش کرتے رہے۔ ملک میں موبائل فون کی ٹیکنالوجی متعارف کروائی گئی لیکن حکومتی عہدہ داروں کے علاوہ اسے استعمال کرنے پر پابندی عائد کر

دی گئی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ پائی۔

آصف زرداری حکومت کی برطرفی کے وقت لاہور کے گورنر ہاؤس میں منظور وٹو کی حکومت ختم کرنے کی سازباز میں مصروف تھے اور وہیں سے انہیں گرفتار کیا گیا۔ صدر لغاری نے پیپلز پارٹی کے سابقہ رکن ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم کا عہدہ سونپا۔ کابینہ میں صاحبزادہ یعقوب علی خان، عابدہ حسین، شاہد جاوید برکی اور فخر الدین جی ابراہیم شامل تھے۔ نجم سیٹھی کو نگران وزیر اعظم کا خصوصی مشیر برائے احتساب مقرر کیا گیا۔ سندھ میں ممتاز بھٹو کو قائم مقام وزیر اعلیٰ جبکہ پنجاب میں خواجہ طارق رحیم کو گورنر مقرر کیا گیا۔ 18 نومبر 96 کو صدر کی جانب سے کرپشن اور بدعنوانی کی روک تھام کے لیے احتساب آرڈیننس متعارف کروایا گیا۔ صدر لغاری نے 3 فروری 1997ء کو عام انتخابات منعقد کروانے کا اعلان کیا۔ تحریک انصاف نے پہلی مرتبہ انتخابی کارروائی میں حصہ لیا۔ انتخابی مہم کے دوران کراچی میں خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا کہ ان کی جماعت کے منشور میں تین اہم نکات ہیں: انصاف کی فراہمی، انسانی حقوق کی ترویج اور قومی خودمختاری کا تحفظ۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ نکات انہوں نے اسلام سے اخذ کیے ہیں اور پاکستان کا مستقبل اسی صورت روشن ہوسکتا ہے اگر یہاں اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ہو جائے۔

دوسرا نواز دور 1997-1999

تین فروری 1997ء کو منعقد کردہ قومی انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ نواز نے قومی اسمبلی میں دو تہائی اور پنجاب اسمبلی میں نوے فیصد برتری حاصل کی۔ ووٹر ٹرن آؤٹ تاریخی لحاظ سے کم ترین رہا اور صدر لغاری نے ٹی وی پر اعتراف کیا کہ شہری اور دیہاتی علاقوں میں صرف چھبیس سے ستائیس فیصد افراد نے ووٹ کا اختیار استعمال کیا۔

قومی اسمبلی میں مسلم لیگ نواز نے 202 نشستوں میں سے 134 جبکہ پیپلز پارٹی

نے 19، متحدہ قومی موومنٹ نے 12 اور عوامی نیشنل پارٹی نے 9 پر کامیابی حاصل کی۔ صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ نواز نے حکومت قائم کی اور شہباز شریف کو وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخواہ) میں عوامی نیشنل پارٹی اور مسلم لیگ نواز کی مخلوط حکومت قائم ہوئی اور سردار مہتاب عباسی کو وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ صوبہ سندھ میں مسلم لیگ نواز اور متحدہ قومی موومنٹ نے مخلوط حکومت قائم کی جبکہ بلوچستان میں کسی جماعت کو واضح برتری حاصل نہ ہوئی اور اختر مینگل نے وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔

دوسرے نواز دور میں قانون اور عدلیہ کی دھجیاں جس طرح اڑائی گئیں، اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھانے کے ایک ماہ بعد ہی صحافت کی آزادی پر حملہ ایک آرڈیننس کے ذریعے کیا گیا۔ اپنے پہلے دور حکومت کے دوران بھی نواز شریف کے صحافیوں سے تعلقات مثالی نہیں تھے اور ایک طنزیہ نظم چھاپنے پر معروف انگریزی اخبار کی مدیر پر بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ آئین میں درج تمام اصولوں کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے صدر کے اختیارات کم کرنے والی تیرھویں ترمیم اور تین ماہ بعد چودھویں ترمیم راتوں رات منظور کروالی گئی۔

چودھویں ترمیم کے مطابق اسمبلی کے ممبران اپنی جماعت کے سربراہ کے فیصلے کے خلاف ووٹ نہیں ڈال سکتے تھے اور ایسا کرنے کی صورت میں ان کو نااہل قرار دیا جانا تھا، اور وہ اس عمل کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے خصوصی عدالتیں قائم کرنے کا حکم جاری کیا لیکن اس کو چیف جسٹس نے خلاف قانون قرار دے کر مسترد کر دیا، جس پر نواز شریف خوب سیخ پا ہوئے اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں چیف جسٹس پر سخت تنقید کی۔

وزیر اعظم نواز شریف نے چیف جسٹس سجاد علی شاہ سے نجات پانے کے لیے پہلے تو یہ منصوبہ بنایا کہ انہیں اسمبلی کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا حکم جاری کیا جائے اور

جب انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ ممکن نہیں تو انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ کسی طریقے سے جج صاحب کو صرف ایک رات کے لیے ہی حوالات کی سیر کرائی جائے۔ کشیدگی بڑھنے پر جنرل جہانگیر کرامت نے تصفیہ کرانے کی پیشکش کی تو وزیراعظم نے مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت طلب کی۔

اس اثناء میں شہباز شریف، شریف الدین پیرزادہ اور سپریم کورٹ کے دو جج کوئٹہ پہنچے اور سپریم کورٹ کوئٹہ بنچ میں چیف جسٹس کی تقرری کو انہی کے قائم کردہ اصولوں (ججز کیس کے فیصلے میں جسٹس سجاد علی شاہ نے تقرری کے کچھ اصول مرتب کیے تھے) کی روشنی میں چیلنج کر دیا۔ کوئٹہ بینچ نے چیف جسٹس کے خلاف فیصلہ سنایا اور انہیں اپنے فرائض انجام دینے سے روک دیا۔ چیف جسٹس نے اس حکم کو غیر آئینی قرار دیا۔

پشاور بنچ نے بھی اسی طرز کا حکم جاری کیا اور جسٹس سعید الزماں صدیقی نے چیف جسٹس کی تقرری کو کالعدم قرار دیتے ہوئے خود ان کا منصب سنبھالنے کا فیصلہ سنایا۔ دونوں بنچوں نے چیف جسٹس کے خلاف درخواست صدر کو بھی بھجوا دی۔ اس نوعیت کا غیر آئینی قدم اس سے پہلے پاکستان اور شاید دنیا کی کسی عدالت میں نہیں اٹھایا گیا تھا۔

اس دھینگا مشتی کے دوران چیف جسٹس نے صدر کے اختیارات بحال کرتے ہوئے تیرھویں آئینی ترمیم کو کالعدم قرار دیا۔ اس حکم کے چند منٹ بعد ہی سپریم کورٹ کے ایک اور بنچ نے اس حکم کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ 28 نومبر کا دن پاکستان اور اس کی عدلیہ کے لیے تاریک ترین دن تھا۔ اس روز وزیراعظم نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے خلاف توہین عدالت کے مقدمے کی سماعت جاری تھی کہ عدالت پر مسلم لیگ نواز کے کارکنوں نے ہلا بول دیا۔ جوشیلے مسلم لیگیوں نے چیف جسٹس کے کمرہ عدالت کا دروازہ توڑ دیا اور مختلف املاک کو نقصان پہنچایا۔ اس دھکم پیل میں وفاقی وزیر مشاہد حسین سید، سینیٹر سیف الرحمان، پرویز رشید، سعد رفیق، خواجہ آصف، اختر رسول، طارق عزیز، نجمہ حامد اور دیگر

شامل تھے۔ اس طوفان بدتمیزی سے دو روز قبل عدالت عظمیٰ میں ایک گمنام وکیل نے رٹ دائر کی تھی کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جائے۔

اردشیر کاؤس جی نے لکھا کہ سجاد علی شاہ کے والد نے 1954 میں گورنر جنرل غلام محمد کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسمبلی کی تحلیل کے خلاف مولوی تمیز الدین کی اپیل سماعت کے لیے منظور کی تھی لیکن سجاد علی شاہ کو ایوان اقتدار کی خواہش اور عدالت عظمیٰ کی بے حرمتی کے بعد گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ اس بحران کے دوران صدر لغاری نے شریف حکومت کے اقدام کی حمایت نہیں کی اور نواز شریف سے مخالفت کی سزا بہر حال صدر لغاری کو بھگتنا پڑی اور انہیں اقتدار کی کشتی میں مات کھانے کے باعث استعفیٰ دینا پڑا۔ ذرائع ابلاغ پر مکمل اختیار ہونے کے باعث صدر کے استعفے کی خبر سرکاری چینل پر نہیں دکھائی گئی۔ قائم مقام صدر کا پہلا کام جسٹس سجاد علی شاہ کو برطرف کرنا تھا۔

اپریل 1998ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کی ٹیم نے 'غوری' نامی درمیانے فاصلے کے میزائل کا تجربہ کیا۔ ہندوستان نے کچھ ماہ قبل پرتھوی نامی میزائل کا تجربہ کیا تھا۔ پرتھوی، ہندی زبان میں زمین کو کہتے ہیں۔ تجربے کے وقت اس بات پر کسی نے غور نہیں کیا کہ وہ میزائل دراصل شمالی کوریا سے لیا گیا نوڈونگ میزائل تھا۔

ہندوستانی حکومت اس اقدام پر بوکھلا گئی اور اٹل بہاری واجپائی نے باضابطہ ایٹمی دھماکے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے قبل ہندوستان 1974ء میں پوکھران کے مقام پر ایٹمی دھماکا کر چکا تھا۔ 11 مئی 1998ء کو ہندوستان نے راجھستان میں ایٹمی تجربہ کیا۔ امریکا اور باقی دنیا اس اچانک اقدام پر بوکھلا گئے۔ امریکی صدر کلنٹن نے اپنے تجربہ کار سفارت کار اور جرنیل پاکستان کو ایسی ہی حرکت سے باز رکھنے کے لیے روانہ کیے۔ نواز شریف نے امریکیوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ بہت دباؤ کا شکار ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جنگی کابینہ کا خفیہ اجلاس بلایا تاکہ اس مسئلے کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے۔

وزیر خزانہ سرتاج عزیز، نیوی کے سربراہ ایڈمرل فصیح بخاری اور چوہدری نثار علی خان کے علاوہ تمام وزراء اور مشیروں کی رائے تھی کہ دھماکہ کر دیا جائے۔ سرتاج عزیز نے حاضرین کو دھماکے کے بعد ممکنہ معاشی بحران کے خطرے سے آگاہ کیا اور یہ تسلی دی کہ پاکستان معاشی پابندیوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وزیراعظم فیصلہ کرنے میں گومگو کا شکار تھے۔ ان کے قریبی کالم نگاروں مجیب الرحمان شامی اور الطاف حسن قریشی 26 مئی تک اپنے اخباری مضامین میں 'امتناع' کا پیغام سنا رہے تھے۔

صدر کلنٹن نے نواز شریف کو پاکستان کے بہت سے بیرونی قرض معاف کروانے کا عندیہ دیا۔ اس دوران اسرائیلی طیاروں کی پاکستانی سرزمین پر حملے کی افواہ بھی اڑائی گئی لیکن آزادانہ تحقیق کے مطابق اسرائیل نے ایسی کسی کاروائی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ ایٹمی تجربہ کرنے کا فیصلہ ہوا تو عبدالقدیر خان اور ثمر مبارک مند کے درمیان یہ چپقلش شروع ہوئی کہ اس کام کی ذمہ داری کون لے گا۔ ثمر مبارک منداوران کے ماتحت ادارے پاکستان ایٹمی انرجی کمیشن نے بلوچستان میں چاغی کے مقام پر ایٹمی تجربات کے لیے سرنگیں تیار کر رکھی تھیں لہٰذا یہ شرف انہیں حاصل ہوا۔ عبدالقدیر خان آج تک اپنے آپ کو بابائے بم کہلوانا پسند کرتے ہیں لیکن ثمر مبارک مند کے مطابق خان ریسرچ لیبارٹری اور عبدالقدیر خان کا بم بنانے کے پچیس مراحل میں سے صرف ایک مرحلہ پورا کرنے میں حصہ تھا۔

28 مئی 1998ء کو پاکستان دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت بن گیا۔ دھماکوں کے بعد عالمی سطح پر پاکستان کو معاشی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکا نے جلد ہی پابندیوں میں کمی کر دی اور اسی سال جولائی کے مہینے میں زراعت کے شعبے میں امداد پاکستان کو مہیا کی گئی جبکہ فوجی اور تکنیکی امداد تین ماہ بعد ملی۔

اگست 1998ء میں شریف حکومت نے پندرہویں آئینی ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں متعارف کروایا۔ اس بل کو شریعت بل بھی کہا گیا اور اس ترمیم کی بدولت نواز شریف نے

قانونی طور پر خلیفہ بننے کی کوشش کی۔ اس بل کے خلاف انسانی حقوق کی تنظیموں نے ملک بھر میں احتجاجی مہم چلائی۔ قانونی امور کے ماہرین کے مطابق اس بل کے ذریعے وفاق کو مزید اختیارات دینے اور صوبائی حکومتوں کو کمزور رکھنے کی سعی کی گئی۔ یہ بل قومی اسمبلی نے اکتوبر میں پاس کیا لیکن اسے سینیٹ میں پیش نہیں کیا گیا۔

سیاچن گلیشیئر کو دنیا کا بلند ترین میدان جنگ کہا جاتا ہے۔ سیاچن اور سرینگر کو آپس میں ایک ہی سڑک ملاتی ہے، جس کے ذریعے بھارتی فوج کو اسلحہ اور روزمرہ ضرورت کی اشیاء پہنچائی جاتی ہیں۔ پاکستانی فوج کئی سال اس سڑک کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار کسی نے یہ حل نکالا کہ اگر پاکستان لداخ میں واقع کارگل کی چوٹیوں پر قبضہ کر لے تو وہاں سے اس سڑک کو نشانہ بنانا بہت آسان ہو جائے گا۔

اکتوبر 1998ء میں پاکستانی فوج کی ناردرن لائٹ انفنٹری کے دستے خفیہ طور پر کارگل کی چوٹیوں کی جانب روانہ ہوئے۔ ہر سال سردی کے موسم میں بھارتی فوج کے جوان کارگل کا علاقہ شدید برف باری کی وجہ سے خالی کر دیتے تھے۔ ابتدائی پیش قدمی کے چھ ماہ بعد دو ہزار پاکستانی سپاہی بھارتی سرحد کے اندر دس کلومیٹر تک گھس کر کارگل کی چوٹیوں پر اپنا ٹھکانہ بنا چکے تھے۔ مئی کے پہلے ہفتے میں کشمیری چرواہوں نے پاکستانی فوجیوں کو پہچان لیا اور ان کے متعلق اطلاع بھارتی فوج تک پہنچائی۔ 21 مئی کو بھارتی جہازوں نے صورت حال کی تصاویر مرکزی کمان تک پہنچائیں تو اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔

26 مئی کو بھارتی جنگی طیاروں نے پاکستانی افواج کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دی۔ بھارتی ذرائع کے مطابق پاکستانی افواج نے کم از کم ایک سو تیس مقامات پر ٹھکانے قائم کر رکھے تھے۔ پاکستانی دستوں نے اگلے ہفتے کی لڑائی کے دوران دو بھارتی طیارے مار گرائے۔ بھارتی فوج نے بوفورس توپیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، جو کامیاب رہا۔ دوسری جانب بھارتی بحریہ نے پاکستان کے تجارتی اور دیگر بحری جہازوں کے لیے

ساحلوں تک پہنچنا مشکل بنا دیا۔ اس دوران سفارتی اور حکومتی سطح پر پاکستانی حکومت نے باقاعدہ فوج کی کارگل میں موجودگی سے بے خبری کا اظہار کیا تھا، اور اس کارروائی کی ذمہ داری کشمیری علیحدگی پسندوں پر ڈالی تھی۔

جب بھارتی افواج نے ایک مقام پر مقابلے کے بعد کیپٹن کرنل شیر خان کی لاش تحویل میں لے کر ان کی پاکستانی وردی میں ملبوس تصاویر ٹی وی پر نشر کیں تو پاکستان کے پاس ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ عالمی سطح پر پاکستان کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا اور جون کے وسط میں پاکستان پر جنگ ختم کرنے کا دباؤ بڑھنے لگا۔ جب امریکی صدر کلنٹن کو پاکستان کی جانب سے سرگودھا میں ایٹمی ہتھیاروں سے لیس میزائلوں کی تیار حالت کی اطلاع ملی تو انہوں نے دفعتاً نواز شریف کو امریکہ طلب کیا۔

4 جولائی کو وزیراعظم نواز شریف نے واشنگٹن میں جنگ بندی اور پاکستانی فوجوں کی واپسی کا اعلان کیا۔ مئی میں کارگل کے موضوع پر مشرف کے زیرِ صدارت منعقد شدہ کور کمانڈرز کانفرنس کے بعد ایئر کموڈور عابد راؤ نے کہا تھا کہ اس آپریشن کے بعد یا تو کورٹ مارشل ہوگا یا مارشل لاء ہوگا۔ ستمبر 99ء میں بلائی جانے والی کور کمانڈرز کانفرنس میں جنرل مشرف کی حرکات اور 'ممکنہ ارادوں' سے متعلق کوئٹہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز نے وزیراعظم کو خبردار کیا، جس کی پاداش میں مشرف نے طارق پرویز کو برخواست کرنے کی سفارش کی۔ اسی اثناء میں مشرف نے اپنے رشتے دار میجر جنرل شاہد عزیز کو ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز مقرر کیا اور اس عہدے پر مقرر توقیر ضیاء کو کور کمانڈر منگلا تعینات کیا گیا۔ چیف آف جنرل سٹاف جنرل عزیز کی ہدایت پر کمانڈوز کی ایک کمپنی بریگیڈیئر امیر فیصل علوی کی قیادت میں راولپنڈی کے قریب دھمیال میں تعینات کی گئی اور مشرف کے سابقہ بریگیڈ میجر بریگیڈیئر صلاح الدین ستی کو 111 بریگیڈ کی کمان سونپی گئی۔

17 ستمبر 1999ء کو شہباز شریف وزیراعظم کی ہدایت پر واشنگٹن پہنچے اور امریکی

دفترِ خارجہ کے عہدے داروں کے ساتھ ملاقات کے دوران انہیں پاکستان میں جرنیلوں کی 'ممکنہ آمد' سے آگاہ کیا۔ شہباز شریف نے امریکی عہدے داروں کو کچھ ماہ قبل کارگل کے موضوع پر حکومت کی 'وفاداری' کی یاددہانی کروائی اور یہ باور کرایا کہ اس حرکت پر فوج بالکل خوش نہیں تھی۔ انہوں نے پاکستان کی جانب سے طالبان حکومت کے ساتھ سخت رویہ اپنانے اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں امریکہ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ 20 ستمبر کو ایک امریکی اہلکار نے پاکستان میں جمہوری عمل کی پائیداری کی ضرورت پر زور دیا اور کسی 'غیر آئینی' اقدام کی مخالفت کا عندیہ دیا۔

اسی اثنا میں جنرل مشرف نے نواز شریف کے قریب سمجھے جانے والے جنرل سلیم حیدر کا تبادلہ کر دیا۔ سیاسی شطرنج کا میدان سج چکا تھا اور دونوں فریقین اپنے مہرے احتیاط سے استعمال کر رہے تھے۔ 10 اکتوبر کو میاں نواز شریف اپنے قریب ترین ساتھیوں سمیت ابوظہبی کے ایک روزہ دورے پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کے فرزند حسین نواز، تقریر نویس نذیر ناجی اور جنرل ضیاء الدین موجود تھے۔ اس واقعے سے کچھ ماہ قبل مقامی اخبارات میں شریف حکومت کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا جا چکا تھا اور اپوزیشن سیاست دانوں نے ایک گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس بنایا تھا جس کا یک نکاتی مقصد 'گو نواز گو' تھا۔ اس اکٹھ میں پیپلز پارٹی، عوامی نیشنل پارٹی، تحریک انصاف، مسلم لیگ چٹھہ گروپ اور پاکستان عوامی تحریک شامل تھیں۔

آخری بساط بچھ چکی تھی اور نواز شریف نے مہلک وار کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ جنرل مشرف سری لنکا کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کولمبو جا چکے تھے اور 12 اکتوبر کو ان کی واپسی متوقع تھی۔ واپسی سے چار گھنٹے کی پرواز کے دوران مشرف کو ان کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا۔ سیاسی قیادت اس امر سے لاعلم تھی کہ کولمبو جانے سے قبل مشرف نے اپنے قریب ترین ساتھیوں سے اپنے گھر پر ملاقات کی تھی اور

شرکاء میں جنرل عزیز، جنرل محمود، جنرل شاہد عزیز اور بریگیڈ یئر راشد قریشی شامل تھے۔

بارہ اکتوبر کو صبح دس بجے وزیراعظم اسلام آباد سے اپنے طیارے میں شجاع آباد میں منعقدہ ایک جلسے سے خطاب کے لیے روانہ ہوئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری افتخار علی خان کو ہدایت دی کہ واپسی پر ان سے ملاقات کریں، اس کے علاوہ انہوں نے صدر پاکستان کے ساتھ ملاقات کے لیے وقت مقرر کرنے کی ہدایات جاری کیں۔ اس سفر میں وزیراعظم کے ہمراہ حسین نواز، نذیر ناجی اور پی ٹی وی کے سربراہ پرویز رشید تھے۔ طیارہ ملتان ہوائی اڈے پر اتارنے کے بعد جہاز کے عملے کو باہر نکلنے کا حکم دیا گیا اور نذیر ناجی سے ان کا موبائل فون لے لیا گیا۔ نذیر ناجی کو حسین نواز کی لکھی تقریر دکھائی گئی جو اس روز وزیراعظم نے قوم سے خطاب کے دوران استعمال کرنا تھی، اور نذیر صاحب نے اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی نوک پلک سنواری۔

دو گھنٹے بعد طیارہ پنڈی کے چکلالہ ہوائی اڈے پر اترا تو وزیراعظم نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو منصوبے سے آگاہ کیا۔ نواز شریف نے بتایا کہ جنرل طارق پرویز کی برخاستگی کے بعد فوج اور حکومت کے تعلقات میں ابتری آچکی ہے اور انہوں نے جنرل مشرف کی جگہ جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف تعینات کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ افتخار علی نے وزیراعظم کو اس ہنگامی قدم سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے سنی ان سنی کردی۔

وزیراعظم کے دفتر میں ان کے سیکرٹری سعید مہدی نے سرکاری کارروائی کے لیے کاغذات تیار کیے۔ سہ پہر کے چار بجے جنرل مشرف کا طیارہ کولمبو کے ہوائی اڈے سے پاکستان کے لیے روانہ ہوا۔ ساڑھے چار بجے وزیراعظم نے مشرف کی جگہ ضیاء الدین کے تقرر نامے پر دستخط کردیے اور حتمی فیصلے کے لیے کاغذات ایوان صدر بھجوا دیے۔ پی ٹی وی کے پانچ بجے کے خبرنامے میں مشرف کی جگہ ضیاء الدین کو آرمی چیف بنانے کی خبر نشر کردی گئی۔ جنرل ضیاء الدین نے مشرف کے حمایتی جرنیلوں عزیز خان اور محمود احمد کی جگہ اپنے

قابل اعتماد لوگوں کو تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل، جنرل اکرم کو عزیز خان کی جگہ بحیثیت چیف آف جنرل سٹاف کمان سنبھالنے کا پیغام بھیجا اور جنرل سلیم حیدر کو محمود احمد کی جگہ دس بریگیڈ کی کمان سنبھالنے کی ہدایت دی۔

جنرل سلیم اس وقت گالف کھیل رہے تھے لہٰذا ان تک پیغام پہنچانے میں کچھ وقت لگا۔ عین اسی وقت جنرل محمود احمد اور عزیز خان ٹینس کھیل رہے تھے اور انہیں اس تبدیلی کی اطلاع پشاور کے کور کمانڈر جنرل سعید الظفر کے ذریعے ملی۔ دونوں جنرل فوری طور پر جی ایچ کیو پہنچے اور سب سے پہلے پی ٹی وی کو آرمی چیف کی تبدیلی کی خبر چلانے سے روکنے کے لیے ایک میجر اور پندرہ جوانوں کو مرکزی ٹیلی ویژن دفتر بھیجا۔ اس کے بعد انہوں نے کور کمانڈروں سے رابطہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ پی ٹی وی کے شام چھ بجے والے خبر نامے میں مشرف کی سبکدوشی اور جنرل ضیاء الدین کی تقرری کی خبر موجود نہیں تھی۔ وزیر اعظم ہاؤس سے نواز شریف کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید اقبال کو پنجاب ایلیٹ فورس کے ہمراہ پی ٹی وی مرکز بھیجا گیا جہاں بریگیڈیئر کی میجر نثار سے تو تو میں میں ہوئی جس کے نتیجے میں میجر نثار اور ان کے ساتھ موجود فوجیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور بالآخر سات بجے کے خبر نامے میں مشرف کی برطرفی والی خبر نشر کی گئی۔ اس کے بعد جی ایچ کیو میں بیٹھے جرنیلوں نے فوجیوں کی ایک بڑی تعداد ٹیلیویژن مرکز بھیجی جن کی دروازہ پھلانگنے والی تصویر بہت مشہور ہوئی۔

جنرل محمود اور جنرل اورکزئی کی زیر قیادت وزیر اعظم ہاؤس فتح کر لیا گیا۔ مشرف کے طیارے کو پہلے کراچی ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن فوج نے جلد ہی ہوائی اڈے پر قابو پا لیا۔ پی ٹی وی پر ساری رات ملی نغمے اور فوجی ترانے چلتے رہے۔ رات کے آخری پہر سکرین پر فوجی وردی میں ملبوس پرویز مشرف نمودار ہوئے، اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

چوتھا مارشل لاء

نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں ان کے جنرل جہانگیر کرامت سے کئی معاملات پر اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ نیول وار کالج میں جنرل جہانگیر نے اپنی ایک تقریر کے دوران نیشنل سیکیورٹی کونسل کے قیام پر زور دیا جس کے تحت فوجی معاملات کے ماہرین کا ایک ایسا ادارہ قائم کیا جانا تھا جو سول حکومت اور پاک فوج کو باہم مل کر دفاعی پالیسیاں بنانے میں مدد دے سکے۔ ایسے ادارے دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں۔ نواز شریف نے اس کو سول حکومت کے معاملات میں مداخلت جانا اور جنرل جہانگیر کرامت کو برطرف کر دیا۔ نواز شریف کے اس اقدام پر ملک بھر میں زبردست تنقید کی گئی اور اکثریت نے اس کو ایک احمقانہ اور ملکی مفادات کے منافی اقدام قرار دیا۔

اس وقت جنرل جہانگیر کرامت کی جگہ لینے کے لیے تین لیفٹیننٹ جنرل لائن میں تھے۔ پہلے علی قلی خان جو پی ایم اے اور آر ایم اے کے گریجوایٹ اور بہت قابل افسر تھے اور عوامی حلقوں میں کافی پسند کیے جاتے تھے۔ لیکن انہیں سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل وحید کاکڑ کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا لہٰذا انہیں پروموٹ نہیں کیا گیا۔ دوسرے نمبر پر لیفٹیننٹ جنرل خالد نواز خان تھے جو اپنی سخت گیری کے لیے بہت مشہور تھے اور ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ غلطی معاف نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ انہیں مہاجروں خصوصاً ایم کیو ایم کا سخت مخالف سمجھا جاتا تھا۔ تیسرے نمبر پر لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف تھے۔ ان کو آرمی کے حلقوں میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ بھی شاندار

تھا۔نواز شریف کے قریب سمجھے جانے والے بہت سے لوگوں نے پرویز مشرف کی سفارش کی۔ چودھری نثار علی خان اور شہباز شریف نے ذاتی طور پر نواز شریف سے ملکر پرویز مشرف کو جنرل جہانگیر کرامت کی جگہ نیا چیف آف آرمی سٹاف بنانے کی سفارش کی۔جس کے بعد جنرل پرویز مشرف کو پاکستان کا نیا چیف آف آرمی سٹاف اور چیف آف جوائنٹ سٹاف کمیٹی بنادیا گیا۔

کارگل کی جنگ

پاک فوج نے کارگل کا منصوبہ بھارت کے سیاچن پر قبضے کے بعد ہی بنالیا تھا۔ لیکن اس منصوبے میں آرمی اور اعلی سول عہدیداروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت تبدیلیاں کی جاتیں رہیں۔ تاہم پرویز مشرف اس منصوبے کے اصل روح رواں تھے۔ پرویز مشرف نے مارچ سے مئی 1998ء کے دوران کشمیر میں تعینات پاک فوج کو خفیہ طور پر کارگل میں داخل کرنا شروع کردیا۔ کچھ عرصے بعد جب بھارت کو کارگل کی چوٹیوں پر پاک فوج کی موجودگی کا علم ہوا تو اس نے پوری طاقت سے ان پر حملہ کردیا اور ان حملوں کے لیے اپنی بھرپور فضائی قوت بھی استعمال کی۔

پاک فوج کا کافی جانی نقصان ہوا لیکن اونچائی پر ہونے کی وجہ سے اسے برتری حاصل رہی۔ بھارت کو جانی اور مالی لحاظ سے یہ جنگ بہت زیادہ مہنگی پڑ رہی تھی۔ تاہم عالمی رائے عامہ پاکستان کے مخالف جاتی دیکھ کر نواز شریف نے امریکی دباؤ پر افواج کو واپس بلانے کا حکم جاری کیا اور یوں پاکستان نے جنگ سے پسپائی اختیار کر لی۔ دوران پسپائی پاک فوج کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ چونکہ کارگل کی جنگ بہت بڑا مس ایڈونچر تھا اس لیے فوج کی اعلیٰ قیادت میں سول حکومت کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ پرویز مشرف اور نواز شریف میں کارگل کے معاملے میں محاذ آرائی شروع ہوئی اور

دونوں ایک دوسرے کونقصان کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔ میڈیا اور اخبارات خصوصاً جنگ گروپ نے اس آپریشن پر زبردست تنقید کی اور ملک بھر میں کارگل آپریشن کے خلاف مہم چلائی۔ پرویز مشرف کو کچھ ایسے آرمی کے سینئر آفیسرز کی بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو پرویز مشرف کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ان میں چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل فصیح بخاری جو چیف آف جوائنٹ سٹاف کمیٹی بننا چاہتے تھے اور لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان شامل تھے۔

ایڈمرل فصیح بخاری نے فوری طور پر پرویز مشرف کے کورٹ مارشل کا مطالبہ کر دیا۔جبکہ علی قلی خان نے کارگل آپریشن کو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے سے بڑا سانحہ قرار دیا۔لیکن سب سے بڑھ کر پرویز مشرف کو کارگل کے محاذ پر اپنے دیرینہ ساتھی چیف آف ائیر سٹاف پرویز مہدی قریشی کی بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جنہوں نے کارگل کی چوٹیوں پر پاک فوج کی فضائی مدد سے انکار کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا۔

مشرف کا مارشل لاء

ستمبر 1998 میں آرمی کے سینئر عہدیداروں میں ممکنہ مارشل لاء کے حوالے سے تین ملاقاتیں ہوئیں۔ مارشل لاء کے خطرے اور پاک فوج کے غصے کو محسوس کرتے ہوئے نواز شریف نے 30 ستمبر 1999 کو اعلان کیا کہ پرویز مشرف اپنی بقایا مدت بطور چیف آف آرمی سٹاف پوری کریں گے اور انہیں ان کے عہدے سے نہیں ہٹایا جائیگا۔تاہم اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ گزشتہ سطور میں بیان کیا جاچکا ہے۔

پرویز مشرف نے 13 اکتوبر کو صدر رفیق تارڑ سے ملاقات کی اور انہیں مارشل لاء کی وجوہات سے آگاہ کیا۔ 15 اکتوبر کو پرویز مشرف نے ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کر دی اور آئین کو معطل کر کے چیف ایگزیکٹیو کا عہدہ سنبھال لیا۔ پرویز مشرف نے فوری طور پر ضیاالدین بٹ اور شاہد خاقان عباسی کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ 17 اکتوبر کو

انہوں نے دوسری بار قوم سے خطاب کیا اور 7 ارکان پر مشتمل ایک کونسل بنائی جس نے ملکی معاملات چلانا تھے۔

اس سے چند روز بعد مشرف نے نے 3 ریٹائرڈ آرمی آفیسرز اور ایک جج کو صوبوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے تعینات کیا۔ تمام تر اختیارات کے باوجود پرویز مشرف نے وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ میں رہائش اختیار نہیں کی اور اسے بند کر دیا گیا۔ مشرف کے اس اقدام کے خلاف کہیں بھی کوئی عوامی احتجاج سامنے نہیں آیا اس کے برعکس اکثر لوگوں نے اس کو سراہا۔ کئی شہروں میں باقاعدہ مٹھایاں بانٹی گئیں۔ تاہم بین الاقوامی برادری میں اس اقدام کی مذمت کی گئی اور پاکستان کی کامن ویلتھ آف نیشنز کی رکنیت معطل کر دی گئی۔ نواز شریف کو نظر بندی کے بعد پہلے اڈیالا جیل اور بعد میں سعودی عرب کی مداخلت پر ایک معاہدے کے تحت جلاوطن کر دیا گیا۔

حکومت کا ابتدائی عرصہ

پاک آرمی کے سینئر ترین آفیسرز کا چناؤ پرویز مشرف کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ وہ لازمی طور پر ایسے افراد ہونا چاہیے تھے جو اہم قومی معاملات پر پرویز مشرف کے ساتھ تعاون کر سکتے۔ اسکا آغاز پاکستانی ایئر فورس سے کیا گیا جہاں پرویز مشرف نے صدر رفیق تارڑ سے کہا کہ چیف کے عہدے کے لیے کوئی ایسا آفیسر سیلیکٹ کریں جو ان کے ساتھ کام کر چکا ہو۔ اس لیے جب ایئر مارشل پرویز مہدی قریشی ریٹائر ہوئے تو نئے چیف آف ایئر شاف کے لیے مصحف علی میر کو چنا گیا جو 1996 میں طالبان سے متعلق معاملات میں پرویز مشرف کے ساتھ کام کر چکے تھے۔

اسی طرح نیوی میں دو نہایت اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ باوجود اس کے کہ اس وقت کے ایڈمرل عبدالعزیز مرزا کی سلیکشن نواز شریف نے کی تھی لیکن پرویز مشرف سے دیرینہ

تعلقات اور دوستی کی وجہ سے انہوں نے مشرف کے مارشل لا کی بھرپور حمایت کی۔ عبدالعزیز مرزا کے بعد پرویز مشرف نے ایڈمرل کے عہدے کے لیے شاہد کریم اللہ کو چنا جو کہ 60 کی دہائی میں ایس ایس جی کی ٹریننگ کے دوران پرویز مشرف کے ساتھ رہے تھے۔ پرویز مشرف نے کئی ماہرین اور بیوروکریٹس کو اپنی کابینہ کا حصہ بنایا۔ ان میں سٹی بینک کے سابق صدر شوکت عزیز کو وزیر خزانہ اور عبدالستار کو وزیر خارجہ مقرر کیا۔ انہوں نے اپنے کل اثاثہ جات کی تفصیل بھی عوام کے سامنے پیش کی۔

دسمبر کے آخری دنوں میں پرویز مشرف کا پہلا امتحان ہوا جب بھارت نے اپنے جہاز انڈین ایئر لائن فلائٹ 814 کی ھائی جیکنگ میں پاکستان کو ملوث قرار دیا۔ انڈیا کے اس واویلے کے جواب میں امریکن صدر بل کلنٹن نے پرویز مشرف پر دباؤ ڈالا کہ اس معاملے میں ملوث تنظیم حرکت المجاہدین پر پابندی لگائی جائے لیکن مشرف نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

2000 میں مشرف نے سیاسی جلسوں پر پابندی لگوا دی۔ 2001 میں پرویز مشرف نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں کھل کر کہا کہ آرمی کے کچھ اعلیٰ افسران ریاستی معاملات میں منفی کردار ادا کر رہے ہیں۔

نواز شریف کا ٹرائل اور جلاوطنی

ملٹری پولیس نے نواز شریف کو ایک سرکاری مہمان خانے میں نظر بند کر دیا اور اکتوبر کے آخری مہینوں میں ان کا لاہور والا گھر عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ نواز شریف پر ھائی جیکنگ، اغواء، اقدام قتل، اور پرویز مشرف کے جہاز کو کراچی ایئرپورٹ پر نہ اترنے دینے کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ مقدمے کی باقاعدہ سماعت مارچ 2000 میں انسداد دہشت گردی کی عدالت میں ہوئی جو تیز رفتار فیصلوں کے لیے بنائی گئی تھی۔

نوازشریف نے وضاحت دی کہ پرویز مشرف کارگل جنگ کے فوراً بعد ہی مارشل لاء لگانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔نواز شریف کو اڈیالہ جیل منتقل کیا گیا جہاں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی قید رہ چکے ہیں۔ مارچ ہی کے مہینے میں نواز شریف کے وکیل اقبال رعد کو کراچی میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ذرائع کے مطابق اس وقت آرمی نواز شریف کو سزائے موت دینے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکی تھی۔اس طرح کی اطلاعات کے بعد امریکا اور خاص طور پر سعودی عرب نے پرویز مشرف پر شدید دباؤ ڈالا کہ نواز شریف کو سزائے موت دینے کے بجائے جلاوطن کیا جائے۔دسمبر 2000 میں نواز شریف نے ایک معاہدے پر دستخط کیے کہ وہ آئندہ کبھی سیاست میں حصہ نہیں لینگے اور 10 سال تک پاکستان واپس نہیں آئینگے۔سعودی عرب نے اس معاہدے میں ضمانتی کا کردار ادا کیا۔

آئین میں تبدیلیاں

پرویز مشرف نے اپنے ٹیک اوور کے کچھ عرصے بعد سپریم کورٹ کے تمام ججز سے نیا اوتھ لینے کا حکم جاری کیا۔ یہ اوتھ مارشل لاء کی ضروریات کے مطابق تھا۔کئی ججز نے حلف لینے سے انکار کر دیا تاہم بہت سے راضی ہو گئے۔حلف لینے والے ججز میں افتخار محمد چودھری بھی شامل تھے۔12 مئی 2000 کو سپریم کورٹ نے پرویز مشرف سے کہا کہ وہ 12 اکتوبر 2002 تک عام انتخابات کروا دیں۔ صدر رفیق تارڑ جون 2001 تک اپنے عہدے پر برقرار رہے۔ان کے استعفے کے بعد پرویز مشرف نے 20 جون 2001 کو صدارت کو عہدہ سنبھال لیا۔ اگست 2002 میں پرویز مشرف نے ایل ایف او 2002 جاری کیا جس میں متعدد آئینی تبدیلیاں کیں گئیں۔ اسی عرصے میں 30 اپریل 2002 میں مشرف نے ایک صدارتی ریفرینڈم کروایا۔اس انتہائی متنازع ریفرنڈم میں 98 فیصد عوام نے انہیں آئندہ 5 سال کے لیے صدر منتخب کر لیا۔

2002 کے عام انتخابات

پرویز مشرف نے سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے ملک بھر میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ 2002 میں ہونے والے ان انتخابات میں پرویز مشرف کی حامی جماعت مسلم لیگ ق نے واضح اکثریت حاصل کی تاہم وہ قطعی اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ مسلم لیگ ق نے مذہبی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے اور ایم کیو ایم کے ساتھ اتحاد کر کے حکومت بنائی اور تینوں نے پرویز مشرف کی حکومت کو سپورٹ کیا۔

انتخابات کے بعد مسلم لیگ ق نے ظفر اللہ خان جمالی کو وزارت عظمیٰ کے لیے نامزد کیا جس کی پرویز مشرف نے توثیق کر دی۔ پارلیمنٹ کے پہلے اجلاس کے فوراً بعد پرویز مشرف نے رضا کارانہ طور پر چیف ایگزیکٹو کے اختیارات وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی کو منتقل کر دیئے۔ پرویز مشرف نے کامیابی سے پارلیمنٹ کے ذریعے آئین میں 17 ویں ترمیم کرائی جس کے ذریعے پارلیمنٹ کو سپریم کورٹ کی اجازت کے بعد تحلیل کرنے کا آئینی اختیار حاصل کر لیا۔

دو سال کے عرصے میں جمالی ایک غیر موثر وزیر اعظم ثابت ہوا جس نے طاقت کے ذریعے اپنی پالیسیاں ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کیں اور ملک کے اعلی کاروباری طبقے کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہو گئے۔ پرویز مشرف نے ظفر اللہ جمالی کا استعفی منظور کیا اور اپنے قریبی ساتھی چودھری شجاعت حسین سے نیا وزیر اعظم نامزد کرنے کو کہا۔ شجاعت حسین نے شوکت عزیز کو نامزد کیا جو بطور وزیر خزانہ 1999 میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ شوکت عزیز کے وزیر اعظم بنتے ہی پرویز مشرف نے تمام ایگزیکٹیو اختیارات شوکت عزیز کو منتقل کر دیئے۔

شوکت عزیز نے بہت تیزی اور خاموشی سے ان سیاسی عناصر کو بھی بے اثر کر دیا

جو پرویز مشرف کے خلاف تھے جس کی وجہ سے پرویز مشرف کا ان پر بھروسہ بڑھ گیا۔ 2004 سے 2007 کے عرصے کے دوران شوکت عزیز نے بہت سے ایسے پراجیکٹس منظور کرائے جن کو پرویز مشرف کی منظوری کی ضرورت نہیں تھی۔

پرویز مشرف اور لبرل ازم

پرویز مشرف کے دور میں لبرل طاقتوں نے کافی استحکام حاصل کیا۔ بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ اور ہر طرح کے جرائم میں ملوث ایم کیو ایم کو کراچی میں کھلی چھوٹ دی گئی جس کے نتیجے میں اس نے وہ طاقت دوبارہ پکڑ لی جو بے نظیر کے دوسرے دور حکومت میں نصیر اللہ بابر کے آپریشن کے نتیجے میں اس سے چھن گئی تھی۔ مشرف کے دور میں نسبتاً زیادہ ماڈرن کلچر کو فروغ ملا۔ اسی وجہ سے پاکستانی میڈیا میں بے حیائی پھیلنے لگی اور میڈیا پر پہلی بار انڈین پروگرام دکھائے جانے لگے۔ بہت سے اداروں کو پرائیویٹ چینلز کھولنے کی اجازت ملی۔ بعد میں میڈیا کی اسی آزادی نے خود پرویز مشرف کو سب سے پہلے ڈسا۔

سیاسی طور پر پرویز مشرف کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا بے نظیر بھٹو کی جانب سے کرنا پڑا۔ ان کے علاوہ ایم ایم اے کے سربراہ شاہ احمد نورانی بھی پرویز مشرف کے خلاف حکومت کا حصہ ہوتے ہوئے اپوزیشن کا کردار ادا کرتے رہے۔ تاہم نورانی کی وفات کے بعد ایم ایم اے غیر جانبدار ہو گئی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی

پرویز مشرف نے نائن الیون کے حملوں کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے میں اس کا ساتھ دیا۔ 13 ستمبر 2001 کو پاکستان میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین کے ذریعے پرویز مشرف کے سامنے واشنگٹن نے سات مطالبات رکھے۔ نہ ماننے کی

صورت میں پاکستان پر حملے کی دھمکی دی گئی۔ پرویز مشرف نے کچھ رد وقد کے بعد ان مطالبات کو تسلیم کر لیا اور یوں اس جنگ میں پاکستان باقاعدہ طور پر شامل ہو گیا۔ بظاہر تین دہائیوں پر مشتمل افغان پالیسی تبدیل کر دی گئی۔ افغانستان میں لڑنے والے بہت سے جنگجو وہ تھے جن کو جنرل ضیاء اور بعد میں پاکستان آرمی کی بھرپور مدد حاصل رہی۔ لیکن جب پرویز مشرف نے اعلان کیا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا اتحادی ہے تو یہ بہت سے لوگوں کی طرف سے پاکستان کی افغان پالیسی پر ایک بڑا یوٹرن قرار دیا گیا۔

11 ستمبر کے حملوں کے کچھ مہینے بعد پرویز مشرف نے دہشت گردی کے خلاف ایک تقریر کی۔ اس کے بعد پاکستانی مدارس میں پڑھنے کے لیے آنے والے غیر ملکی لڑکوں کے خلاف پابندیاں عائد کر دیں گئیں اور ویزے کی شرائط سخت کر دی گئیں۔ ستمبر 2005 کو پرویز مشرف نے امریکن جیوش کانگرس کونسل فار ورلڈ جیوری کے زیر اہتمام نیویارک میں ہونے والے ایک سیمینار میں یہودیوں کے بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں نہ صرف اسلام کی ایک نئی تعریف پیش کی بلکہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے اشارے بھی دیئے۔ پرویز مشرف کی اس تقریر پر عرب ممالک کے بہت سے لیڈروں نے بڑے پیانے پر تنقید کی جبکہ کئی بڑے یہودی لیڈروں نے اس کی تعریف کی۔

2001 میں بھارتی ریاست گجرات میں آنے والے زلزلے کے بعد پرویز مشرف نے بھارتی وزیر اعظم کو اپنا ہمدردانہ پیغام بھیجا اور زلزلہ متاثرین کے لیے ایک ہوئی جہاز بھر کر امدادی سامان بھی روانہ کیا۔ 2006 میں شاہ عبداللہ نے پاکستان کا دورہ کیا یہ ان کا سعودی عرب کا بادشاہ بننے کے بعد پہلا دورہ تھا۔ پرویز مشرف نے شاہ عبداللہ کو نشان پاکستان کا اعزاز عطا کیا۔ پرویز مشرف کو شاہ عبداللہ کی جانب سے کنگ عبداللہ میڈل کا اعزاز عطا کیا گیا۔

نیوکلیئر سکینڈل

پرویز مشرف کی حکومت میں پاکستان کو اپنے نیوکلیئر پروگرام کے حوالے سے بہت سے سکینڈلز کا سامنا کرنا پڑا۔ کتوبر 2001 میں پرویز مشرف کے حکم پر پاکستان کے دو سائنس دانوں سلطان بشیر الدین محمود اور چودھری عبد المجید کو طالبان سے رابطے کے ثبوت ملنے پر ایف آئی اے کے ذریعے گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے 2000 میں افغانستان کا خفیہ دورہ کیا اور طالبان کی حکومت سے ملاقات کی تھی۔

پاکستان بھر کے میڈیا میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ بشرالدین محمود نے اسامہ بن لادن سے ملاقات کی تھی اور اسامہ نے خام قسم کے ریڈیو ایکٹیو ہتھیار بنوانے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ بعد میں یہ خبریں بھی سامنے آئیں کہ دونوں سائنس دانوں میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ خود سے اس قسم کا سارا کام کر لیتے۔ ان دونوں سائنس دانوں کے پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں کام پر بھی بہت سے سوالات اٹھائے گئے۔ دسمبر 2001 میں ان دونوں سائنسدانوں کو جے اے جی کے حوالے کر دیا گیا جہاں ان کے خلاف مقدمے کی سماعت 2002 تک جاری رہی۔

دوسرا اور زیادہ خطرناک معاملہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے متعلق تھا جن پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے دنیا کے کئی ممالک کو ایٹمی معلومات بیچی ہیں۔ 27 فروری 2001 کو پرویز مشرف نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں انکی بے پناہ تعریف و توصیف کی۔ 2001 میں ہی ڈاکٹر عبدالقدیر کو پاکستان کا مشیر برائے سائنس بنایا۔ 2004 میں ڈاکٹر عبدالقدیر سے متعلق یہ معاملات سامنے آنے پر پرویز مشرف نے ان کو انکے عہدے سے ہٹا دیا اور حکومت پاکستان اور پاک فوج کی اس سارے معاملے سے لاعلمی ظاہر کی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر اس بات پر زور دیتے رہے کہ اس سارے معاملے کے

اصل کرتا دھرتا پرویز مشرف ہی ہیں۔ اسکے بعد پرویز مشرف نے ڈاکٹر عبدالقدیر کا کیس سننے کے لیے ایک کونسل بنائی جوان کے استعفےٰ دینے تک اس کیس کی سماعت کرتی رہی۔ اس موقع پر یہ بھی کہا گیا کہ پرویز مشرف نے اس دوران ڈاکٹر عبدالقدیر سے بدسلوکی کی تاکہ امریکہ کو خوش کیا جاسکے۔

اس معاملے کی وجہ سے پرویز مشرف اور ڈاکٹر عبدالقدیر دونوں کی عوام میں عزت وتوقیر میں کمی آئی۔ بے نظیر بھٹو نے اس معاملے میں پرویز مشرف پر زبردست تنقید کی اور ڈان نیوز کو انٹرویو دیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کو استعمال کیا گیا ہے اور مجھے یقین نہیں کہ پرویز مشرف کی ناک کے نیچے یہ سب ہوتا رہا اور انہیں علم ہی نہیں ہوا۔ اور تو اور پرویز مشرف کی دیرینہ اتحادی ایم کیو ایم نے بھی اس سارے معاملے میں پرویز مشرف پر زبردست تنقید کی۔ سیاسی جماعتوں نے اس معاملے کو سیاسی رنگ دیا اور عوام کو مشرف کے خلاف خوب اکسایا۔ اس معاملے کے بعد پرویز مشرف پر امریکہ کا اعتماد بھی ٹوٹ گیا۔ امریکہ نے پرویز مشرف پر دباؤ ڈالا کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف مزید ایکشن لیں۔ پرویز مشرف نے انکار کر دیا۔ تاہم بطور صدر وہ کافی کمزور ہو گئے تھے جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی عوام میں عزت برقرار رہی۔ پرویز مشرف نے امریکی فرمائش کے برعکس ڈاکٹر عبدالقدیر کو معاف کر دیا تاہم انکی نقل وحرکت محدود کر دی اور انکی سیکیورٹی بڑھا دی۔ اس کے بعد پرویز مشرف نے فوری طور پر یہ سارا معاملہ وزیراعظم شوکت عزیز کے سپرد کر دیا۔

4 جولائی 2008 کو ڈاکٹر عبدالقدیر نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اس سارے معاملے کے ذمہ دار بے نظیر بھٹو تھیں جنہوں نے ٹیکنالوجی بیچی اور پرویز مشرف ہی ان ڈیلز کے بگ باس تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر نے کہا کہ پرویز مشرف نے شمالی کوریا کو سنٹری فیوجز دیئے اور یہ سارا کام پاک فوج کی زیرنگرانی کیا گیا۔ بعدازاں پرویز مشرف کے استعفیٰ کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر کی نظر بندی ختم کر دی گئی۔ پرویز مشرف کی پاکستان سے خودساختہ جلا

وطنی کے بعد نئے آنے والے چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی طارق مجید نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے متعلق باقی معاملات بھی ختم کروادیئے۔

جب پرویز مشرف اقتدار میں آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ کرپشن کا خاتمہ کردینگے تاہم ان کے دور میں بھی کرپشن میں کوئی کمی نہیں آئی۔دسمبر 2003 میں پرویز مشرف نے ایم ایم اے سے ایک ڈیل کی جس میں وعدہ کیا کہ وہ 31 دسمبر 2004 کو آرمی چیف کے عہدے سے استعفیٰ دے دینگے۔ایم ایم اے کی حمایت ملنے کے بعد پرویز مشرف 17 ویں آئینی ترمیم کرنے کے قابل ہوئے اوراس کے 1999 اوراسکے بعد ہونے والے تمام تر اقدامات کو آئینی شکل دی گئی۔لیکن بعد میں ایم ایم اے ہی کی سپورٹ سے پرویز مشرف نے پارلیمنٹ میں ایک بل پاس کروایا جس کے بعد وہ چیف آف آرمی سٹاف اور صدر پاکستان دونوں عہدے رکھنے کے قابل ہوگئے۔یکم جنوری 2004 کو پرویز مشرف نے پارلیمنٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ لیا۔پرویز مشرف نے 1170 میں سے 658 ووٹ لیے تھے جو 56 فیصد اکثریت بنتی ہے۔اسکے بعد وہ 2007 تک حکومت کرنے کے قابل ہوگئے۔

حقوق نسواں بل

تحفظ نسواں بل 15 نومبر 2006 کو پارلیمنٹ نے اور 23 نومبر 2006 کو سینٹ نے منظور کرلیا۔پرویز مشرف نے اس بل پر یکم دسمبر 2006 کو دستخط کیے۔اس بل کے تحت ریپ کا جرم ثابت کرنے کے لیے 4 گواہوں کی موجودگی والی شرائط کو نرم کیا گیا تھا۔تاہم اس بل پر بہت زیادہ تنقید کی گئی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کیس، لال مسجد آپریشن ،اور چیف جسٹس افتخار چودھری کی برطرفی سمیت کئی معاملات پر بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے پرویز مشرف کے خلاف موثر

تحریک چلائی۔شوکت عزیز کی وزارت عظمٰی کے خاتمے کے بعد پرویز مشرف کو ان کا متبادل نہ مل سکا اور وہ بطو صدر کمزور ہوتے چلے گئے۔انکے خلاف تحریکیں کامیاب ہونے لگیں۔

افتخار چودھری کی معطلی اور بحالی

9 مارچ 2007 کو پرویز مشرف نے کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزام میں چیف جسٹس افتخار چودھری کو انکے عہدے سے برطرف کردیا اور انکی جگہ جسٹس جاوید اقبال کو نیا چیف جسٹس مقرر کیا۔اسکے جواب میں پاکستان بھر میں افتخار چودھری کی حمایت میں وکیلوں کی ایک تحریک شروع ہوگئی۔12 مارچ 2007 کو وکلا نے اپنی تحریک کو عدلیہ کی آزادی کا نام دیتے ہوئے ملک بھر میں عدالتیں بند کروادیں۔ کراچی، لاہور، اسلام اباد اور کوئٹہ سمیت ملک بھر کے کئی شہروں میں سینکڑوں وکلاء نے سیاہ لباس پہن کر پرویز مشرف کے خلاف جلوس نکالے۔ان وکیلوں کے ساتھ فوراً ہی پاکستان کی سیاسی جماعتیں بھی شامل ہوگئیں اور پرویز مشرف کے خلاف ملک بھر میں بڑی بڑی ریلیاں نکالی جانے لگیں۔

لال مسجد آپریشن

اسلام آباد میں لال مسجد کے قریب مدرسہ اور خواتین کے لیے جامعہ حفصہ نامی تعلیمی ادارہ تھا۔اپریل 2007 میں اس مدرسے کی انتظامیہ نے مدرسے میں پڑھنے والے طلباء کو مقامی ویڈیو شاپس اور ایک مساج سنٹر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ان حملوں کے لیے مسجد کی انتظامیہ نے خواتین طلبہ کا استعمال کیا۔ جولائی 2007 میں باقاعدہ محاذ آرائی تب شروع ہوئی جب حکومت نے اس سلسلے کو روکنے کی کوشش کی اور پولیس بھیجی تاکہ بچیوں سے یہ کام لینے والوں کو گرفتار کیا جائے۔جب مسجد سے اسلحہ بردار مسلح افراد برآمد ہوئے اور

انہوں نے پولیس پر حملہ کیا تو یہ معاملہ بگڑ گیا۔ چنانچہ مشرف حکومت نے لال مسجد کو مسلح افراد سے خالی کرانے کے لیے فوجی آپریشن کیا جس میں بڑی تعداد میں طالبات ہلاک ہو گئیں۔

نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی واپسی

8 اگست 2007 کو بے نظیر بھٹو نے کینیڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو انٹرویو میں پرویز مشرف کے ساتھ اپنی 27 جولائی کو ہونے والی ایک خفیہ میٹنگ کا تذکرہ کیا۔ 14 ستمبر 2007 کو وزیر اطلاعات طارق عظیم نے بیان دیا کہ بے نظیر بھٹو کو واپس نہیں بھیجا جائے گا تاہم انہیں کرپشن والے کیسز کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ نواز شریف اور بھٹو دونوں کو پاکستان واپس آنے کا حق ہے۔ 8 سال کی خود ساختہ جلاوطنی کے بعد 18 اکتوبر کو بے نظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں۔ پاکستان واپسی پر ان کا کراچی ائیر پورٹ پر فقید المثال استقبال کیا گیا۔ بے نظیر کا کارواں شاہراہِ فیصل پر مزارِ قائد کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک زوردار دھماکے ہوئے جس کے نتیجے میں دو سو سے زائد افراد ہلاک جبکہ سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن جب اپنے بچوں (بلاول، بختاور اور آصفہ) سے ملنے دوبارہ دبئی گئیں تو مشرف نے 3 نومبر کو ایمرجنسی نافذ کر دی۔ یہ خبر سنتے ہی بے نظیر دبئی سے واپس وطن لوٹ آئیں۔ ایمرجنسی کے خاتمے، ٹی وی چینلز سے پابندی ہٹانے اور سپریم کورٹ کے ججز کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہوئے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ اس وقت تک ملک میں نگران حکومت بن چکی تھی اور مختلف پارٹیاں انتخابات میں حصہ لینے کے معاملے میں بٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پیپلز پارٹی نے میدان خالی نہ چھوڑنے کی حکمتِ عملی کے تحت تمام حلقوں میں امیدوار کھڑے کیے اور کاغذاتِ نامزدگی جمع کرائے۔

27 دسمبر 2007ء کو جب بے نظیر لیاقت باغ میں عوامی جلسے سے خطاب کرنے کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسلام آباد آ رہی تھیں تو اسی وقت لیاقت باغ کے مرکزی دروازے پر پیپلز یوتھ آرگنائزیشن کے کارکن بے نظیر بھٹو کے حق میں نعرے بازی کر رہے تھے۔ اس دوران جب وہ پارٹی کارکنوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے گاڑی کی چھت سے باہر نکل رہی تھیں کہ نامعلوم شخص نے ان پر فائرنگ کر دی۔ اس کے بعد بے نظیر کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک زوردار دھماکہ ہوا جس میں ایک خودکش حملہ آور جس نے دھماکہ خیز مواد سے بھری ہوئی بیلٹ پہن رکھی تھی، خود کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس دھماکے میں بینظیر بھٹو جس گاڑی میں سوار تھیں، اس کو بھی شدید نقصان پہنچا لیکن گاڑی کا ڈرائیور اسی حالت میں گاڑی کو بھگا کر راولپنڈی جنرل ہسپتال لے گیا جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گئیں۔ بے نظیر کی وصیت کے مطابق پیپلز پارٹی کی قیادت ان کے 19 سالہ بیٹے بلاول زرداری بھٹو کو وراثت میں سپرد کر دی گئی۔

نواز شریف ستمبر 2007 میں پاکستان آئے جن کو فوری طور پر ائیر پورٹ پر ہی گرفتار کر کے سعودی عرب دوبارہ واپس بھیج دیا گیا۔ سعودی عرب کے اس وقت کے انٹیلی جنس چیف اور لبنانی سیاست دان سعد ہریری الگ الگ اسلام آباد پہنچے۔ سعودی انٹیلی جنس چیف پرویز مشرف کے لیے شاہ کا پیغام لے کر آئے جبکہ ہریری لندن میں نواز شریف سے کے ملاقات کے بعد آئے تھے۔ ڈھائی گھنٹوں کی اس ملاقات کے بعد مشرف نواز شریف کی واپسی کے لیے راضی ہو گئے۔

آرمی کے عہدے سے استعفیٰ

2 اکتوبر 2007 کو پرویز مشرف نے جنرل طارق مجید کو جوائنٹ چیف آف سٹاف اور 8 اکتوبر کو جنرل اشفاق پرویز کیانی کو وائس چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا۔ 28

نومبر 2007 کو مشرف کے استعفے کے بعد اشفاق پرویز کیانی کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا۔ مارچ 2007 میں پرویز مشرف نے ایک انٹرویو میں کہا کہ انکی مزید 5 سال تک ملک کا سربراہ رہنے کی خواہش ہے۔ سپریم کورٹ پرویز مشرف کی نااہلیت کے لیے 6 درخواستیں دائر کی گئیں۔ 28 ستمبر 2007 کو سپریم کورٹ کے رانا بھگوان داس نے 3 کے مقابلے میں 6 ووٹوں سے پرویز مشرف کے خلاف دائر نااہلیت کی اپیل کو مسترد کردیا۔

18 فروری 2008 میں ملک بھر میں عام انتخابات کروائے گئے جس میں پاکستان پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ (ن) دوسرے نمبر آئی جبکہ مسلم لیگ (ق) تیسرے نمبر پر سب سے بڑی سیاسی جماعت رہی۔ تحریک انصاف نے اس الیکشن کا بائی کاٹ کیا تھا۔ 23 مارچ 2008 کو پرویز مشرف نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جمہوری دور شروع ہو چکا ہے اور انہوں نے پاکستان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ 22 مارچ کو پیپلز پارٹی نے ابتدا میں مخدوم امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے کا اشارہ دیا مگر بعد میں وزارت عظمیٰ کے لیے قومی اسمبلی کے سابق سپیکر سید یوسف رضا گیلانی کو نامزد کیا تاکہ وہ پرویز مشرف کے خلاف حکومت کی قیادت کرسکیں۔

7 اگست 2008 کو پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ پرویز مشرف پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنی صدارت کی کرسی چھوڑ دیں۔ آصف علی زرداری اور نواز شریف نے اعلان کیا کہ وہ پرویز مشرف کو ایک چارج شیٹ اور درخواست بھیجیں گے کہ وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دیتے ہوئے خود کو پارلیمنٹ کے سامنے احتساب کے لیے پیش کردیں۔ پرویز مشرف نے استعفیٰ دینے سے انکار کردیا۔ ایک چارج شیٹ تیار کی گئی جس کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جانا تھا۔

اس چارج شیٹ میں پرویز مشرف کے 1999 کے مارشل لاء اور نواز شریف کی گرفتاری اور جلاوطنی کے علاوہ 3 نومبر کی ایمرجنسی کے اقدامات شامل تھے۔ اس چارج

شیٹ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے بھی پرویز مشرف کے کچھ اقدامات کو شامل کیا گیا تھا۔ پرویز مشرف نے بیجنگ جانے کا پروگرام ایک دن کے لیے موخر کر دیا۔ 11 اگست کو حکومت نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا۔ پرویز مشرف کا جانا ٹھہر چکا تھا۔ چنانچہ 18 اگست 2008 کو انہوں نے صدارت کے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر قوم سے خطاب میں انہوں نے اپنے 9 سالہ اقتدار کے حوالے سے صفائی پیش کی اور لندن چلے گئے۔

آج کا پاکستان

بے نظیر بھٹو کے قتل سے ایک ماہ بعد عام انتخابات ہوئے جن کا نتیجہ حسب توقع پیپلز پارٹی کے حق میں آیا۔ پی پی پی نے قومی اسمبلی میں 122 نشستیں حاصل کیں، نواز گروپ نے 92 نشستیں، 25 نشستیں متحدہ قومی موومنٹ نے اور عوامی نیشنل پارٹی نے 13 نشستیں حاصل کیں۔

پیپلز پارٹی نے مرکز میں دوسری جماعتوں، خاص طور سے مسلم لیگ نون کے اشتراک سے حکومت بنائی۔ گو کہ یہ اتحاد زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا، لیکن متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کئی سال تک پیپلز پارٹی کے ساتھ رہیں جبکہ مسلم لیگ قاف بہت بعد میں حکومت کے ساتھ اتحاد میں شامل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ کہ مشرف کے استعفے کے بعد زرداری کو ملک کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں دو وزیر اعظم آئے، یوسف رضا گیلانی جن کو عدالت کی توہین پر نا اہل قرار دے دیا گیا تھا، دوسرے راجہ پرویز اشرف جن کو گیلانی کی برطرفی کے بعد وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ ملکی تاریخ میں یہ پہلی منتخب غیر فوجی حکومت تھی جس نے اپنی معیاد پوری کی اور اس دوران کسی قسم کی فوجی مداخلت نہیں ہوئی۔

2013ء کے انتخابات

مسلم لیگ نواز گیارہ مئی کو منعقد ہونے والے عام انتخابات میں سب سے زیادہ

ووٹ لینے والی جماعت کے طور پر سامنے آئی اور اس نے قومی اسمبلی میں کل ووٹوں میں سے تقریباً ایک تہائی ووٹ حاصل کیے۔ الیکشن کمیشن کے مطابق 2013 کے عام انتخابات میں ووٹنگ کی شرح 55 فیصد رہی جو کہ 2008 کے الیکشن کی نسبت 11 فیصد زیادہ تھی۔

قومی اسمبلی کے ڈالے گئے ووٹوں کے تناسب سے عمران خان کی جماعت پاکستان تحریک انصاف ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری جبکہ تیسرے نمبر پر آنے والی پیپلز پارٹی کی قومی اسمبلی کے الیکشن میں ووٹ لینے کی شرح صرف پندرہ فیصد رہی جو کہ 2008 کی نسبت نصف تھی۔ کمیشن کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق انتخابات میں مرکز اور پنجاب میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت مسلم لیگ (ن) نے قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مجموعی طور پر دو کروڑ 78 لاکھ 23 ہزار 314 ووٹ حاصل کیے۔

قومی اسمبلی میں مسلم لیگ ن کے ووٹوں کی تعداد 14874104 رہی جو کہ مجموعی ووٹوں کے تینتیس فیصد کے قریب ہے جبکہ گزشتہ الیکشن میں اسے قومی اسمبلی میں 19 فیصد ووٹ ہی مل سکے تھے۔ مسلم لیگ ن پنجاب سے 11365363 ووٹ لے کر صوبے میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والی جماعت رہی۔ اسے پنجاب سے کُل ووٹوں میں سے چالیس اعشاریہ آٹھ فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ دیگر صوبوں میں سے خیبر پختونخوا میں نواز لیگ 856135 ووٹ لے کر سب سے زیادہ ووٹ لینے والی جماعتوں میں دوسرے اور بلوچستان میں 134758 ووٹوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہی۔

2008 کے الیکشن کے بعد حکومت بنانے والی پیپلز پارٹی کی کارکردگی سندھ کے علاوہ تمام صوبوں اور مرکز میں مایوس کن ہی رہی۔ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ووٹ لینے کی شرح صرف پندرہ فیصد رہی۔ اس الیکشن میں پیپلز پارٹی کو مجموعی طور پر ایک کروڑ اکتیس لاکھ دس ہزار دو سو بیالیس ووٹ ملے۔ پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں 6911218 ووٹ

لیے جبکہ گزشتہ الیکشن میں اسے 10666548 ووٹ ملے تھے۔ یوں ووٹنگ کی مجموعی شرح میں اضافے کے باوجود پیپلز پارٹی کو سینتیس لاکھ پچپن ہزار تین سو تین ووٹ کم ملے۔
اس الیکشن میں قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ووٹ لینے کی شرح صرف پندرہ فیصد رہی جو کہ 2008 کی نسبت نصف ہے۔

سندھ اسمبلی میں پیپلز پارٹی اگرچہ سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی لیکن یہاں بھی اس کا ووٹ بینک کم ہوا۔ سندھ میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں اس جماعت نے 3209686 ووٹ لیے جو کہ کل ووٹوں کے تو 33 فیصد کے قریب ہے لیکن 2008 کے مقابلے میں یہ تقریباً نو فیصد کم ہے۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کو بڑے پیمانے پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے حاصل کردہ ووٹوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ 2008 میں صوبے میں ساڑھے پچپن لاکھ کے قریب ووٹ لینے والی یہ جماعت اس مرتبہ چوبیس لاکھ چونسٹھ ہزار آٹھ سو بارہ ووٹ ہی لے پائی اور یوں صوبے میں اس کے مجموعی ووٹ بینک میں تقریباً اٹھارہ فیصد کی کمی ہوئی۔

خیبر پختونخوا میں پیپلز پارٹی کو 2008 کے مقابلے میں نوے ہزار کم ووٹ ملے اور یہ تعداد 472550 رہی جبکہ بلوچستان میں یہ جماعت 51976 ووٹ لے سکی اور یہاں 2008 کے مقابلے میں فرق ایک لاکھ چودہ ہزار ووٹ کا رہا۔

تحریک انصاف نے سندھ میں چھ لاکھ سے زیادہ ووٹ لے کر اپنی موجودگی کا احساس دلوایا۔ عمران خان کی جماعت پی ٹی آئی نے 2008 میں تو الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا لیکن پانچ برس بعد الیکشن میں وہ ووٹوں کے اعتبار سے دوسری بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ تحریکِ انصاف نے اس الیکشن میں 14302302 ووٹ حاصل کیے اور جہاں وہ قومی اور پنجاب اسمبلی میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والی جماعتوں میں دوسرے نمبر پر رہی وہیں خیبر پختونخوا کی اسمبلی میں اس نے سب سے زیادہ ووٹ لیے۔

خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف نے 1039719 ووٹ لے کر کُل ووٹوں کا انیس اعشاریہ چھ فیصد حاصل کیا تو سندھ میں چھ لاکھ سے زیادہ ووٹ لے کر اپنی موجودگی کا احساس دلوایا۔ پنجاب میں تحریکِ انصاف 4951216 ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی اور صوبے میں نشستوں کے ساتھ ساتھ ووٹوں کے اعتبار سے بھی دوسری بڑی جماعت بنی۔ تینوں صوبوں کے برعکس صوبہ بلوچستان میں پی ٹی آئی کی کارکردگی کچھ خاص نہ تھی اور اسے صرف چوبیس ہزار ووٹ ملے جو کہ کل ووٹوں کے ایک اعشاریہ آٹھ فیصد کے برابر ہیں۔

آج کا پاکستان

اقبال کو رخصت ہوئے تقریباً تین چوتھائی صدی گزر چکی ہے۔ پاکستان کو معرض وجود میں آئے ہوئے بھی چھیاسٹھ برس گزر چکے۔ ہمیں ناز اس بات پر ہے کہ پاکستان کا خواب اقبال نے دیکھا اور قائداعظم نے اس کی تعبیر کی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آتا ہے کہ کیا آج کا پاکستان وہی پاکستان ہے جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور کیا اگر ان کا خواب آج کا پاکستان ہوتا تو قائداعظم واقعی اس کی تعبیر کیلئے کوشاں ہوتے؟

آج مجھے اقبال کی نظم ''صدائے درد'' یاد آرہی ہے۔ گرچہ یہ نظم اس دور کی تخلیق ہے جب نہ تو پاکستان کا تصور تھا اور شاید اس وقت اقبال نے یہ خواب دیکھا بھی نہ ہو (یہ نظم لگ بھگ 1905 میں لکھی گئی تھی) لیکن آج کے پاکستان میں جس کی زمین تشدد کے نتیجے میں بہنے والے خون سے سرخ ہورہی ہے، فرقہ واریت کا سانپ ڈس رہا ہے اور بنیاد پرستی کے نتیجے میں تعصب کی ہوا چل رہی ہے، یہ نظم حرف بحرف صادق آتی ہے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل،کیسا، یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کہ یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پر مرا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
دانہء خرمن نما ہے شاعر معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں
حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو
ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں
کب زباں کھولی ہماری لذّت گفتار نے؟
پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آتش پیکار سرزمین پاکستان کو داغ داغ کر دینے کے درپے ہے۔ اقبال انسانیت کے نغمہ خوان تھے اور ان کے قلم نے لکھا تھا:

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

اقبال کے فلسفہ کا دن رات کلمہ پڑھنے والے آج درد کا سبب کیوں بن رہے

ہیں؟ اقبال کی ایک اور نظم سید کی لوح تربت کے چند شعر سنیے:

وا نہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں
چھپ کہ ہے بیٹھا ہوا ہنگام محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

فرقہ واریت کے جن کو اقبال نے ہنگام محشر کی وجہ قرار دیا تھا۔ آج یہی جن بوتل سے باہر نکل آیا ہے۔ آج ہم کیوں اپنی قوتیں اور اپنے امکانات اس بوتل کے جن کو بند کرنے کیلئے استعمال کرنہیں پا رہے۔ اقبال نے ان دنوں بھی ارباب سیاست سے کہا تھا:

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا، نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

آج ہمارا ملک گوناگوں مصائب میں گھرا ہوا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں بیشتر مسائل اور مصیبتیں ہماری اپنی ناقص حکمت عملی کی پیدا کردہ ہیں۔ کیا مشہور نظم ''تصویر درد'' میں اقبال کا یہ شعر ہمارے آج کے پرخوں دور کی ترجمانی نہیں کرتا اور ہمیں خبردار نہیں کرتا؟

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یوں لگتا ہے جیسے اقبال قوم کی مستقبل کی صورت حال سے پیشگی واقف ہوں۔
انہوں نے اپنی ایک نظم میں جو باتیں کہیں ہیں وہ ہماری موجودہ حالت کی غمازی کرتی ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں، دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطر قراں کو چلیپا کر دیا تو نے!
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل!
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے

اقبال کا یہ کلام ان کی شاعری کے دور اولین سے تعلق رکھتا ہے اور بانگ درا میں شامل ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کہے گئے یہ اشعار آج اکیسویں صدی میں بھی یوں نظر آتے ہیں جیسے آج ہی کیلئے لکھے گئے ہوں۔ ہم اقبال کی وراثت کے دعویداروں نے نہ تو کل ان کی باتوں پر دھیان دیا تھا اور نہ ہی آج سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا شاعر مشرق اور مفکر پاکستان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہو گی؟

پرائی آگ

لفظ طالب یا طالبان ان جنگجوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے ملا محمد عمر کی قیادت میں 2001ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ نائن الیون کے بعد جب نیٹو اور امریکی افواج نے افغانستان پہ حملہ کیا تو بہت سارے افغان طالبان اور القاعدہ رہنما پاکستانی وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے، ان جنگجوؤں میں افغان طالبان کے ساتھ ساتھ القاعدہ سے وابستہ بہت سے عرب، ازبک اور چیچن جہادی بھی شامل تھے۔

پاکستان کا افغانستان سے منسلک یہ قبائلی علاقہ سات ایجنسیوں پر مشتمل ہے جہاں ساٹھ کے قریب قبائل رہائش پذیر ہیں، ان قبائل کی اکثریت سنی مسلک سے وابستہ پختونوں کی ہے۔ ان کے علاوہ یہاں ایک قلیل تعداد شیعہ پختونوں اور سکھوں کی بھی ہے۔ ماضی قریب میں تحریک طالبان پاکستان فاٹا میں سب سے مضبوط اور طاقتور نیٹ ورک رکھنے والی تنظیم بن کر سامنے آئی تھی، ایک اندازے کے مطابق اس تنظیم میں 30 سے زائد چھوٹے بڑے جہادی گروہ شامل ہیں۔ افغان طالبان اور قبائلیوں کے مابین نہ صرف مسلکی ہم آہنگی ہے بلکہ پختون ولی یا روایتی پختون ضابطہ حیات کی قدر بھی مشترک ہے۔ فاٹا اور افغان پختون قبائل کے قریبی و تاریخی روابط اور اسی کی دہائی میں اس علاقہ کو جہادیوں اور پناہ گزینوں کے بیس کیمپ کی حیثیت سے استعمال کرنے کی وجہ سے فاٹا کے بعض قبائل افغان طالبان اور القاعدہ کے ہمدرد رہے ہیں۔ ان جنگجوؤں اور پاکستانی قبائل

کے مابین مسلکی مماثلت اور شادی بیاہ کے علاوہ مقامی افراد کے معاشی مفادات بھی ان جنگجوؤں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں جس کی وجہ سے افغان طالبان کو فاٹا میں پناہ ملنا ایک فطری عمل تھا۔ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستانی عسکری اداروں نے بھی نائن الیون کے بعد طالبان اور القاعدہ کے جنگجوؤں کو ان علاقوں میں پناہ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ بین الاقوامی دباؤ کے باوجود پاکستانی افواج نے افغان طالبان کی پشت پناہی جاری رکھی اور محض ان جنگجوؤں کے خلاف کارروائی کی جو پاکستانی افواج پر حملہ کرنے میں ملوث تھے۔ ان کے علاوہ دیگر جنگجوؤں کو چھوڑ دیا گیا۔

قبائلی علاقوں سمیت ملک بھر میں طالبان کے لیے پائی جانے والی ہمدردی اور شریعت کے نفاذ جیسے نعروں کے باعث پاکستان میں طالبان کی حمایت میں نائن الیون کے بعد بے تحاشہ اضافہ ہوا۔ برے طالبان کے خلاف کارروائی اور مشرف دور میں جہادی تنظیموں کو کالعدم قرار دیے جانے کے ردعمل کے طور پر پاکستانی افواج، ریاستی اداروں اور عام لوگوں پر طالبان حملوں میں اضافہ ہوا۔ ڈرون حملوں میں ہونے والے جانی نقصان کے باعث بھی پاکستانی فوج کے خلاف مقامی شدت پسندوں میں پاکستان مخالف جذبات بڑھے۔ اپنی جہادی کارروائیوں کا دائرہ پاکستان تک بڑھانے کے حامی طالبان کے منحرف ارکان نے دسمبر 2007 میں ایک مضبوط ایگزیکٹو کونسل بنائی جس نے آج تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کی صورت اختیار کر لی ہے۔

رفتہ رفتہ اس تنظیم میں لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی اور دیگر جہادی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کے ارکان نے بھی شمولیت اختیار کر لی۔ تحریک طالبان پاکستان فاٹا میں سب سے مضبوط اور طاقتور نیٹ ورک رکھنے والی تنظیم بن کر سامنے آئی۔ اس تنظیم کا پہلا امیر بیت اللہ محسود اور نائب حافظ گل بہادر کو بنایا گیا۔

تحریک طالبان پاکستان کا مقصد پاکستان میں افغان طالبان کی سخت گیر شریعت

کا نفاذ اور پاکستان اور افغانستان میں موجود غیر ملکیوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ ہے۔تحریک طالبان پاکستان میں سابق افغان طالبان کے ساتھ پنجاب میں فعال کالعدم فرقہ وارانہ تنظیموں کی شمولیت کے باعث اس تنظیم کی کارروائیوں کا دائرہ شیعہ ٹارگٹ کلنگ سمیت بریلوی مزارات پر حملوں تک پھیل گیا۔ٹی ٹی پی کی تشکیل میں اہم کردار شمالی اور جنوبی وزیرستان کے دو اہم قبائل محسود اور وزیر نے ادا کیا۔

اگست 2009 میں امریکی ڈرون حملے میں بیت اللہ محسود کی ہلاکت کے بعد حکیم اللہ محسود کو ٹی ٹی پی کا نیا امیر بنایا گیا،اس موقع پر قیادت کے حصول پر اختلافات کے باعث وزیر قبائل سے تعلق رکھنے والے دو اہم کمانڈر حافظ گل بہادر اور مولوی نذیر نے تحریک طالبان پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی۔بعض ماہرین کے نزدیک تحریک طالبان پاکستان کی تقسیم پاکستانی اداروں نے کی تھی کیونکہ ملا نذیر گروپ اور حافظ گل بہادر پاکستان سے بات کرنے کے حامی تھے۔بعدازاں علیحدہ ہونے والے گروہوں نے پاکستان کے خلاف کارروائیاں بھی بند کر دیں لیکن تحریک طالبان پاکستان نے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔تحریک طالبان پاکستان کی قبائلی علاقوں میں مقبولیت کی بڑی وجہ پاکستانی حکومت کا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں دوہرا کردار اور ڈرون حملے رہے ہیں۔سیکیورٹی فورسز کی جانب سے مقامی لشکروں کے ذریعے کارروائی کے بعد ان امن لشکروں کو تنہا چھوڑ دینے کی حکمت عملی نے بہت سے قبائل کو پاکستان حکومت کی بجائے طالبان کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔تحریک طالبان پاکستان نے متاثرہ علاقوں میں سولہ سے تیس ہزار ماہوار تنخواہ پر مقامی افراد کو اپنے لشکروں میں بھرتی کرنا شروع کر دیا جس کے باعث فاٹا،سوات، خیبر پختونخواہ اور جنوبی پنجاب سے مذہب کی طرف رجحان رکھنے والے نوجوانوں نے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔حکومت پاکستان کی جانب سے پسماندہ علاقوں کی ترقی اور قدرتی آفات سے متاثر ہونے والے افراد کی بحالی میں ناکامی کے باعث بھی اس تنظیم کے

اثرورسوخ میں اضافہ ہوا۔تحریک طالبان پاکستان نے پاکستانی افواج کے خلاف کارروائیوں کے ساتھ ساتھ کرم ایجنسی کے شیعہ پختونوں کو بھی نشانہ بنایا۔بعض ماہرین ٹی ٹی پی کے اس عمل کو کرم ایجنسی پر اپنے قبضے اور کابل تک آسان رسائی کے ذریعے اپنی کارروائیوں کو وسعت دینے کی حکمت عملی کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔

تحریک طالبان پاکستان اگرچہ خود کو افغان طالبان کا حصہ قرار دیتی ہے لیکن اس کے باوجود اس تنظیم اور اس میں شامل جنگجو گروہوں کا ایجنڈا افغان طالبان سے قدرے مختلف ہے۔افغان طالبان اور حقانی گروپ اپنی جنگ افغانستان تک محدود رکھتے ہوئے غیر ملکی افواج کے انخلا اور افغانستان پر قبضے تک رکھنا چاہتے ہیں جب کہ ٹی ٹی پی نیٹو اور امریکی افواج کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف بھی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے تاہم شریعت کے نفاذ کے حوالے سے دونوں طالبان دھڑوں کا ایک ہی موقف ہے۔ٹی ٹی پی پاکستان میں سخت گیر شریعت رائج کرنا چاہتی ہے جس کے لیے اس تنظیم نے فاٹا کے کچھ علاقوں میں موسیقی، وڈیو سی ڈیز کی دکانوں، داڑھی منڈوانے اور عورتوں کے گھروں سے نکلنے پر پابندی عائد کی تھی۔ایسی شریعت کے نفاذ کی پہلی کوشش ٹی ٹی پی کے موجودہ امیر ملا فضل اللہ کی تنظیم تحریک نفاذ شریعت محمدی نے سوات میں کی تھی اور وہاں سخت گیر شرعی قوانین نافذ کیے تھے۔نومبر 2013 میں ٹی ٹی پی کا امیر حکیم اللہ محسود ڈرون حملے میں مارا گیا جس کے بعد ملا فضل اللہ کو امیر بنایا گیا جو اس تنظیم کا پہلا ایسا امیر تھا جس کا تعلق فاٹا سے نہیں تھا۔ ملا فضل اللہ کے محسود نہ ہونے اور ان کی افغانستان میں موجودگی کی وجہ سے تحریک طالبان پاکستان میں شدید اختلافات سامنے آئے۔تحریک طالبان پاکستان کی دہشت گرد کارروائیوں کے باوجود دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی جانب سے فوجی کارروائی کی مخالفت کے باعث ٹی ٹی پی کے خلاف موثر کارروائی کا عمل تاخیر کا شکار رہا ہے۔تاہم 8 جون 2014 کو جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ کراچی پر تحریک طالبان پاکستان اور اسلامک

موومنٹ آف ازبکستان کے حملے کے بعد پاکستانی فوج نے شمالی وزیرستان میں پہلا بھرپور فوجی آپریشن شروع کیا۔ پاکستان میں طالبان کے خلاف رائے عامہ صحیح معنوں میں پہلی مرتبہ فوجی آپریشن کے شروع ہونے کے تین ماہ بعد 16 دسمبر 2014 کو آرمی پبلک سکول پشاور پر تحریک طالبان کے وحشت ناک حملے کے بعد ہوئی ہے۔

اس حملے کے بعد آپریشن کا دائرہ کار پورے ملک میں پھیلا دیا گیا ہے، تاہم اس وقت اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا سیکیورٹی فورسز کی کارروائی کے ساتھ ساتھ طالبان اور مذہبی دہشت گردی کو شکست دینے کے لیے شدت پسند مذہبی فکر کی ترویج روکنے کی بھی کوشش کی جائے گی یا نہیں۔ تحریک طالبان پاکستان سے علیحدگی اختیار کرنے والے طالبان اور جہادی گروہوں کی جانب سے ابو بکر البغدادی اور داعش سے وفاداری اور بیعت کا اعلان ایک ایسا خدشہ ہے جسے تحریک طالبان کی جانب سے اپنا مستقبل محفوظ بنانے اور ایک وسیع عالم گیر جہاد کے آغاز کی کوشش کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے تاہم ٹی ٹی پی کا مستقبل بہت حد تک آپریشن ضرب عضب کے نتائج اور پاکستان میں طالبان ہمدرد مدارس کے خلاف کارروائی سے مشروط ہے۔

امریکا اور طالبان

طالبان پاکستانی ہوں یا افغانی، انہیں اسلحہ اور سرمایہ کسی نہ کسی طور امریکا سے ہی ملتا ہے، مگر کیسے؟ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

تاریخ کے اوراق کو ذرا پلٹ کر دیکھیے۔ سویت یونین کی فوجوں کی افغانستان پر چڑھائی کے بعد مقامی افغانیوں نے از خود جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ کئی برس تک وہ تن تنہا سوویت فوجوں سے نہتے لڑتے رہے۔ ان ابتدائی چند سالوں میں انہوں نے پتنگوں کی مدد سے بھی سویت جہاز گرائے۔ لیکن ان ابتدائی برسوں کے جہاد کی روئیداد عام نہیں ہوئی۔ پھر

دوسرے مرحلے میں پاکستان داخل ہوا کیونکہ پاکستان کو خدشہ تھا کہ سویت یونین افغانستان تک ''محدود'' نہیں رہے گا اور یہ لازماً پاکستان کا رخ کرے گا۔ لہذا سویت یونین کو افغانستان کی سرزمین میں ہی الجھائے رکھنا ہوگا۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تھی جس نے پاکستان آرمی کی ہدایت پر افغانی مجاہدین کو پاکستانی سرزمین کو ''بیس کیمپ'' بنانے کی اجازت دی۔ یوں افغان مہاجرین کی پاکستان آمد کا سلسلہ بھٹو حکومت کے دور میں شروع ہوا۔ ان ''مہاجرین'' میں زخمی مجاہدین، مجاہدین کے اہل خانہ، پاکستان سے سپلائی لے جانے والے مجاہدین وغیرہ شامل تھے۔ ان افغان مہاجرین کے ساتھ ساتھ افغان مجاہدین کے کمانڈرز بھی پاکستان آنے لگے تا کہ پاکستان آرمی کے ریٹائرڈ افسران سے صلاح مشورہ اور جنگی حکمت عملی سیکھ سکیں۔

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں بھی افغان جہاد میں بھرپور شمولیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان دینی جماعتوں نے پاکستان کے طول وعرض اور بیرون ملک سے نہ صرف جہاد فنڈ جمع کیا بلکہ اپنے کارکنان کو بھی مجاہدین کے روپ میں افغانستان بھیجا۔ ان میں جماعت اسلامی سرفہرست تھی۔

جب افغان جہاد، پاکستانی عوام اور افواج کی پشت پناہی سے زور پکڑنے لگا تو امریکہ بہادر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فیصلہ کیا۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے نے افغان مجاہدین کو اسلحہ اور دیگر وسائل کی پیشکش کی۔ افغان مجاہدین نے اپنے پاکستانی سویلین اور فورسز کے سرپرستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ اس دوران یہ نکتہ بھی بحث کا موضوع رہا کہ کیا کسی کافر ملک (سویت یونین) سے جہاد کرتے ہوئے دوسرے کافر ملک (امریکہ) سے اسلحہ بارود وغیرہ لینا شریعت میں جائز ہے یا نہیں۔ اور جب علمائے کرام کی ایک کثیر تعداد نے اسے جائز قرار دیا تب افغان مجاہدین نے امریکی اسلحہ کے لئے گرین سگنل دیا۔ اس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت

آ چکی تھی۔ چنانچہ اب پاک آرمی، پاک حکومت اور دینی جماعتوں سے منسلک پاکستانی عوام یہ سب کے سب افغان جہاد میں شامل ہو گئے اور امریکہ نے پاکستان کی معرفت افغان مجاہدین کو اسلحہ بارود کی سپلائی شروع کر دی۔ امریکہ دنیا بھر میں اسلحہ بنانے اور فروخت (ایکسپورٹ) کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی معیشت کا بڑا انحصار اسلحہ اور گولہ بارود کی مارکیٹ پر ہوتا ہے۔ اسلحہ کی کھپت اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب دنیا کے مختلف خطوں میں خانہ جنگی اور لڑائی ہو رہی ہو۔ امریکہ اور دنیا بھر میں موجود امریکن لابی اس بات کا خاص ''خیال'' رکھتے ہیں کہ خانہ جنگی کی یہ آگ کبھی بجھنے نہ پائے۔

پاکستان اپنے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان شہید کے دور سے ہی ''امریکن لابی'' میں شامل رہا ہے۔ یوں امریکن سی آئی اے کو ابتدا ہی سے پاکستان میں کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ''اپنے مقامی ایجنٹس'' کو اتنی ترقی دلائی کہ یہ حکومتی ایوانوں میں بھی شامل ہو گئے۔ امریکا نے پاکستان کی سول اور آرمڈ فورسز کی بیورو کریسی میں پنجے جما لیے۔

جب بھٹو کے اقتدار کی کشتی ڈوب رہی تھی تو اس نے برسر عام یہ کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ میری کابینہ کے کم از کم پانچ ارکان سی آئی اے ایجنٹ ہیں۔ چنانچہ افغان جہاد میں پاکستان کے سرکاری طور پر ''شامل'' ہونے اور امریکہ کی طرف سے اسے ''سپانسر'' کرنے کے ''فیصلے'' کو پاکستان کی سول و آرمڈ بیورو کریسی (جو ضیاء کے فوجی عہد میں، تو من شدی، من تو شدم ہو گئے تھے) نے دل سے خوش آمدید کہا۔ اس دور میں دنیا بھر کی طرح پاکستانی عوام و دانشور بھی لیفٹ اور رائیٹ کے خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پاکستان کا لیفٹسٹ اقلیتی طبقہ یعنی عوام، دانشور اور لکھاری سویت یونین کے حامی تھے جبکہ بھاری اکثریت رائیٹسٹ گروپ تھا جس میں آرمی، بیورو کریسی اور حکومتی ارکان پیش پیش تھے۔ دینی جماعتیں اور اس کے کارکنان بر بنائے مخالفین سویت یونین از خود رائیٹسٹ بن گئے۔ امریکہ کے لئے ''افغان جہاد'' کو ''کیش'' کرانے اور سویت یونین کو دوسری سپر پاور

کی حیثیت سے ختم کرنے کا نادر موقع تھا۔

بہت سے قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ امریکہ نے، خود امریکہ اور یورپ میں 'افغان جنگ'' کو'افغان جہاد'' کے طور پر متعارف کرایا۔ مسلم عرب ریاستوں میں تیل کی دریافت کے بعد تیل کی آمدن سے مالا مال بہت سے عرب مسلمان امریکہ اور یورپ میں عیش و آرام اور کاروبار کر رہے تھے۔ امریکہ نے ان دولت مند عرب مسلمانوں کی افرادی اور مالی قوت کو''افغان جہاد'' میں استعمال کرنے کی غرض سے لاکھوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے شائع کئے اور ان عرب مالدار مسلمانوں کو قرآن کی مدد سے ''بتلایا'' کہ روس ایک دہریہ یعنی اللہ کو نہ ماننے والا ملک ہے، جس نے اللہ کو ماننے والے ایک مسلمان ملک افغانستان پر حملہ کیا ہے۔ لہٰذا ''ہمارا'' (اللہ کے ماننے والوں کا) یہ فرض ہے کہ ہم اس ''جہاد'' میں عملاً شامل ہوں۔

امریکہ کی یہ ''چال'' کامیاب ہوئی اور اسامہ بن لادن سمیت ہزاروں عرب مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار پاکستان اور افغانستان کا رخ کرنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی دولت بھی لے کر آئے اور اپنی دولت سے امریکی ہتھیاروں کی پاکستان و افغانستان ''سپلائی'' کا بھی اہتمام کیا۔ اسی عہد میں سی آئی اے کا ایک ایسا ''ونگ'' تشکیل پایا جس کا کام ہی ان ''عرب مجاہدین'' کو ہر قسم کی سہولیات فراہم کرنا تھا۔ اسامہ اور ان کے جملہ ساتھی اسی عہد میں سی آئی اے کے اسی ونگ کے بہت قریب ہو گئے۔ اور سوویت یونین کے ٹوٹنے، افغانستان سے روسی فوج کے نکلنے تک یہ روابط مضبوط تر ہوتے گئے۔

سوویت یونین صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک ایسے نظام کا علمبردار تھا جو ہر محاذ پر مغربی دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کر چکا تھا۔ یہ نظام یورپ میں نقب لگا چکا تھا اور امریکہ کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا۔ سوویت یونین کی سرکردگی میں اشتراکی بلاک سیاسی' اقتصادی' سفارتی اور جنگی محاذوں پر پوری دنیا میں امریکہ سے پنجہ آزمائی کر رہا تھا۔ سوویت

یونین' افغانستان اور ہماری غلطیوں نے مل کر افغانستان اور پاکستان کو فیصلہ کن جنگ کا میدان بنا دیا۔امریکہ نے صرف سفارتی حربے استعمال کئے یا چند ارب ڈالر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی جھولی میں ڈال دیئے۔اس جنگ میں لاکھوں اور ہزاروں پاکستانی لقمہ اجل بنے۔ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر سے پاکستان کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ہر جگہ مسلح نان اسٹیٹ ایکٹرز ریاستی رٹ کو چیلنج کرنے کے لئے وجود میں آگئے۔افغانستان کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ سوویت یونین کے انخلاء کے بعد مجاہدین کی آپس کی لڑائیوں میں جو تباہی ہوئی' سوویت دور سے وہ بہت بڑی تھی۔گویا ہمارے یا افغانوں کے حصے میں کوئی خیر نہیں آئی۔اس کے برعکس امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو اس قوت (سوویت یونین) سے نجات مل گئی جو ان کے لئے دردسر بنی ہوئی تھا۔وہ نظریہ اشتراکیت اپنی موت مرگیا جو ان کے سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کر رہا تھا اور وہ اشتراکی بلاک راستے سے ہٹ گیا جو ہر جگہ امریکہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔گویا چند ارب ڈالر کے عوض امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن گیا۔

پہلی مرتبہ دنیا اور بالخصوص مسلمان دنیا واحد سپر پاور کے پنجے میں آگئی۔خان عبدالولی خان نے اس پر یہ کہہ کر بڑا اچھا تبصرہ کیا تھا کہ اپنی سرزمین پر اپنے بھائیوں کو مروا کر ہم نے یاسر عرفات کو امریکہ اور فلسطینیوں کو اسرائیل کی قدموں میں بٹھا دیا لیکن ہم پھر بھی خوش ہیں کہ بڑا تیر مارا ہے۔

تماشا یہ تھا کہ امریکہ کی اس جیت اور مسلمانوں کی اس ہار کو ہم اپنی جیت سمجھ رہے تھے۔ہمارے جرنیل فاتحانہ انداز میں کتابیں لکھ کر دیوار برلن کی دیواروں کے ٹکڑوں کو اپنے ڈرائنگ روموں میں سجا رہے تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد امریکہ سوویت یونین سے بڑھ کر جارح کے طور پر سامنے آگیا۔اس کا پہلا شکار اسلامی ممالک اور وہ مجاہدین بننے لگے جنہیں سوویت یونین کے خلاف میدان میں اتارا گیا تھا چنانچہ وہ مذہبی شخصیات اور وہ جنرل صاحبان جو امریکہ کی فتح اور سوویت یونین کی شکست کا جشن منا رہے تھے' رونے پیٹنے میں

لگ گئے۔خود وہ امریکہ کو عالم اسلام کا نمبرون دشمن قرار دینے لگے۔

جماعت اسلامی جیسی جماعتیں جو چند سال قبل جشن فتح منا رہی تھیں، مردہ باد امریکہ مہمات چلانے لگیں۔ وہ القاعدہ جو عالم عرب سے نوجوانوں کو جمع کر کے سوویت یونین کے خلاف تیار کی گئی تھی، اس نے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔

امریکہ نے پہلی فرصت میں فلسطینیوں کو اسرائیلیوں کے قدموں میں لا بٹھا دیا۔ پھر القاعدہ کے پیچھے پڑ گیا پھر افغانستان اور اس کے بعد عراق پر قبضہ کر لیا۔ ادھر پاکستان کی مذہبی تنظیمیں اور ان لوگوں نے جو سرد جنگ کے دنوں میں امریکہ کی سرپرستی میں سوویت یونین کے خلاف لڑے تھے، امریکہ کے خلاف کمر کس لی۔ مذہبی سیاسی لیڈر تمام برائیوں کی جڑ امریکہ کو قرار دینے لگے اور تو اور عمران خان جیسے لبرل لیڈر بھی اسی روش کا ایسے شکار ہو گئے کہ ان کے خطابات امریکہ کے خلاف زبانی ڈرون حملوں سے شروع اور انہی پر ختم ہونے لگے۔ آج امریکا اپنے چند ہزار فوجیوں کو چند اڈوں پر بدستور تعینات رکھنے پر مصر نظر آتا ہے۔ بظاہر امریکہ کے مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ ہم پاکستانیوں کا خیال تھا کہ وہ افغانستان پر دائمی قبضے کے لئے آیا تھا اور وہ ایسا نہ کر سکا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ طالبان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے حملہ آور ہوا تھا لیکن اس کیخلاف مزاحمت بدستور پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ ہم سنتے اور سناتے رہے کہ وہ وسط ایشیائی قدرتی ذخائر کو یہاں سے نکال کر لے جانے کے لئے آیا ہے اور ظاہر ہے یہ کام بھی وہ نہ کر سکا۔

ہمارے تجزیہ نگار بتاتے رہے کہ وہ افغانستان میں بیٹھ کر چین کا گھیراؤ کرنا اور پاکستان کو سبق سکھانا چاہتا ہے اور ظاہر ہے یہ کام بھی وہ نہ کر سکا۔ ہم یہ بھی سنتے رہے کہ وہ افغانستان کو اڈہ بنا کر ایران پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور ظاہر ہے یہ مقصد بھی پورا نہ ہو سکا۔ امریکی افغانستان میں حسب وعدہ تعمیر نو کر سکے اور نہ اسے امن کا گہوارا بنا سکے۔ یوں امریکہ بظاہر رسوا اور شکست خوردہ ہو کر نکل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مذہبی سیاسی رہنما بشمول

عمران خان اور دفاعی وتذویراتی ماہرین بغلیں بجا رہے ہیں کہ امریکہ کو شکست ہوگئی۔ ابھی باقاعدہ جشن منائے نہیں جا رہے ہیں لیکن تقریروں کا انداز یوں فاتحانہ ہوتا ہے کہ جیسے امریکہ سے ناک رگڑوا دی گئی اور پاکستان و افغانستان کے دن بدلنے والے ہیں لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ امریکہ نے اپنے بیشتر مقاصد حاصل کر لئے۔ نائن الیون سے قبل القاعدہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لئے بڑا خطرہ تھی اور وہ نائن الیون یا پھر سیون سیون جیسی وارداتوں کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آج اگرچہ القاعدہ پہلے سے زیادہ پھیل گئی ہے اور داعش جیسی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں لیکن ان کا دائرہ کار صرف عالم اسلام تک ہے۔ امریکہ یا برطانیہ کے اندر اسی طرح کی کارروائیوں کی اس کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ نائن الیون سے قبل عالم اسلام کے جہادی عناصر کی توپوں کا رخ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف تھا لیکن امریکیوں نے ایسی چال چلی کہ وہ ہر جگہ اپنے مسلمان بھائیوں سے نبرد آزما ہوگئے۔

آج افغانستان میں طالبان افغان حکومت سے، پاکستان میں طالبان پاکستانی ریاست سے اور یمن میں القاعدہ والے یمنی حکومت سے لڑ رہے ہیں۔ شام، مصر، عراق الغرض ہر جگہ پر مسلمان مجاہد، مسلمان لبرل سے لڑ رہا ہے جبکہ امریکہ تماشا دیکھنے لگا ہے۔ گویا وہ جنگ جو امریکہ کے خلاف شروع ہوئی تھی، اس کے گھر سے نکل کر مسلمانوں کے ملکوں میں منتقل ہوگئی اور ظاہر ہے مسلمان لبرل ہو یا مجاہد، مسلمان ہے، امریکی نہیں۔ اسی طرح امریکہ نے اپنے دشمن نمبرون اسامہ بن لادن کو بھی تلاش کر کے قتل کر دیا اور یوں اپنے لوگوں کو نفسیاتی فتح کا احساس بھی دلوادیا۔ امریکہ افغانستان سے مکمل یا جزوی طور پر نکل رہا ہے لیکن وہ کئی دیگر شکلوں میں افغانستان میں موجود رہے گا۔

نائن الیون سے قبل کے افغانستان میں امریکہ کی کوئی لابی نہیں تھی لیکن اب وہ

اپنی بہت سی لابیاں چھوڑ کر جا رہا ہے جو لمبے عرصے تک اس کے مفادات کا تحفظ کرتی رہیں گی۔ اس پوری جنگ میں امریکہ کے چند سو ارب ڈالر خرچ ہوئے جو ہماری نظروں میں تو بڑی رقم ہے لیکن امریکی معیشت کے لحاظ سے وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ دس سالہ جنگ میں امریکہ کے صرف 2600 سپاہی ہلاک ہوئے جبکہ لاکھوں افغانی اور ہزاروں پاکستانی لقمہ اجل بن گئے۔

افغانستان اور پاکستان کے معاشرے دو انتہاؤں میں تقسیم ہو گئے' معاشرت کا حلیہ بگڑ گیا۔ نہ جانے امریکہ کے نکلنے کے بعد سرحد کے آر پار ان مصیبتوں کا مقابلہ کیسے کیا جائے گا' جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔ ان مصیبتوں اور خانہ جنگیوں کا مقابلہ کیسے ہوگا' اس سوال پر کوئی غور نہیں ہو رہا ہے لیکن خوشیاں منائی جا رہی ہیں کہ ہم جیت گئے اور امریکہ ہار گیا۔ آج افغانستان کی آزادی اور وہاں اسلامی مملکت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والے طالبان انجانے میں امریکا کے کھلاڑی بن چکے ہیں اور اسی کے اسلحے اور اسی کی مالی قوت سے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا گلا کاٹنے میں مشغول ہیں۔

نوے کی دہائی میں طالبان کو منظم کرنے میں پاکستانی حکومت اور سیکیورٹی اداروں کا اہم کردار تھا۔ تاہم شاید اس موقع پر مستقبل کے حالات کی پیش بینی نہیں کی گئی تھی چنانچہ پانچ سال بعد ہی جب نائن الیون کے بعد امریکا نے افغانستان پر حملہ کیا تو ہمارے پاس طالبان کا ساتھ دینے یا چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس موقع پر پاکستان میں پرویز مشرف کی حکومت نے امریکی دھمکیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور طالبان کی حمایت کے معاملے پر یوٹرن لے لیا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ یوٹرن لیتے وقت اس کے نتائج اور پاکستانی ریاست پر اس فیصلے کے ممکن اثرات کا کوئی اندازہ نہ لگایا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دس سال میں ہی 50 ہزار سے زیادہ پاکستانی خون میں نہلا دیے گئے۔

انکل سام اور ہم

یہ 3 مئی 1950 کی بات ہے جب پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان امریکا پہنچے۔ تب ہوائی اڈے پر امریکی صدر ہیری ٹرومین نے بنفس نفیس وزیراعظم پاکستان کا شاندار استقبال کیا۔ بعدازاں نیویارک کی گلیوں میں لیاقت علی خان کو کھلی گاڑی میں گھمایا پھرایا گیا۔ تب ہزارہا امریکی شہریوں نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا اور بڑے اشتیاق سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے سربراہ کو دیکھا۔

لیکن آج پاکستانی حکمران امریکی صدر سے ملنے کے لیے منتیں کرتے ہیں، تب بمشکل انھیں ملاقات کا وقت ملتا ہے۔ اس وقت بھی پاکستانی حکمران امریکی صدر کے سامنے بھیگی بلی نظر آتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ انقلاب کیونکر آیا کہ جس پاکستان کو امریکی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آج اسی کو ''کرائے کا گھر'' اور ''ریٹریئور کتا'' کے القاب دیتے ہیں۔ (یہ کتا شکار اپنے مالک کے پاس لاتا ہے۔) ذیل میں اسی کایا پلٹ کی چشم کشا، حیرت انگیز اور دلچسپ داستان پیش ہے۔

1940ء تک امریکا کے قونصل خانے کلکتہ، ممبئی، مدراس اور کراچی تک محدود تھے۔ دارالحکومت دہلی میں امریکا کا کوئی سفارت خانہ نہیں تھا۔ البتہ پرل ہاربر پر حملے کے بعد امریکا نے ہندوستان کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔ 1941ء میں ہندوستان کے ساتھ براہ راست سفارتی تعلقات قائم کر کے دہلی میں اپنا سفارت خانہ قائم کر لیا۔ 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ لاہور منظور ہوئی، تو امریکی قونصل خانہ کلکتہ نے 5 اپریل 1940ء کو اپنے سٹیٹ

ڈیپارٹمنٹ کے نام ایک رپورٹ ارسال کی جس میں قراردادِ لاہور کا ذکر یوں کیا گیا تھا کہ:

"پاکستان کا مطالبہ ملتوی یا اسے ایک طرف رکھ دیا جائے مگر قرارداد پاکستان کو نظر انداز کرنا غلطی ہوگی۔ یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس قرارداد کی اہمیت کم ہو سکتی ہے۔"

نیویارک ٹائمز کے نمائندے ہربرٹ میتھیوز نے 1942ء اور 1943ء میں ہندوستان کا تفصیلی دورہ کیا۔ اس دورے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کی مقبولیت اور قائداعظم کے مستقبل پر سلسلہ وار مضامین تحریر کیے۔ 14 اکتوبر 1942ء کے مضمون کا عنوان کچھ یوں تھا کہ "ہندوستان میں امن کی کنجی جناح کے پاس ہے"

قائداعظم محمد علی جناح اور امریکا

قائداعظم آئین اور جمہوریت پر پختہ یقین رکھنے والے مسلم مگر لبرل سیاسی راہنما تھے۔ وہ کافی عرصہ برطانیہ میں مقیم رہے۔ ان کی نجی زندگی پر مشرقیت کے بجائے مغربیت کا رنگ غالب تھا۔ شاید اسی بنا پر امریکا اور برطانیہ ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

14 اگست 1947ء کو قائداعظم دہلی سے کراچی روانہ ہوئے تو بھارت میں امریکی سفیر نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ قائداعظمؒ نے امید ظاہر کی کہ امریکا پاکستان کے مختلف نوعیت کے مسائل حل کرنے میں مدد کرے گا۔ اسی لیے 7 ستمبر 1947ء کو کابینہ اجلاس میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اور کمیونزم اسلام کی سرزمین پر نہیں پنپ سکتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ہمارے مفادات روس کے بجائے دو عظیم جمہوری ملکوں، برطانیہ اور امریکا سے وابستہ ہیں۔" قائداعظم کے اسی بیان پر خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھی گئی۔ گویا مذہب ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ ٹھہرا جس پر آج تک پاکستان گامزن نظر آتا ہے۔ پاکستان کو اپنے

استحکام کے لیے مالی تعاون کی ضرورت تھی جو امریکا پوری کرسکتا تھا۔ اسی لیے پاکستان کے وزیرخزانہ غلام محمد (بعد میں گورنر جنرل) نے آزادی کے دو ہفتے بعد امریکا کے سفارت کار چارلس لیوس سے امریکی امداد کے لیے براہ راست درخواست کر دی۔ امریکی ریکارڈ کے مطابق امریکا نے پاکستان کی بروقت امداد سے گریز کیا۔

قائداعظم کا تاثر یہ تھا کہ افغانستان کے مطالبہ ''پختونستان'' کو روس کی سرپرستی حاصل ہے۔ انھوں نے 11 ستمبر 1947ء کو کابینہ کے ہنگامی اجلاس میں کہا کہ صوبہ سرحد کا تحفظ صرف پاکستان کا اندرونی مسئلہ نہیں بلکہ یہ دنیا کے لیے بھی تشویش کا معاملہ ہے۔ قائداعظم نے اسی اجلاس میں فرمایا کہ روس دنیا کا واحد بڑا ملک ہے جس نے پاکستان کی آزادی کے موقع پر خیرسگالی پیغام نہیں بھیجا۔ کچھ عرصے بعد امریکا میں پاکستان کے پہلے سفیر ایم اے ایچ اصفہانی نے پاکستان کی پانچ سالہ معاشی اور دفاعی ضروریات کے لیے دو ارب ڈالر امریکی امداد کی درخواست کر دی جسے امریکا نے مسترد کر دیا۔ بعدازاں صرف ایک کروڑ ڈالر کی امداد دی گئی۔

ابتدائی دنوں میں پاکستان سنگین مالی مشکلات کا شکار تھا۔ حکومت پاکستان کے پاس فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لیے بھی سرمایہ نہیں تھا۔ نومولود پاکستان کو روس اور بھارت کی جانب سے بھی خطرات لاحق تھے۔ لٰہذا مسلم لیگ کے مرکزی راہنما امریکی سفارت کاروں پر مالی امداد کے لیے زور ڈالتے رہے۔

قائداعظم کو پاکستان کی مالی مشکلات کا شدید احساس تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ ''فلیگ سٹاف ہاؤس'' امریکی سفارت خانے کو فروخت کرنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے کراچی میں امریکی سفیر، ایلنگ اور اس کی اہلیہ کو ساحل سمندر پر اپنے کاٹیج میں چائے کی خصوصی دعوت دی۔ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں۔ قائداعظمؒ نے امریکی سفیر کو ترغیب دی کہ وہ امریکی سفارت خانے کے لیے فلیگ سٹاف ہاؤس خرید لیں، مگر وہ تیار نہ ہوئے۔

امریکا کسی کا دوست نہیں

ان ٹھوس واقعات سے ظاہر ہے کہ امریکا انتہائی مشکل حالات میں بھی پاکستان سے تعاون پر آمادہ نہیں ہوا۔ اسے شاید یقین نہ تھا کہ پاکستان اپنی آزادی برقرار رکھ سکے گا۔ امریکا نے پاکستان کو صرف اس وقت امداد دی جب اپنے قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھا۔ دوست وہ ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے مگر امریکا اس اصول کا قائل نہیں، وہ صرف اپنی ضرورت کے لیے دوسرے کے کام آتا ہے۔

بہرحال پاکستان کے مرکزی رہنما امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مختلف جتن کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وزیراعظم لیاقت علی خان امریکی سفارت خانہ کے عملے کو اپنے گھر دعوتوں پر بلاتے۔ رات گئے تک ان کی تواضع کرتے اور ان کا موسیقی سے دل بہلانے کے لیے خود ڈرم بجاتے۔ جب بھارت نے کشمیر میں اپنی افواج داخل کیں اور پاک بھارت جنگ چھڑی تو امریکا نے پاکستان سے تعاون کرنے کے بجائے 11 مارچ 1948ء کو دونوں ممالک کی فوجی امداد روک دی۔ اس پابندی کا نفاذ 29 مارچ 1948ء تک جاری رہا۔ اس دوران بھارت کو کشمیر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔

بعض مورخین کے مطابق قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے قومی خودمختاری اس وقت متاثر ہوئی جب امریکا سے دو ارب ڈالر کی معاشی امداد کے لیے درخواست کی گئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امریکا واحد ملک تھا جس نے پاکستان کی تقریب آزادی میں شرکت کے لیے سرکاری وفد بھیجا۔ بھارت نے پاکستان کے مالی اثاثے روک رکھے تھے۔ مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کے بعد صرف 17 فیصد حصہ ادا کیا گیا جو پاکستان کی بنیادی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ قائداعظم مسلمانوں کو ہندوؤں کی بالادستی سے آزاد کرانا چاہتے تھے جبکہ امریکا کو جنوبی ایشیا میں ایسی فوج کی ضرورت تھی جو کمیونزم کا مقابلہ کر سکے۔

چنانچہ قائداعظم اور امریکا کی سوچ حسن اتفاق سے ایک ہوگئی۔

لیکن تب تک عالمی معیشت پر بالادستی اور دنیا کے ذخائر پر کنٹرول پانا امریکا کا بڑا مقصد بن چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب کے لیے اپنی کالونیوں پر قبضہ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ لہٰذا مغربی ممالک نے کالونیوں کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا البتہ اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے نئی حکمت عملی وضع کر لی۔

امریکا نے عالمی سیاست میں برطانیہ کو جونیئر ساتھی تسلیم کر لیا۔ چنانچہ دنیا پر بالادستی قائم رکھنے کے لیے امریکا اور برطانیہ مفاہمت کے ساتھ پالیسیاں بنانے لگے۔ سامراجی مفادات کو تحفظ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ''عالمی خطرے'' کا پروپیگنڈا کیا جائے تا کہ دوسرے ملکوں میں فوجی مداخلت کا جواز پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اسی ''خطرے'' کو ہوّا بنا کر امریکا 1950 سے دنیا کے مختلف ممالک میں فوجی مداخلت کرنے لگا جس کا مقصد دنیا کو امریکی کمپنیوں کے لیے محفوظ بنانا، سیاسی اور معاشی بالادستی میں اضافہ کرنا اور ایسی طاقتوں کو روکنا تھا جو مستقبل میں دنیا کی سپر پاور کے لیے خطرے کا باعث بن سکیں۔

''عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ'' بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہے جو نائن الیون سے پہلے امریکی بالادستی کو مستحکم بنانے کے لیے تشکیل دی گئی۔ اسکاٹ لینڈ کا اخبار سنڈے ہیرلڈ اس خفیہ منصوبے کا انکشاف کر چکا ہے جو جارج بش نے امریکی صدر بننے سے پہلے 2001ء میں منظور کیا تھا۔

امریکا نواز پاکستانی رہنما

1948ء میں امریکا دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ مسلم لیگ کے اکثر مرکزی رہنما برطانوی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ اور امریکا نواز تھے۔ امریکا روس کے ساتھ سرد جنگ کی بنا پر جنوبی ایشیا کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ پاکستان جنوبی ایشیا کا اہم ملک ہے جو روس اور چین

سے جغرافیائی طور پر قریب ہونے کے علاوہ مشرق وسطیٰ پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا امریکا اپنے مخصوص مفادات کے تحت پاکستان میں گہری دلچسپی لینے لگا۔

پاکستانی لیڈروں کو بھی یقین تھا کہ امریکا ہی نومولود پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں معاون ہوسکتا ہے۔ امریکا نے مارچ 1949ء میں پاکستان کی سٹریٹجک اہمیت کا اندازہ لگایا۔ جب امریکی افواج کے سربراہ جائنٹ چیفس آف سٹاف نے لاہور اور کراچی کے بارے میں تحریر کیا کہ ''کراچی اور لاہور کی سٹریٹجک اہمیت یہ ہے کہ یہ علاقے روس کے خلاف فضائی حملوں کے لیے اڈے اور فوجی مرکز بن سکتے ہیں۔ یہاں سے مشرق وسطیٰ کے تیل والے علاقے بھی قریب ہیں۔''

امریکی صدر ٹرومین نے 1949 میں بھارت کے وزیراعظم نہرو کو امریکا کے دورے کی دعوت دی۔ پاکستانی لیڈر قدرتی طور پر اس امریکی فیصلے سے بڑے پریشان ہوئے۔ لیاقت علی خان تہران کے دورے پر تھے۔ پاکستان کے سفیر راجہ غضنفر علی خان نے روسی سفارت کار کو مطلع کیا کہ لیاقت علی خان روس کا دورہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ماسکو نے پانچ دن کے اندر سٹالن کی جانب سے لیاقت علی خان کے نام روس کا دورہ کرنے کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔ لیاقت علی خان نے فوری طور پر دعوت نامہ قبول کر لیا تاہم دورے کی تاریخ پر اتفاق نہ ہوسکا۔ پاکستان نے روس کے لیے اپنا سفیر بھی نامزد کر دیا مگر روسی حکومت نے نامزدگی کی منظوری میں تاخیر کی۔

پاکستان اور روس دونوں نے باہمی تعلقات کے ضمن میں بروقت ادراک کا مظاہرہ نہ کیا۔ بعض مورخین کے مطابق روس کا دعوت نامہ دراصل امریکا پر دباؤ ڈالنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ امریکا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ امریکی سفارت کاروں نے پاکستان کی وزارت خارجہ کو اشارے دیے کہ لیاقت علی خان کے روسی دورے سے برطانوی و امریکی عوام میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔

آخر امریکی صدر ٹرومین نے نومبر 1949 میں وزیراعظم پاکستان کے نام امریکی دورے کا دعوت نامہ جاری کر دیا۔ روسی لیڈروں کا خیال تھا کہ وزیراعظم پاکستان نے اپنے امریکا نواز وزیروں کے دباؤ پر روس کا دورہ ترک کیا۔ اگر لیاقت علی خان روس کا دورہ کر لیتے تو امریکا کا پاکستان کے متعلق رویہ متوازن ہوتا۔ امریکا پر غیر معمولی انحصار کی بنا پر ہی امریکا کو پاکستان کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کا موقع مل گیا۔

حالات کا جبر

3 مئی 1950ء کو امریکی صدر ٹرومین اور اس کی کابینہ کے ارکان نے لیاقت علی خان اور ان کی بیگم کو ہوائی اڈے پر خوش آمدید کہا۔ امریکی صدر نے اسی شام بلیئر ہاؤس میں وزیراعظم پاکستان کو سرکاری ڈنر دیا۔ وہیں ایک رپورٹر نے سوال کیا کہ پاکستانی وزیراعظم کتنے سائز کی فوج رکھنا چاہتے ہیں؟ لیاقت علی نے جواب دیا ''اگر آپ کا ملک ہماری سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت دے ڈالے تو میں فوج ہی نہیں رکھوں گا''

یہ حالات کا جبر تھا یا مسلم لیگی رہنماؤں کی بے وقوفی کہ وہ قومی سلامتی کی ضمانت امریکا سے مانگتے رہے۔ بہر حال لیاقت علی خان نے اپنی تقریروں اور پریس کانفرنسوں میں پاکستان کا مقدمہ بڑی مہارت سے پیش کیا اور امریکی رائے عامہ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔

کوریا کی جنگ کے دوران پاکستان نے امریکا کو مشروط فوجی تعاون کی پیش کش کی۔ لیاقت علی خان نے پاک فوج کا ایک ڈویژن کوریا بھیجنے پر رضامندی ظاہر کی بشرطیکہ امریکا مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت اور کشمیر میں شیخ عبداللہ کے دھاندلی پر مبنی انتخابات کو تسلیم نہ کرے۔ مگر امریکا، بھارت اور افغانستان کو ناراض کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پاکستان کوریا میں جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے غیر مشروط تعاون

کرے۔لیکن لیاقت علی خان تنازع کشمیر کی موجودگی میں پاک افواج کوریا بھیجنے کا نازک فیصلہ کرنے سے قاصر تھے۔لہٰذا فوجی تعاون ممکن نہ ہوسکا۔

امریکا کشمیر اور پختونستان کے مسئلے پر واضح موقف اختیار نہ کر سکا۔ فروری 1951ء میں جنوبی ایشیا کے امریکی سفیروں کا ایک اجلاس کولمبو میں ہوا۔اسی میں طے پایا کہ پاکستان، ایران اور ترکی خطے میں امریکی سٹرٹیجک مفادات کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔لہٰذا امریکا کو اولین فرصت میں پاکستان کے ساتھ ''مفاہمت'' کرنی چاہیے۔وہ پاکستانی افواج کو مسلح اور پاکستان میں ضرورت کے مطابق ''فوجی سہولتیں'' حاصل کرے۔ پاکستان سے یقین دہانی لی جائے کہ جنگ کی صورت میں اس کی افواج دستیاب ہوں گی۔

پاکستان کے پاس عسکری افرادی قوت موجود تھی مگر اسلحہ نہیں تھا۔فوج کو مسلح کرنے کے لیے اسلحہ ساز فیکٹریوں کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے لیڈر ابتدا ہی سے قومی ضرورت پورا کرنے کی خاطر جتن کرتے رہے مگر ان کی ساری توجہ امریکا پر مرکوز رہی۔

لیاقت علی خان کی شہادت سے پاکستان ایک محبّ وطن اور مقبول لیڈر سے محروم ہو گیا۔ مصدقہ رپورٹوں کے مطابق امریکا نے ان کے قتل میں حصہ لیا۔ وہ دیانت دار لیڈر تھے اور امریکا انھیں آسانی سے خرید نہیں سکتا تھا۔انھوں نے شہادت سے چار روز قبل امریکی سفارت کار وارن سے ملاقات کی جو ناخوشگوار رہی۔ وارن نے مشرق وسطیٰ کے دفاع پر زور دیا جب کہ لیاقت علی خان کشمیر پر زور دیتے رہے۔مزید برآں وزیراعظم مغربی بلاک کے خلاف پاکستان، ایران اور مصر کا مشترکہ دفاعی بلاک بنانا چاہتے تھے۔

امریکیوں کے چہیتے وزیراعظم

خواجہ ناظم الدین پاکستان کے نئے وزیراعظم اور غلام محمد گورنر جنرل نامزد ہوئے۔غلام محمد کو امریکا کی آشیرباد حاصل تھی۔وہ مغرب پسند بیوروکریٹ تھے۔قائداعظم،

لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین کا جھکاؤ بھی مغرب کی جانب رہا' مگر انھوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر مغرب نواز بنانے سے گریز کیا۔ امریکا کے صدر ٹرومین بھی جنوبی ایشیا کے بارے میں متوازن اور محتاط پالیسی پر گامزن رہے۔ انھوں نے بھارت کو پاکستان پر فوقیت دی۔ امریکی سفارت کار ڈین اچی سن لکھتا ہے کہ ''پاکستانی ہمیشہ امریکا سے اسلحہ مانگتے رہے مگر انھیں ہر مرتبہ ٹال دیا گیا۔''

1952ء میں غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور امریکا میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ وزیراعظم بنائے گئے۔ ان کے دور میں گندم کی قلت پیدا ہوئی تو امریکا نے اپنے چہیتے وزیراعظم کو مشکل صورت حال سے نکالنے کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر پاکستان کو ایک لاکھ ٹن گندم فراہم کر دی۔ جب گندم کراچی پہنچی تو ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال ہونے والے اونٹوں کی گردنوں میں ''تھینک یو امریکا'' کے کتبے لٹکائے گئے۔ مئی 1952ء میں امریکا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلس نے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کا دورہ کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد، وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے ڈلس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ پاک فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے ڈلس کو باور کرایا کہ پاکستان کی سلامتی کا تحفظ طاقتور امریکا کے تعاون سے ہی ممکن ہے۔ برطانیہ کے اخراج سے پیدا ہونے والا خلا امریکا ہی پر کر سکتا ہے۔ امریکا نے کمیونزم کے خطرے کے پیش نظر پاکستان کے ممکنہ کردار کا جائزہ لیا۔

امریکی حکومت کو خصوصی طور پر مغربی پاکستان میں ایسے اہم جنگی ہوائی اڈے نظر آئے جہاں سے روس اور کمیونسٹ چین کے اندرونی علاقوں کو بمبار طیاروں سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ پاکستان میں ایسی بندرگاہیں بھی موجود تھیں جو مغربی یورپ سے مشرق بعید تک مواصلات کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ امریکی دستاویز کے مطابق جنرل ایوب خان نے امریکی سفارت کاروں اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدیداروں سے ذاتی مراسم قائم

کر رکھے تھے۔

ڈلس پاکستان کے کامیاب دورے سے بڑا متاثر تھا۔ اس نے امریکی انتظامیہ کو یقین دلایا کہ پاکستان ایک قابل اعتماد اتحادی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس نے امور خارجہ کی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا: ''مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ (پاکستانی) کمیونسٹ جارحیت کے خلاف لڑیں گے۔ ہر چند کہ انھیں محض مکوں کے ساتھ ہی کیوں نہ لڑنا پڑے۔''

جنرل ایوب نے امریکا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو خطے کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ پیش کی جس کا مرکزی نقطہ روس کی بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک پہنچنے کی خواہش تھی۔ رپورٹ کے مطابق روس کے توسیع پسندانہ عزائم کا مقابلہ پاکستانی فوج ہی کر سکتی تھی بشرطیکہ اسے جدید اسلحہ سے لیس کر دیا جائے۔ ستمبر 1953ء میں جنرل ایوب خان نے خارجہ امور اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ انھوں نے سب سے پہلے امریکا کا دورہ کر کے امریکی عسکری صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا۔ وہ سخت پریشان تھے کہ امریکا پاکستان کو فوجی امداد دینے کے لیے رضا مند نہیں ہو رہا۔ وہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں امور جنوبی ایشیا کے انچارج آفیسر کے دفتر میں بغیر اطلاع چلے گئے اور کہا:

> ''حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا واسطہ ہے! میں یہاں آپ کی بیرکیں دیکھنے نہیں آیا۔ اگر آپ چاہیں، تو ہماری فوج آپ کی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہم کوئی فیصلہ کر لیں۔''

امریکی امداد کی خاطر بے چینی

یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سویلین اور فوجی لیڈر امریکی امداد پانے کی خاطر بے چین رہے اور انھوں نے متبادل ذرائع کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور نہ کیا۔ سکندر مرزا 1953ء میں وزیر دفاع نامزد ہوئے۔ پاکستان میں امریکی سفیر ہوریس

ہلڈر یتھ نے سکندر مرزا سے قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ ہلڈر یتھ کی بیٹی نے 1954ء میں سکندر مرزا کے بیٹے سے شادی کر لی۔ ہلڈر یتھ 1957ء تک پاکستان میں امریکا کے سفیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران سکندر مرزا پاکستان کے طاقتور اور بااختیار صدر تھے۔ چناں چہ امریکا کو پاکستان کے قومی نوعیت کے حساس فیصلوں سے متعلق اطلاعات ملتی رہیں۔

آخر جنوری 1954ء میں کہیں جا کر امریکا کے صدر آئزن ہاور نے امداد جاری کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ امریکا کو مکمل ادراک تھا کہ پاکستان سٹرٹیجک لحاظ سے ایسی مرکزی جگہ واقع ہے جہاں سے چین اور روس کے خلاف ممکنہ فوجی آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کی بدقسمتی کہ اسے ابتدا سے ایسے لیڈر ملے جن کی ہمدردیاں اپنے ملک کے بجائے امریکا کے ساتھ تھیں۔ حکومت پاکستان کے سیکرٹری دفاع سکندر مرزا امریکا کو ایسے مشورے دیتے بلکہ مخبری کرتے رہے جس سے پاکستان کی سلامتی اور قومی مفاد پر زد پڑتی تھی۔ امریکا کی خفیہ دستاویز کے مطابق سکندر مرزا نے امریکی سفیر سے کہا:

> ''امریکا کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ وزیراعظم محمد علی کو معاشی اور فوجی امداد آسانی سے نہ دے۔ یہ امداد اسی یقین دہانی پر دی جائے کہ پاکستانی حکومت دانش مندانہ رویہ اپنائے گی۔ مرزا نے ایسی کارروائی کے لیے پرزور سفارش کی اور یقین ظاہر کیا کہ اس طرح محمد علی امریکا کے لیے اچھے ردعمل کا اظہار کرے گا۔''

پاکستان امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا اور 1954ء میں وہ سیٹو معاہدے کا رکن بن گیا۔ امریکا کو ایشیا میں ایک ایسے ملک کی ضرورت تھی جو کمیونزم کا بڑھتا خطرہ روکنے کے لیے اتحادی بن سکے۔ مگر پاکستان کو روس سے زیادہ بھارت سے خطرہ تھا۔ لہٰذا فطری طور پر پاکستانی لیڈروں کی خواہش تھی کہ امریکا کے ساتھ جو

دفاعی معاہدہ ہو،اس میں بھارت کی جانب سے جارحیت کی صورت میں امریکی تعاون کی شرط شامل ہو۔لیکن امریکا بھارت کو ناراض کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔وزیرخارجہ ظفراللہ خاں کی کوششوں کے باوجود امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ بھارتی جارحیت کو معاہدے میں شامل کرنے کے لیے رضامند نہ ہوئے اور واضح کیا کہ معاہدہ سیٹو صرف کمیونسٹ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوگا۔ظفراللہ خاں نے حکومت پاکستان کی منظوری کے بغیر ہی سیٹو کے ڈرافٹ سے اتفاق کرلیا۔ظفراللہ خاں کے ڈپٹی آغا ہلالی نے اختلاف کیا تو انھوں نے حکومت پاکستان کو تار بھیجا کہ اگر اس اقدام کی منظوری نہ دی گئی تو وہ مستعفی ہوجائیں گے۔ پاکستان کی وفاقی کابینہ امریکا کو ناراض کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی' لہٰذا اس نے یک طرفہ معاہدے کی منظوری دے دی۔ بہرحال ڈلس نے زبانی یقین دہانی کرائی کہ امریکا پاکستان کے خلاف غیرکمیونسٹ جارحیت کی صورت میں بھی تعاون کرے گا۔پاکستانی دانشوروں نے سیٹو کے معاہدے پر تنقید کی۔ڈلس کو بھی امریکا میں تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔تاریخی ریکارڈ کے مطابق ڈلس نے ایک ممتاز امریکی صحافی والٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ

> ''دیکھو! مجھے جنوبی ایشیا میں حقیقی طور پر لڑاکا آدمیوں کی ضرورت ہے۔ایشیا میں صرف پاکستانی ہی حقیقی طور پر لڑ سکتے ہیں۔اسی لیے ہمیں ان سے اتحاد کی ضرورت ہے۔''

روس ناراض ہوگیا

پاکستان نے امریکا سے تو معاہدہ کرلیا مگر روس ناراض ہوگیا۔روس نے انتباہ کیا کہ سیٹو کا معاہدہ ایشیا کی سلامتی کے خلاف ہے۔جن ملکوں نے اس معاہدے پر دستخط کیے ہیں' انھوں نے ایشیا کا امن خطرے میں ڈال دیا۔اگر وہ اس روش پر گامزن رہے تو اپنے اقدامات کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

اس دوران بھارت غیر جانبدار رہا۔ اس نے کمیونسٹ ملکوں کے علاوہ مغربی ممالک سے بھی مالی امداد حاصل کر لی۔ 1965ء تک امریکا اور مغربی ممالک نے غیر جانبدار بھارت کو چھ بلین ڈالر کی امداد دی۔ جبکہ اس کا اتحادی پاکستان صرف تین ارب ڈالر کی امداد حاصل کر سکا۔

پاکستان فروری 1955ء میں بغداد پیکٹ کا رکن بھی بن گیا جو بعد میں سینٹو معاہدہ کہلایا۔ ایران، عراق، ترکی اور برطانیہ سینٹو کے رکن تھے اور امریکا سرپرست تھا۔ جنرل ایوب خاں نے سیٹو اور سینٹو معاہدوں کے متعلق اپنی کتاب ''فرینڈز، ناٹ ماسٹرز'' میں لکھا ہے کہ ''ان کے ذریعے پاکستان ایشیا میں امریکا کا سب سے بڑا اتحادی بن گیا۔''

اکتوبر 1954ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو معطل کیا اور بوگرہ کی وزارت تبدیل کر کے چودھری محمد علی کو وزیر خزانہ، آرمی چیف جنرل ایوب کو وزیر دفاع اور سکندر مرزا کو وزیر داخلہ نامزد کر دیا۔ ''ٹائم میگزین'' نے ان تبدیلیوں کے بارے میں لکھا:
''اس طرح پاکستان کسی خون خرابے کے بغیر غیر مستحکم مغرب نواز جمہوریت سے مستحکم مغرب نواز فوجی ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہو گیا۔''

یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے کچھ عرصے بعد ہی امریکا پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگا تھا۔ وہ سرکاری طور پر یہ تاثر نہ دیتا، البتہ غیر سرکاری طور پر امریکا کی مداخلت غیر معمولی تھی۔ جنوبی ایشیائی امور کے ماہر امریکی سفارت کار ڈینس ککس اپنی کتاب ''پاکستان اور امریکا'' میں حیران کن انکشاف کرتے ہیں کہ

> ''امریکی سی آئی اے نے معروف ماہر سیاسیات ڈاکٹر چارلس برٹن مارشل کو بطور آئینی مشیر دو سال کے لیے پاکستان بھجوایا تاکہ وہ آئین کی تیاری کے لیے پاکستانیوں کی معاونت کر سکے۔ مارشل کا مشن یہ تھا کہ وہ وعظ و نصیحت اور مثالوں کے ساتھ پاکستانی لیڈروں کی مدد

کرے تاکہ وہ ایک ہموار حکومت قائم کرسکیں۔ مارشل کو بڑی آسانی
سے مرکزی قیادت تک رسائی حاصل تھی۔ پاکستانی قیادت کوعلم تھا
کہ مارشل ظاہری طور پرایک سماجی تنظیم ڈیر بارن فاؤنڈیشن کے لیے
کام کرتا ہےمگر دراصل وہ سی آئی اے کا ملازم تھا''

سی آئی اے پاکستان میں

1956ء تک پاک امریکا کے تعلقات اس سطح پر پہنچ گئے کہ ایک پاکستانی گوریلا فورس تیار کی گئی تاکہ وہ روسی جارحیت کا مقابلہ کر سکے۔ اس آئیڈیے کے پیچھے امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اورسی آئی اے دونوں کی سوچ کارفرما تھی۔ امریکا نے اپنے جن افسروں کوبطور تربیت کار پاکستان میں تعینات کیا' ان کا تعلق خفیہ ایجنسیوں سے تھا۔

ستمبر 1956ء میں محلاتی سازشوں کی بنا پر وزیراعظم چودھری محمد علی نے استعفیٰ دے دیا۔ صدر سکندر مرزا نے بادل نخواستہ حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم نامزد کیا۔ سکندر مرزا نے امریکی سفیر ہلڈرتھ اور برطانوی ہائی کمشنر مسٹر مورس (Morrice) کو بتایا کہ وہ نئے وزیراعظم کا اس وقت تک ساتھ دے گا جب تک وہ خارجہ اور فوجی امور میں دخل اندازی نہیں کرتا۔

جنوری 1957ء میں امریکا کی سلامتی کے ادارے نیشنل سیکیورٹی کونسل نے پاکستان کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ تیار کی جس میں درج تھا کہ:

''ہمیں پاکستان کی بطور فوجی اتحادی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے لیے
یہ سودا بڑا مہنگا ثابت ہوا۔ ہم درحقیقت فوجی امداد کے علاوہ پاکستان
کے لیے کچھ نہیں کرتے رہے۔ یہ ایک بڑی خوفناک غلطی تھی مگر اب
ہم اس میں بُری طرح پھنس چکے ہیں''

امریکی صدر آئزن ہاور نے اس رپورٹ سے اتفاق کرتے ہوئے سوال کیا کہ امریکا اس صورت حال سے کیسے باہر نکل سکتا ہے؟ انڈر سیکرٹری رابرٹ رضی نے کہا کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو عمدہ سفارت کاری کے ذریعے یہ کام انجام دینا چاہیے۔ امریکا کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ پاکستان کی فوج پر زیادہ اخراجات کر رہا ہے جبکہ عوام نظر انداز ہوتے رہے۔ مگر امریکا پاکستان کے ساتھ معاہدے کر کے پھنس چکا تھا لہٰذا وہ اس ادراک کے باوجود فوجی امداد محدود نہ کر سکا۔ پاک فوج بھی بوقت ضرورت امریکی مفادات کا تحفظ کرتی رہی۔ جرنیلوں نے ادراک نہ کیا کہ پاکستان محض فوجی طاقت سے متحد نہیں رہ سکتا۔ امریکی صدر آئزن ہاور کے دور صدارت تک امریکا اور پاکستان متضاد مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے۔ امریکا بھارت کو ناراض کیے بغیر روس کے گرد گھیرا تنگ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر امریکا نے پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدے کیے۔ لیکن پاکستان کو بھارت سے خطرہ لاحق تھا۔ اپنی آزادی اور سلامتی کے لیے اسے مضبوط فوج کی ضرورت تھی۔ لہٰذا یہ مقصد پانے کے لیے پاکستانی لیڈروں نے روسی خطرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور امریکا سے دفاعی امداد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ پاکستانی لیڈروں نے تمام تر توجہ قومی سلامتی پر مرکوز کر دی۔ وہ یہ بھول گئے کہ مضبوط فوج مضبوط معاشرے کے بغیر قومی مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔

پاک امریکی دوستی کے معاہدے

بہرحال 1957ء تک افواج پاکستان بھارتی خطرے کی صورت میں مضبوط دفاع کے قابل ہو گئیں۔ وزیر اعظم سہروردی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے زور دیا کہ سیٹو اور بغداد پیکٹ پاکستان کے مفاد میں ہیں لہٰذا اسمبلی ان دونوں معاہدوں کی توثیق کر دے۔ فروری 1957 میں اسمبلی کے چالیس ارکان نے معاہدوں کی منظوری دے دی۔

یونائیٹڈ فرنٹ اور مسلم لیگ کے ارکان غیر حاضر رہے۔ میاں افتخار الدین اور مشرقی پاکستان کے ایک رکن نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ سہروردی نے جولائی 1957ء میں امریکا کا دورہ کیا۔ انھوں نے امریکی لیڈروں پر کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کے لیے زور دیا۔ امریکا نے بمبار بی 57 طیاروں کے حصول کی خاطر پاکستان کی درخواست پر توجہ نہ دی۔ سہروردی نے امریکی صدر آئزن ہاور کو بتایا کہ پاکستان امریکا کے یو۔ٹو طیارے کو اڈا دینے کے لیے تیار ہے۔ اس پیش کش پر 1959ء میں عمل ہوا جب امریکا نے پشاور سے دس کلومیٹر دور بڈبیر کے مقام پر خفیہ اڈا قائم کر لیا تھا۔

اس اڈے سے امریکا روسی تنصیبات کے سگنل ریکارڈ کر سکتا تھا۔ پاکستان کے اس اہم تعاون سے امریکا کو روس کی عسکری صلاحیت اور ٹیکنالوجی کے متعلق ایسی حساس معلومات ملیں جو اس کی قومی سلامتی کے لیے بے حد ضروری تھیں۔ 1958ء تک امریکا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور ایلیٹ کلاس میں گہرا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا۔ سکندر مرزا مکمل طور پر امریکا اور برطانیہ کی گرفت میں آ چکے تھے۔ انہی دونوں ممالک کی شہ پر اکتوبر 1958ء میں سکندر مرزا نے اسمبلیاں ختم کر کے مارشل لا نافذ کر دیا۔ جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نامزد ہوئے۔ چند ہفتوں بعد جنرل ایوب خان نے صدر سکندر مرزا سے گن پوائنٹ پر استعفیٰ لے لیا۔ امریکا اور برطانیہ کے سفیر اس صورت حال کے بارے میں اپنی حکومتوں کو خفیہ رپورٹیں روانہ کرتے رہے۔

امریکا خفیہ طور پر پاکستان کے عسکری لیڈروں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا تاکہ وہ جمہوری نظام ختم کر کے اقتدار سنبھال لیں۔ امریکی انتظامیہ کا خیال تھا کہ پاکستان میں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنے والی جمہوری حکومت خطے میں امریکا کے مفادات آگے بڑھانے میں مکمل تعاون سے گریز کرے گی۔ لہٰذا سرد جنگ کے اہم موڑ پر اسے ایسی فوجی حکومت کی ضرورت تھی جو امریکا کے ساتھ بآسانی معاملات طے کر سکے۔ البتہ علانیہ

طور پر امریکا جمہوریت کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کرتا رہا۔

سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان، دونوں امریکا نواز تھے۔ مارشل لا نافذ کر کے سکندر مرزا نے مختارِ کُل بننے کی کوشش کی۔ جنرل ایوب طاقتور جرنیل تھے۔ اُن کے اپنے سیاسی عزائم تھے۔ انھیں یہ خفیہ اطلاعات ملیں کہ سکندر مرزا فوج کے جرنیلوں سے ساز باز کر کے اِن کو فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حکم پر 27 اکتوبر 1958ء کی رات تین جرنیلوں نے سکندر مرزا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

جنرل ایوب خان پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ جنرل ایوب نے امریکی سفارت کاروں کو یقین دلایا "حالیہ تبدیلیوں کے بعد پاکستان زیادہ وفاداری کے ساتھ دفاعی معاہدوں پر کاربند رہے گا۔" امریکی امداد کا تسلسل پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

امریکا کی الٹی قلابازی

جنرل ایوب خان نے پاک فوج کی تربیت اور تشکیل امریکن ڈیفنس ڈاکٹرائن کے مطابق کی۔ انھوں نے 1954ء سے 1964ء تک فوجی افسروں کو مسلسل امریکا میں عسکری تربیت کے لیے بھیجا۔ پاک فوج کے جوان اور افسر سیٹو اور سینٹو کمانڈ کے تحت فرائض انجام دیتے رہے۔ پاک فوج کو امریکی اسلحے سے مسلح کیا گیا۔ امریکی فوج کے تربیت کار پاک فوج کے جوانوں کی تربیت کرتے رہے۔ اس طرح پاک فوج ذہنی طور پر امریکا نواز بن گئی اور امریکی اسلحے پر انحصار کرنے لگی۔

لیکن 1960ء تک امریکا اور روس کے درمیان سرد جنگ میں شدت باقی نہ رہی۔ دونوں عالمی طاقتوں نے چین کا راستہ روکنے کے لیے آپس میں مفاہمت کر لی۔ امریکا کے صدر کینیڈی بھارت نواز تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر بھارت معاشی طور پر ترقی کر

کے چین کے برابر نہ آیا تو آزاد دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کینیڈی نے اپنے دورِ حکومت میں بھارت کی امداد میں اضافہ کیا۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے مشیر ہنری کسنجر نے 1961ء میں بھارت کا دورہ کیا اور بھارت کے ایشیائی کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ گزشتہ امریکی حکومت ''پاکی'' مرض میں مبتلا تھی۔ ''پاکی'' کا لفظ پاکستان کے لیے نفرت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ حتیٰ کہ پاکستان میں امریکی سفیر لانگلے نے امریکی حکومت کے نام خفیہ خط میں پاک فوج کی تعداد کم کرنے کی سفارش کر دی۔

روس نے مئی 1960ء میں پاکستانی اڈے (بڈبیر) سے پرواز کرنے والا امریکی جاسوس طیارہ یو۔ٹو مار گرایا۔ روس کے صدر خروشیف نے پاکستان کو کھلی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان آگ سے نہ کھیلے۔ اعلیٰ روسی حکام کا کہنا تھا کہ:

''ہم نے اپنے نقشوں میں پشاور کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا ہے۔''

اس وقت جنرل ایوب خان لندن میں تھے۔ سی آئی اے کے سٹیشن چیف نے اس واقعے کے بارے میں جنرل ایوب کو مطلع کیا۔ انھوں نے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا کہ انھیں توقع تھی کہ کسی مرحلے پر یہ واقعہ رونما ہوگا۔

جنرل ایوب اگر قومی مفادات کو ترجیح دینے کی پالیسی اپناتے تو وہ کبھی امریکا کو اپنی سرزمین پر امریکی فوجی اڈوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔ غیر سیاسی اور غیر جمہوری حکمران بڑی آسانی سے عالمی طاقتوں کے دباؤ میں آ کر ایسے فیصلے کر بیٹھتے ہیں جن کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یو۔ٹو واقعے کے بعد جنرل ایوب خان نے روس کا غصہ کم کرنے کے لیے خارجہ پالیسی متوازن بنانے کی کوششیں کیں۔ امریکی لابی کے وزیر خزانہ شعیب کی مخالفت کے باوجود وزیر تجارت بھٹو کو اجازت دی کہ وہ پاکستان میں تیل اور گیس کی تلاش کے لیے روسی کمپنیوں سے معاہدہ کرے۔ جنرل ایوب نے بھٹو کی سفارش پر اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے امریکی صدر کینیڈی کو پریشان کر دیا۔

لیکن جنرل ایوب خان نے جولائی 1961ء میں امریکا کا دورہ کیا تو امریکی کانگریس کے ارکان کو یقین دلایا کہ پاکستان امریکا کا اتحادی رہے گا۔ جنرل ایوب نے کہا:

> ''ایشیا میں اور کوئی ملک نہیں جہاں امریکا قدم بھی رکھ سکے۔ صرف پاکستان کے عوام ہی امریکا کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔'' جنرل ایوب خان نے صدر کینیڈی پر مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لیے زور دیا اور انتباہ کیا کہ اگر امریکا نے بھارت چین جنگ کی صورت میں بھارت کو اسلحہ دیا تو پاکستان دفاعی معاہدوں سے باہر نکل آئے گا۔ صدر کینیڈی نے جنرل ایوب کو یقین دلایا کہ امریکی پالیسی کے مطابق بھارت کو اسلحہ سپلائی کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر امریکی پالیسی تبدیل ہوئی تو صدر کینیڈی صدر ایوب سے مشورہ کریں گے۔ لیکن نومبر 1962ء میں جب چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازع شروع ہوا تو امریکا نے صدر ایوب کو بتائے بغیر بھارت کو اسلحہ بھجوا دیا۔

جرنیل حکمران نے موقع گنوا دیا

1962ء میں بھارت چین کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ تب پاکستان کے لیے کشمیر لینے کا سنہرا اور تاریخی موقع تھا۔ مگر امریکا اور برطانیہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ غیر جانب دار رہے اور یقین دلایا کہ اس مرحلے پر تعاون کا مظاہرہ تنازع کشمیر حل کرنے میں انتہائی سودمند ثابت ہوگا۔ یوں اس جرنیل حکمران نے یہ سنہرا موقع گنوا دیا۔ امریکا اور برطانیہ ایک بار پھر پاکستان کو بیوقوف بنانے میں کامیاب رہے۔ امریکا نے پاکستانیوں کی ناراضی کم کرنے کے لیے بذریعہ تار یقین دہانی کرائی کہ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو امریکا اِن کی مدد کرے گا۔ امریکا وقتی مصلحتوں کے تحت زبانی اور تحریری طور پر اس نوعیت کی

یقین دہانیاں کراتا رہا مگر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران امریکا نے تمام معاہدے اور وعدے نظر انداز کر دیے۔

امریکی صدر جانسن جنرل ایوب کو اپنی دوستی اور اعتماد کا یقین دلاتے رہے مگر پاکستان امریکا کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ جنرل ایوب 1965ء کی پاک بھارت جنگ اور معاہدہ تاشقند کے بعد عوام میں مقبولیت کھو بیٹھے۔ انھوں نے عوامی دباؤ کے تحت 1967ء میں روس کا دورہ کیا اور امریکی فوجی اڈے بڈبیر کی لیز ختم کر دی۔ جنرل ایوب نے 1967 میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ:

> ''ترقی پذیر ممالک میں امریکا اور برطانیہ نے جمہوریت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ انھوں نے ہمیں اپنے حالات کے مطابق جمہوری نظام تشکیل نہیں کرنے دیا۔ وہ ہمیں کمزور اور عدم استحکام کا شکار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اُن کے رحم و کرم پر رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی سوچ سیاسی اور مکمل طور پر بددیانتی پر مبنی ہے۔''

جنرل ایوب خان امریکا کی غیر متوقع بے وفائی سے دل گرفتہ ہوئے اور انھوں نے ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' نامی کتاب تحریر کی جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پاکستان کو آقا نہیں بلکہ دوستوں کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنرل ایوب سمیت پاکستان کے تمام حکمرانوں نے امریکا کو آقا کے طور پر تسلیم کر کے اس کی بالادستی کو قبول کر لیا۔

پاک امریکا تعلقات کی تاریخ کو نشیب و فراز کی تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آج بھی امریکا ہمارا قابل اعتماد دوست نہیں کہلاتا۔ دونوں ممالک کے تعلقات کبھی اس قدر خوشگوار ہو گئے کہ اسے ہنی مون پیریڈ کا نام دیا گیا اور کبھی اس قدر کشیدہ کہ پاکستان پر خصوصی آئینی ترامیم کر کے پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ سچ یہ ہے کہ امریکا ایک ایسا ناقابل اعتبار دوست ثابت ہوا جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔

غلامی سے نجات کا راستہ

پاکستان میں ہمیشہ قومی زبان اردو کے مقابلے میں انگریزی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ چنانچہ انگریزی بولنے والے پاکستان کا ایلیٹ طبقہ بن گئے جو ریاست اور اس کے وسائل پر قابض اور امریکا کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان میں سینیئر عسکری اور سول بیوروکریٹس، جاگیردار، تاجر اور منیجرز شامل ہیں۔ ان کے امریکا سے گہرے رابطے ہیں جو انھوں نے تعلیمی، سرکاری اور تجارتی ذرائع سے استوار کیے ہیں۔

پاکستان کے بااثر خاندانوں کی اولاد امریکا میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ امریکا نے عالمی تنظیموں مثلاً اقوام متحدہ، آئی ایم ایف، عالمی بینک، ایشیا ڈیویلپمنٹ بینک اور این جی اوز کے ذریعے بھی پاکستان میں اثر ورسوخ بڑھایا ہے۔ پاکستان میں امریکی مداخلت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی آزادی اور خودمختاری کے حوالے سے گہری تشویش میں مبتلا ہیں۔ پاکستان کو آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری نظام مستحکم بنایا جائے۔ جمہوریت تسلسل کے ساتھ چلتی رہے۔ پاکستان کے تمام پالیسی فیصلے پارلیمنٹ میں کیے جائیں تاکہ بیرونی عالمی ادارے فرد واحد کو حکم دینے کی حیثیت میں نہ رہیں۔

امریکا اور صیہون

امن کے نام پر دنیا کو بدامنی اور معاشی خانہ جنگی سے دوچار کرنے والے امریکہ کی معیشت خود غرقاب ہو رہی ہے۔ 9 ستمبر 2001 میں نیو یارک اور واشنگٹن پر ہونے والے دہشت گرد حملوں اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد 15 ہنگامہ خیز برسوں میں دنیا جنگوں، دہشت گردی، خونریزی، معاشی اور سماجی بربادی کے ہاتھوں بہت تاراج ہوئی ہے۔ یہ خوفناک واقعہ تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا جس کا نقش اجتماعی نفسیات پر ثبت ہو چکا ہے۔ لگ بھگ تین ہزار امریکی اس تباہی میں ہلاک ہوئے۔ اس مجرمانہ اور پاگل پن کی کارروائی کو انجام دینے والے ہر طرح سے قابل مذمت ہیں لیکن ان منافقانہ وجوہات کی بنا پر نہیں جو اس وقت بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر بیان کر رہے تھے۔

نائن الیون سے متعلق لاتعداد من گھڑت تھیوریاں پیش کی جا چکی ہیں۔ ہر تھیوری کے پیچھے اپنے مفادات ہیں لیکن یہ بات انتہائی حیرت انگیز و فکر انگیز ہے کہ دنیا کی سب سے قوی عسکری اور معاشی طاقت کی انٹیلی جنس ایجنسیاں اتنی ناکارہ تھیں کہ انہیں اتنے بڑے حملے کے منصوبے کا علم ہی نہیں تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سی آئی اے اتنی بے خبر اور نااہل تھی کہ اس نے امریکہ کے قلب پر اتنے تباہ کن حملے ہونے دیئے؟

نائن الیون دہشتگردی کا ایک امکان جسے مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی اپنی ترغیب تھی جو قابو سے باہر ہو گئی۔ سازشوں، اشتعال انگیزیوں اور جوابی اشتعال انگیزیوں سے بھری خفیہ ایجنسیوں کی اندھیری دنیا میں یہ خارج از

امکان نہیں ہے کہ امریکی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے ایک دھڑے نے بڑے پیمانے پر جنگجو پالیسی اور جنگی ساز و سامان کے حصول کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے خود امریکہ کے اندر نائن الیون کا دہشتگردانہ حملہ کرایا اور دنیا کا سب بڑا ڈرامہ تخلیق کر ڈالا لیکن ان حملوں کی تباہ کاری سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اشتعال انگیزی پر مبنی یہ پلاننگ قابو سے باہر ہوگئی'' جبکہ نائن الیون کے بعد امریکی اسلحہ ساز و عسکری صنعت (ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس) کا دنیا کے سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار بن جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ نائن الیون کا واقعہ حقیقت میں وہ نہیں جس کا اظہار کر کے دنیا بھر کو جنگ کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے بلکہ حقیقت کچھ اور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ 11 ستمبر 2001 کے بعد پندرہ سال گزر جانے کے باوجود اس دہشت گردی کے واقعے کا حقیقی سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ حکمرانوں کے مختلف دھڑوں کے مفکروں اور تجزیہ کاروں نے سیاق و سباق سے عاری سازشوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی لامحدود من گھڑت تھیوریاں پیش کیں۔ امریکی سامراجی آقاؤں نے ایک مکمل تجزیہ اور منصوبہ پیش کر دیا جیسے کہ پہلے سے تیار پڑا ہوا تھا۔ امن پر مبنی ''سامراجی جارحیت'' کی انتقامی پالیسی کو فوری طور پر لاگو کر دیا گیا اور پہلے افغانستان اور پھر عراق پر فوج کشی کا جواز بنا لیا۔ یہ واقعہ جس میں تین ہزار سے زائد امریکی محنت کش مارے گئے تھے جتنا المناک تھا اسکو امریکی سامراج نے اتنی ہی بے دردی اور سفاکی سے استعمال کیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 1990 کی دہائی میں رجعت پرست سامراجی نظریہ دان سیموئیل ہنٹنگٹن نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نائن الیون جیسا دیو ہیکل واقعہ تخلیق کیا گیا جس کے بعد دہشتگردی کے خاتمے اور دنیا کو دہشتگردی سے بچا کر مستقبل محفوظ بنانے کے نام پر دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔

اس واقعے کے بعد لاک ہیڈ مارٹن، جنرل ڈائنامکس، ہیلی برٹن، جنرل الیکٹرک اور دیگر امریکی و اسرائیلی کمپنیاں اس خود ساختہ ''نفاذ امن'' کا سہارا لیکر بے پناہ دولت کی

مالک بن چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 11/9 کے فوری بعد امریکی جنگی مشینری ایسے حرکت میں آئی جیسے افغانستان اور عراق پر حملے کا تفصیلی منصوبہ پہلے سے ہی ان کے پاس موجود ہو۔ ان جنگوں پر آنے والی مجموعی لاگت 5 ہزار ارب ڈالر سے بھی زیادہ ہے اور اس رقم کا بڑا حصہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بنانے والوں کی جیبوں میں جا رہا ہے۔ انتہائی محتاط اندازوں کے مطابق عراق اور افغانستان میں قریباً دو لاکھ بے گناہ شہری قتل اور ایک کروڑ سے ائد ہجرت پر مجبور ہوئے۔

یہ سب کالے دھن کے پجاری و درندہ صفت بنیاد پرست دہشت گردوں' منڈیوں اور اقتدار کے بھوکے سامراج کی وحشت ناک بربریت ہے۔ امریکی محنت کش اور نوجوان بھی اس معاشی وسماجی یلغار کا شکار ہوئے ہیں جو اس جنگ کے اخراجات پورے کرنے اور جوئے پر مبنی مالیاتی اداروں اور بینکوں کو بچانے کی خاطر ان پر مسلط کی گئی ہے۔ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں امریکی نوجوان، سامراج کے دیوانہ وار ننگے ناچ کا شکار بن چکے ہیں جن کے پاس تیزی سے بڑھتی ہوئی بیروزگاری میں مسلح افواج میں بھرتی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جبکہ جنگ کا دائرہ کار ابھی مسلسل فروغ پا رہا ہے ایک جانب امریکہ افغانستان و پاکستان میں بدستور ڈرون حملے کر رہا ہے تو دوسری جانب مصر اور شام کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک کر سرمایہ دارانہ نظام کے متوالوں کی تجوریاں بھرنے کی سازش وسعت پا رہی ہے۔ یہ امریکی سائنس اور ٹیکنالوجی کے حاصلات اور یہاں کی سیاسی اشرافیہ کے عامیانہ پن اور پسماندگی کے مابین ایک تضاد ہے۔

امریکی سامراج کی بے پناہ قوت، اس کی بے شمار دولت اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد ساری دنیا پر غلبے کی وجہ سے اس میں ہتک آمیز تکبر پیدا ہوا لیکن داخلی اور خارجہ پالیسی میں مسلسل ناکامیاں اس سلطنت کے آخری زوال کو عیاں کر رہی ہیں۔ ایک طرف دور دراز کے ممالک کو تباہ کرنے کے باوجود امریکی سامراج کو ایک کے بعد دوسری

شکست کا سامنا ہے اور دوسری جانب تیزی سے پھیلتا ہوا معاشی بحران امریکی معیشت کو کھائے جا رہا ہے اور سماج میں بے اطمینانی سرایت کر چکی ہے۔

جبکہ اس رپورٹ کے منظرِ عام پر آ جانے کے بعد کہ افغانستان و پاکستان میں جو ڈرون حملے جاری ہیں ان کے متعلق یہ خدشات ہیں کہ عام طور پر سی آئی اے کو معلوم نہیں کہ جن افراد کو ان حملوں سے مارا جاتا ہے وہ کون ہیں اور ان کو کیوں مارا جا رہا ہے۔ امریکی فوج کے مطالبات کے آگے اوباما حکومت کی پسپائی اور ڈرون حملے جاری رکھنے کی حکمتِ عملی اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکی انتظامیہ سخت ترین یہودی کنٹرول میں جنگی صنعت کے سامنے بے بس ہو چکی ہے۔

سرمایہ داری کا بحران اجرتوں، حالاتِ زندگی اور مراعات میں گراوٹ لا رہا ہے۔ محنت کشوں کے پاس اس کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ گزشتہ 30 برس میں دولت غیر معمولی طور پر اوپر کی جانب منتقل ہوئی ہے اور محنت کشوں کی پیدا کردہ دولت کا بڑا حصہ پہلے سے ہی بے حد امیر افراد کی جیبوں میں جاتا رہا ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں میں امریکہ کی مجموعی ملکی پیداوار (جی ڈی پی) میں تین گنا اضافہ ہوا ہے لیکن اجرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور اگر افراطِ زر کو شمار کریں تو ان میں کمی واقع ہوئی ہے۔

امارت اور غربت کی یہ خلیج اب بے پناہ وسیع ہو چکی ہے۔ ڈیموکریٹ اور ری پبلکن امریکی پرولتاریہ کے خلاف سرمایہ داروں کے احکامات پر عملدرآمد کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ 1930 کی دہائی میں امریکہ دنیا کا سب سے بڑا قرض خواہ ملک تھا اور آج دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک بن چکا ہے۔ مئی 2012ء میں امریکہ کا مجموعی سرکاری قرضہ 15.7 ٹریلین ڈالر تھا جو مجموعی قومی پیداوار کا 102 فیصد ہے۔ امریکہ میں خوشحال زندگی کے خواب کی مادی بنیادیں ٹوٹ کر بکھر گئی ہیں۔ 1930 کی دہائی کے بعد سے پہلی مرتبہ امریکیوں کی اکثریت آمدن اور دولت کی از سرِ نو تقسیم کے حق میں ہے۔ ایک تحقیق کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ 18 سے 29 برس کی عمر کے 49 فیصد امریکی

سوشلزم کے حق میں ہیں جبکہ 43 فیصد سرمایہ داری کے حامی ہیں۔

چند برس پیشتر وال سٹریٹ پر قبضے کی تحریک سے امریکہ اور تمام دنیا ششدر رہ گئے۔ تیونس، مصر، سپین، یونان اور وسکانسن کے واقعات سے متاثر ہو کر شروع ہونے والی چھوٹی سی تحریک امریکہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ساری دنیا میں اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ مظاہرین کے مقاصد مختلف تھے لیکن وہ موجودہ صورتحال کے خلاف تبدیلی کے لیے متحد تھے۔ امریکی محنت کشوں اور نوجوانوں پر لگایا جانے والا ''بے حسی'' کا الزام خاک میں مل گیا۔ اب تک سامراجی آقا نائن الیون کے آسیب سے ڈرا کر ساری دنیا میں محکوم طبقات کو مجبور کرنے کی جس سازش کے ذریعے دنیا کو اپنی تباہ ہوتی معیشت کے تحفظ کیلئے محافظ و ڈھال بناتا چلا آیا ہے اس پر سے نقاب اتر رہا ہے اور دنیا دہشتگردی کے خوف کے ساتھ امریکی سحر سے بھی آزاد ہو رہی ہے۔ چین کی اقتصادی ترقی اور امریکا کا معاشی زوال عیاں ہے۔ امریکہ میں طبقاتی جدوجہد کے ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے جس کے بارے میں مشہور روسی دانشور ٹراٹسکی نے کئی دہائیاں قبل کہا تھا کہ یہ ''وہ فولاد کی بھٹی ہے جس میں دنیا کا مستقبل پک کر تیار ہو گا''۔ جنگی صنعت کا اونٹ امریکی معاشی تباہی کی جانب بیٹھنے کیلئے کروٹ بدل چکا ہے اور جس دن یہ اونٹ بیٹھا امریکی معیشت اس کے نیچے پس کر ریزہ ریزہ اور اس کے غرور کا بت چور چور ہو جائے گا۔

صیہونیت

قرآنِ کریم اور تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی انعامات سے نوازا تھا۔ لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی تو انسانی قیادت و رہنمائی کی باگ ڈور ان سے چھین لی گئی۔ اس قوم نے اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو قتل کیا، کتاب الٰہی میں تحریف کی، ان گھناونے جرائم کے نتیجہ میں ان کو مختلف

امراض میں مبتلا کر دیا گیا، یہی امراض ان یہودیوں کی قومی خصوصیات بن گئے یعنی بزدلی، مجرمانہ ذہن اور قساوتِ قلبی، ناشکری، کذب، بہتان تراشی، مکروفریب اور دھوکہ دہی، مال کی پرستش اور حرام خوری، عہد شکنی وخیانت، تکبروغرور، فسق وفجور، بے حیائی، سودخوری اور ذلت ورسوائی، ان پر لگے قدرت کے ان بدنما داغوں کو دھونے کے لیے یہودیوں نے پہلا نشانہ مسیحیوں کو پھر مسلمانوں کو اور اس کے بعد ساری انسانیت کو بنایا۔ یہودیوں نے زیادہ تر منافق مسلمانوں کے بھیس میں، مسلمانوں کو ہر دور میں زک پہنچانے اور فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہوتا ہے۔

بغداد کی ساڑھے پانچ سو سالہ عباسی خلافت 1258ء میں آخری خلیفہ مستعصم باللہ کے منافق وزیراعظم بن علقمی کی غداری اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں ختم ہوئی اور چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تین چار دن میں کئی لاکھ مسلمان قتل ہوئے جن کے خون سے دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا خلیفہ مستعصم اپنے تین سو ساتھیوں کے ہمراہ غیر مشروط طور پر بغداد چھوڑنے کے لیے نکلا مگر ہلاکو نے اس کو پکڑ کر قتل کر ڈالا اس طرح ان منافقوں کے طفیل عباسی خلافت کا وجود مٹ گیا۔

بحیرہ روم کے جزیرے سسلی کو اسد بن فرات کی سرکردگی میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور تقریباً دو صدیوں تک بڑے رعب و دبدبہ سے وہاں حکومت کی تھی۔ بالآخر قصریانہ کے منافق حاکم ابن حمود کی غداری کے نتیجہ میں یہ علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ سسلی کے سقوط کے بعد مصر کے فاطمی خلیفہ نے نصرانیوں کے فاتح جرنیل راج کے پاس مبارک بادی مکتوب بھیجا تھا جس میں راجر کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے جزیرہ سسلی کے مسلمانوں کو شکست کا مستحق قرار دیا تھا۔

فاطمی حکومت مراکش میں قائم ہوئی تھی اور سو سال بعد اس کی قیادت منتقل ہو کر مصر آ گئی تھی۔ اس منافق حکومت کو کھلے طور یہود و نصاریٰ پر اعتماد تھا، انہی میں سے زیادہ تر

وزراء، ٹیکس اور زکوۃ کے محصلین ، سیاسی ، اقتصادی اور علمی امور کے مشیر، اطباء اور حکام کے معتمدین ہوتے تھے اور بڑے بڑے کام انہیں کے سپرد کیئے جاتے تھے، ان لوگوں کے ظلم وستم سے لوگ پناہ مانگتے تھے۔ ان کی کہیں بھی دادرسی نہ ہوتی تھی، عزیز فاطمی نے اپنے وزیر یعقوب بن کلس یہودی کی محبت میں فاطمی مذہب کے لیے دعوت کا کام اس کے حوالہ کر دیا تھا۔ یہ وزیر خود بیٹھ کر منافق فقہ کا درس دیتا تھا، اس طرح اس منافق حکومت کے طفیل یہودیوں کے ہاتھوں مصر کے عوام کو ناقابل تلافی دینی اور دنیاوی نقصانات پہنچتے رہے۔ بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں یہ منافق حکومت ختم ہوئی اور مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت جو اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں کابل سے لے کر رنگون تک وسیع ہوگئی تھی ان کی وفات کے بعد منافق عناصر کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں زوال پذیر ہوگئی۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے سادات بارہہ کے نام سے دو مشہور بھائیوں، عبداللہ اور علی بن حسین کے کردار وحرکات مخفی نہیں۔ یہ دونوں منافقین کے پیروکار اور بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوگئے تھے ان کا عروج مغلوں کے زوال کا سبب بن گیا اور پچاس سال کے مختصر عرصے میں صدیوں سے قائم مغل سلطنت انحطاط وخاتمے کے نزدیک پہنچ گئی، بالآخر 1857 میں انگریزوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون میں قید کر دیا وہاں اس کی موت ہوگئی، اس طرح ہندوستان میں بھی مسلم حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

پلاسی کی جنگ میں جب سراج الدولہ بنگال میں انگریزوں کے دانت کھٹے کر رہا تھا تو عین وقت پر اس کے منافق وزیر میر جعفر کی غداری سے پانسہ پلٹ گیا، اور سراج الدولہ کو شکست ہوگئی اس طرح ان منافقوں کے طفیل مشرقی ہندوستان میں انگریزوں کو پیر جمانے اور سیاسی طور پر مستحکم ہونے کا موقع ملا۔

سلطان ٹیپو شہید جنوبی ہند میں انگریزوں کے لئے بلائے بے درماں بنے ہوئے

تھے۔مگر منافقوں نے ان سے غداری کی۔ حیدرآباد کا حکمراں نظام جو کہ خود منافق تھا انگریزوں کے شانہ بشانہ ٹیپو کے خلاف لڑ رہا تھا اور سرنگا پٹم کے محاصرے کے دوران ٹیپو سلطان کے وزیر میر صادق نے جو منافق تھا عین لڑائی کے دوران غداری کی اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ آخری اسلامی خلافت یعنی ترکوں کی حکومت کے زوال کے اسباب اگرچہ اور بھی تھے جیسے بعض ترک سلاطین کی کمزوری وعیش کوشی، سیاسی امور میں حاشیہ نشینوں کی مداخلت، حکومتی شعبوں کا بگاڑ اور رشوت کی گرم بازاری، سیاسی اعتقادی اور فکر زندگی کے بگاڑ کے دوسرے بہت سے محرکات، مگر صلیبی اور صہیونی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور دشمنانِ اسلام یہود کی سازشیں، عثمانی خلافت کے خاتمہ کی اہم وجہ تھیں۔

1897ء میں جب عثمانی ترک سلطان عبدالحمید برسراقتدار تھے، سوئزرلینڈ کے شہر پال میں ہرتزل یہودی کی سربراہی میں صہیونی کانفرنس منعقد ہوئی، جو پال کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔اسی کانفرنس میں فلسطین کے اندر یہودی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ تیار ہوا۔ یہودیوں نے عرب قوم پرستوں کے دشمن سلطان عبدالحمید کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ یہودیوں کو فلسطین ہجرت کرنے کی اجازت دی جائے، سلطان عبدالحمید دوم نے اس تجویز کو قطعیت کے ساتھ صرف رد ہی نہیں کیا بلکہ فوراً یہ قانون نافذ کردیا کہ یہودی ہجرت سختی سے روک دی جائے اور فلسطین میں یہودی نوآبادیاں کسی قیمت پر قائم نہ ہونے دی جائیں۔

فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کی مخالفت سلطان عبدالحمید کی طرف سے یہودیوں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا، جس کا انہوں نے بھرپور بدلہ لیا کہ سلطان کو اس کا تصور بھی نہ تھا۔ یہودیوں نے ایک طرف حکومت دشمن تحریکوں کو ابھارا اور اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے کے بجائے نسل وقوم کے نظریوں کو فروغ دینے کی کوشش کی، دوسری طرف ان یہودیوں نے عثمانی حکومت پر اندر سے حملے شروع کردی۔ یہودی نسل، تہذیب،

آزادی، بھائی چارہ اور مساوات کا زبردست پروپیگنڈہ کرکے ترکوں کو اسلام سے منحرف کرنے میں مصروف ہوگئے تاکہ ان فریب خوردہ افراد کو مسخر کرکے امت مسلمہ کے شیرازے کو منتشر کردیں۔

ان لوگوں نے ترکی کو پہلی جنگ عظیم میں بلاکسی معقول عذر کے دھکیل دیا، بعد ازاں جب ترکی کی حلیف جرمن قوم کو شکست ہوگئی تو ترکی نے بھی اپنی شکست کو تسلیم کرلیا اور 1918 کے معاہدہ روڈس میں باقاعدہ طور پر عثمانی حکومت اور اسلامی عزت ووقار کا آفتاب غروب ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست تسلیم کرلینے کے بعد یورپی ممالک نے اس مرد بیمار کی املاک کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ یوں یہود کی کوشش اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں ترکی کو زوال ہوا اور پھر اس کے بعد سے پورا عالم اسلام یکے بعد دیگرے زوال کا شکار ہوتا چلا گیا، اتحاد اور وحدت اسلامی کے رشتے کمزور پڑتے گئے اس زوال اور ادبار سے عرب بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

انقلاب فرانس کے پس پردہ یہودی ذہن کارفرما تھا، اس کے پروردہ نپولین بونا پارٹ نے 1789ء میں مصر پر چڑھائی کی، ازہر یونیورسٹی کو گھوڑوں کا اصطبل بنادیا، قاہرہ سے سکندریہ تک راستے میں جو بستیاں اور شہر تھے، انہیں تباہ کردیا، فرانسیسی استعمار نے اپنے قدم مصر کی سرزمین پر جمالینے کے بعد وہاں شراب، جوا، فحاشی اور اخلاقی بے راہ روی کو رواج دینے کے لیے اپنے تمام وسائل جھونک دیئے تھے۔ مصر وشام میں عرب وغیر عرب مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے انہوں نے مائیکل ایفلک اور لارنس جیسے یہودیوں کی خدمات حاصل کیں اور انہوں نے عربی عوام میں عربی تفاخر اور عرب قومیت کے نظریہ کو رواج دیا اور ان کی کوششوں سے عربوں کے قومی جذبات وعصبیت ابھر کر رفتہ رفتہ اس سطح پر پہنچ گئی کہ وہ ابوجہل اور ابولہب جیسے دشمنان اسلام کو اپنا قومی ہیرو تصور کرنے لگے اور مصر میں ان کے نام سے کلب قائم کیے جانے لگے۔ یہ صورت حال مصر اور پورے عالم عرب

کے لئے قومی عصبیت اور مغربی تہذیب وتمدن کی طرف پیش قدمی کرنے اور انقلاب فرانس کیا صول ثلاثہ پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔

عربوں کو خلافت عثمانیہ سے برگشتہ کرنے کے لیے یہودی النسل لارنس نے ان کے اندر عرب قومیت کا جنون پیدا کر کے انہیں ملت اسلامیہ سے ذہنی طور پر علیحدہ کرنے اور مغربی افکار ونظریات کا دلدادہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس کے پیروکار ساطع حضرمی جیسے شخص نے جس کی عجمیت کا حال یہ تھا کہ وہ فصیح عربی بولنے پر بھی قادر نہ تھا اور صہیونی تربیت کے نتیجہ میں اسلام سے سخت عداوت رکھتا تھا عرب قومیت کے نظریہ کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور یہودی عناصر کی امداد وتعاون کے سہارے اسے اس مہم میں بڑی حدتک کامیابی حاصل ہوئی۔

عرب قومیت کا نظریہ جس کا سیکولر مفہوم اسلام دشمنی تھا، یہودی ذہن کی پیداوار تھا اور یہ نظریہ ان صیہونیوں نے ایک سازش کے تحت سیدھے سادے عربوں کو عثمانی خلافت سے برگزشتہ کرنے اور ملت اسلامیہ سے انہیں ذہنی طور پر علیحدہ کرنے کے لیے تراشا تھا۔اس کا مقصد عربوں کو اس جامع عقیدہ ''انما المومنون اخوۃ'' سے دور کرنا تھا جس کی بنا پر عرب متفقہ طور پر صہیونیت کا مقابلہ کر سکتے تھے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ یہود اور دشمنان اسلام کے دانت کھٹے کر سکتے تھے۔عرب قومیت کا نظریہ عربوں کے دائمی انتشار کی ضمانت تھا، کیونکہ یہ ایسے قوم پرست اور انقلاب پسند نوجوانوں سے عبارت تھا جس کے پاس نہ تو کوئی عقیدہ تھا اور نہ اصلیت اور تاریخی بیدار مغزی تھی۔اس طرح انہیں بڑی آسانی سے چند نعرے سمجھائے جاسکتے تھے جنہیں وہ برابر دہراتے رہیں اور اپنی اپنی قوم کی عقلوں کو اسی میں الجھائے رہیں۔عرب قومیت نے عربوں کو ذہنی طور پر انتہائی نیچی سطح پر پہنچا دیا اور وہ عالم اسلام کی ذہنی قیادت کے منصب عظمیٰ کو چھوڑ کر محدود گروہی سیاست اور قومی وعلاقائی عصبیتوں کے دام وفریب میں اسیر ہو کر رہ گئے۔

سانحہ مشرقی پاکستان: صیہونی سازش

بین الاقوامی سازشوں نے دسمبر 1971ء میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان کو بزورِ قوت دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اقوامِ متحدہ، جو درحقیقت نطشے کے فلسفہ قوت کا مظہر ہے، پاکستانی شکست و ریخت کا تماشہ دیکھتی رہی۔ اقوامِ متحدہ پر صیہونی کنٹرول اور سامراج کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ اظہر من الشّمس ہے۔

ہم یہ سمجھتے رہے کہ محض سفید و سرخ سامراج نے ہندوستان کے ذریعے اس ''المیہ ڈرامے'' کو سٹیج کیا اور اسی لیے ہماری نظریں دست ہندی اور دست روسی سے آگے نہیں جا سکیں۔ صحافت بھی روس کے مکروفریب پر بین کرتی رہی۔ بدقسمتی سے ہماری نظریں دست اسرائیل کا انکشاف نہیں کر سکیں حالانکہ یہودی خفیہ طور پر اپنے پروٹوکول کے نظریات پر عمل پیرا تھے اور اسلامی ریاست پاکستان کو توڑنے کے درپے تھے۔

جون 1967ء میں اسرائیل نے جس طرح شرقِ اوسط کو روندا وہ تمام دنیا نے دیکھا۔ جنگ کے بعد اسرائیل کی نظریں پاکستان کی طرف اٹھیں۔ چنانچہ 1967ء کی جنگ کے بعد پہلے اسرائیلی وزیراعظم بن گورین نے پاکستان کو توڑنے کی ہدایات عالمی صیہونیت کو دیں جو برطانوی یہودی ہفتہ وار میگزین ''دی جیوش کرانیکل'' میں 19 اگست 1967ء میں منظرِ عام پر آئیں۔ بن گورین نے پیرس میں تقریر کرتے ہوئے عالمی صیہونیت کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا کہ ''عالمی صیہونی تحریک کو پاکستان کے خطرے سے بے خبر رہنا نہیں چاہیے بلکہ اب صیہونیت کا پہلا نشانہ پاکستان پر ہونا چاہیے کیونکہ یہ نظریاتی ریاست ہمارے وجود کے لیے ایک چیلنج ہے۔ پاکستان یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے محبت کرتا ہے۔ عرب ہمارے لیے اتنے خطرناک نہیں ہیں۔ جتنا عربوں کے ساتھ محبت کرنے والا پاکستان خطرناک ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر صیہونیت کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ

پاکستان کے خلاف فوری قدم اٹھائے ۔اس کے برخلاف ہندوستان کے ہندو تاریخ میں ہمیشہ مسلمانوں سے نفرت کرتے رہے ہیں، پاکستان کے خلاف جدوجہد کرنے اور تحریک چلانے کے لیے ہندوستان ہی ہمارے لیے سب سے اہم محاذ ہے ضروری ہے کہ ہم اس محاذ کو استعمال کریں اور بھیس بدل کر یا خفیہ پلان کے ذریعہ یہیں سے یہودیوں اور صیہونیت سے نفرت کرنے والے پاکستانیوں پر کاری ضرب لگائیں اور انہیں فنا کر دیں“

بن گورین تنہا پروٹوکول پر عمل پیرا نہیں تھا بلکہ آج بھی ہر یہودی فرد اسی ڈگر پر چل رہا ہے۔ پروفیسر ہرٹز نامی ایک یہودی امریکی عسکری ماہر نے اپنی کتاب میں پاکستان کے خلاف حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ”پاکستانی افواج میں پیغمبر اسلام کی بے پناہ محبت موجود ہے۔ یہی محبت پاکستانیوں اور عربوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ یہ عالمی صیہونیت کے لیے عظیم خطرہ ہے اور اسرائیلی توسیعات کے لیے رکاوٹ بھی۔ اسرائیلیوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی طرح اس محبت کو مٹا دیں۔“

مشرقی پاکستان کو توڑنے میں یہودیوں نے خفیہ طور پر اور بھیس بدل کر بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اس حوالے سے بعض حقائق منظر عام پر آ چکے ہیں وہ حد درجہ عبرتناک ہیں۔ 1967ء کے بعد سے بن گورین کی ہدایات پر کس طرح عمل ہوا اور ہندوستانی محاذ کو کس طرح استعمال کیا گیا اس کے دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کافی ہے۔ اسرائیلی خفیہ کاوشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ 1967ء کے بعد محض تین سال کے اندر اندر 1971ء میں پاکستان کو توڑ دیا گیا۔

انگریزی روزنامہ ڈان 22 دسمبر 1971ء کو اپنے لندن کے نمائندہ کی زبانی حسب ذیل حقائق کو منظر عام پر لایا ”ہندی افواج میں مشرقی کمانڈ کے یہودی چیف آف سٹاف میجر جنرل جیکب کے قریبی فیملی تعلقات اسرائیل کے ساتھ قائم ہیں۔ اس جرنیل نے مشرقی پاکستان کو توڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جس پر اسے اعزازت سے بھی نوازا گیا۔ جدید روسی اسلحہ جات اور تکنیکی مدد سے اس نے آخر اس اسلامی جمہوریہ کو توڑا۔ مقبوضہ مشرقی پاکستان میں

پہلے ہندی فوجی کمانڈر کی حیثیت سے جنرل جیکب کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ 1967ء کی شرقِ اوسط کی جنگ کے بعد ہندی فوجی ہائی کمان نے جنرل جیکب کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ اسرائیلی حربی داؤ پیچ اور برق رفتار جنگی مہارت کا خصوصی مطالعہ کرے اور ہندی طیاروں کو اس کے لیے تیار کرے تاکہ چین اور پاکستان کے خلاف اسے استعمال کیا جا سکے۔

جیکب نے روسی تکنیکی مدد سے مشرقی پاکستان پر حملہ کا پلان تیار کیا۔ اس حملہ کی تیاری کئی سالوں سے ہو رہی تھی۔ جیکب نے پاکستان کے اندر اور دونوں بازوؤں کے درمیان کہربائی انٹرسپشن تنصیبات کا جائزہ لیا۔ جاسوسی کا وسیع جال پھیلایا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے فوراً بعد اسی ہفتے جیوش آبزرور لندن میں میجر جنرل جیکب کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جیکب راکٹ کے فوجی استعمال میں مہارت رکھتا تھا اور اسی نے ہندی افواج کو اس کی تربیت دی تھی جیکب کی بہن جیوش آبزرور میں شعبہ اشتہارات میں منیجر کی حیثیت سے ملازمہ تھی۔ ان حقائق کی روشنی میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ 1971ء کی شکست پاکستان میں بین الاقوامی صلیبی سازشوں کے ساتھ صیہونی سازش بھی بے حد طاقتور تھی۔ اسے صرف اشتراکی اسلحہ جات کی مدد حاصل نہیں تھی بلکہ اس کے مربی اعلیٰ برطانیہ کی حمایت بھی حاصل تھی جس نے تقسیم ہند میں بھی کھلی ناانصافیاں کی تھیں۔

چرچل خود صیہونیت نواز تھا اور اسرائیل کی مدد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا کسے معلوم ہے کہ سرزمین ہند میں یہودی اثرات کو قائم کرنے میں اس کا کیا اثر تھا۔ ہندی وائسرائے لارڈ ویول نے احتجاجاً فلسطین کے موضوع پر ایک خصوصی کیبنٹ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم چرچل پر بڑی جسارت کے ساتھ یہ تبصرہ کیا کہ وہ غالی صیہونی ہے۔ ان بین الاقوامی سازشوں کی روشنی میں ہر محبِ پاکستان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس نظریاتی مملکت کی حفاظت کے لیے سربکف رہے اور سازشوں سے باخبر رہنے کی کوشش کرے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملک کے تعلیمی اداروں میں شرق اوسط کے

متعلق تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع نہ ہوگا ان حقائق کے پیشِ نظر ملک وقوم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پاکستانی جامعات، کالجوں، اور مدارس میں مڈل ایسٹ کے مطالعہ کا خصوصی اہتمام کرے، علاقائی دراسات کے لیے ایسے شعبے کھولے جائیں جو''ہنداسرائیلی''،تعلقات پر ریسرچ کرسکیں اور دوسری طرف شرقِ اوسط سے متعلق پاکستان کے ہمدردانہ مؤقف کے خلاف اقوام متحدہ کے اندر اور اس کے باہر ہونے والی صیہونی سازشوں اور پلان سے اہلِ ملک کو باخبر رکھ سکے۔کون جانتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے المیہ کے بعد مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے نظریہ اور لسانی تنازعات کو جنم دینے میں دیگر عناصر کے ساتھ صیہونی ہاتھ بھی ملوث رہا ہو۔عالم اسلام کی بدقسمتی ہے کہ یہاں سائنسی نہج پر شرقِ اوسط کے خصوصی لیکچرز کا اہتمام نہیں کیا گیا، نہ ہی انہیں نظام تعلیم کا حصہ قرار دیا گیا۔ حالانکہ حالات حاضرہ (کرنٹ افیرز) کے طالب علم اور استاد دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے اور پیچیدہ ترین مسئلہ سے باخبر رہیں۔ بلکہ عالم اسلام میں صیہونی خفیہ سرگرمیوں اور شکست وریخت کے پروگرام سے اپنے ملک وقوم کو متنبہ کرتے رہیں۔

یہودیوں میں حضرت داؤد سے وابستگی کا اظہار کرنے والے کٹر فرقے کے ساتھ بین الاقوامی ہمدردیاں مخفی نہیں۔ اس فرقے کا مقصد پہلے مرحلے میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانا اور دونوں کو کمزور کرنے یا کسی ایک کی شکست کی صورت میں خود پوری دنیا پر حاوی ہونا ہے۔

صیہونیت اور امریکا

یہ سوال کم از کم اس وقت سے دنیا بھر کی اقوام کے اذہان میں نقش ہو چکا ہے۔ اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے مشہور امریکی لکھاری ہنری فورڈ کی کتاب کے بعض اقتباسات سے مدد ملتی ہے۔

پانچ سو سال قبل کی بات ہے جب صیہونی امریکہ میں داخل ہوئے تھے اور اسی امریکہ میں ورود کے زمانے سے تا حال وہ اس کوشش میں لگے ہیں کہ ایک ایسی مملکت میں نفوذ کرنے میں کامیاب ہوں، جو دنیا کا سب سے بڑا اور امیر ترین ملک ہے۔ اور اتفاقاً وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ جارج واشنگٹن کے زمانے میں امریکہ میں صرف چار ہزار یہودی تھے اور انہوں نے امریکہ کی جنگ آزادی میں حمایت بھی کی، یہاں تک کہ نو آبادیاتی نظام کو تقویت دینے میں بھی انہوں نے بہت زیادہ مدد فراہم کی۔

امریکی جنگ آزادی میں صیہونیوں کی حمایت کو ابھی پچاس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کی تعداد امریکہ میں 33 لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ لیکن ان کی اصل تعداد آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ یہ بھی صیہونیوں کی سیاست کا ایک حصہ ہے، نیز پوری امریکی مردم شماری کا نظام صیہونیوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہنری فورڈ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

> دنیا بھر کے تھیٹر، سینما، چینی کی تمام تجارت، گندم، تمباکو، کاٹن، فولاد اور گوشت کی 50 فیصد تجارت، 40 فیصد سے زیادہ جوتوں کی تجارت، موسیقی کے آلات، جواہرات، الکوحل مشروبات، بنک لاکرز اور بچت کے منصوبہ جات یہودی چلا رہے ہیں۔

یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ امریکی قوم صیہونی بازار تجارت کے اپنے ملک میں ارتکاز سے کبھی راضی نہیں ہوئی کیونکہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ہر اس ملک میں جس میں صیہونیوں نے فعال کردار ادا کیا وہاں پر کرپشن اپنی آخری حدود کو چھو لیتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں دیگر اقوام اس قوم سے بدظن ہو جاتی ہیں۔

اس کی واضح مثال سپین، جرمنی اور برطانیہ جیسے ممالک ہیں، اس وقت امریکہ کچھ ایسی ہی تکلیف میں گرفتار ہے، یعنی ہر وہ غلط کام جو صیہونی انجام دیتے ہیں امریکیوں کے

نام سے تکمیل کو پہنچ چکا ہوتا ہے۔ حالانکہ امریکی قوم ان تمام وارداتوں سے بے خبر ہوتی ہے۔ صیہونیوں نے امریکہ کے ہر گوشہ و کنار میں اثر و رسوخ پیدا کیا ہوا ہے یہاں تک کہ جو بھی کلیسا امریکہ میں فعال کردار ادا کر رہا ہے اس کی نگرانی کسی نہ کسی طور صیہونیوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ درحقیقت مغرب میں چرچ کے جتنے بھی ٹریبیون مشغول تبلیغ ہیں ان کی باگ ڈور صیہونیوں کے ہاتھوں میں ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ اگر مغربی چرچ کے پادری اور کارڈینل، اپنی گفتگو میں ذرا سی دقت کریں، غور و فکر کریں تو پتہ چل جائے گا کہ اُن کے 90 فیصد تقریری مواد کی جڑیں صیہونیوں کی فکر سے مربوط ہیں۔ جب یہ بات مشاہدے میں آ رہی ہے کہ صیہونیوں نے گرجا گھروں کے مرکز تک رسائی حاصل کر رکھی ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے نفوذ سے امریکی یونیورسٹیاں محفوظ رہ گئی ہوں؟

امریکہ میں دو صیہونی ''یہودی'' تنظیمیں فعال کردار ادا کرتی ہیں جن میں امریکی یہودی کابینہ نمایاں ہے۔ یہودیوں کی نیویارک کی طرف منظم ہجرتوں کا بنیادی محرک ان کی تنظیم کی موجودگی ہے۔ کیونکہ یہ تنظیم یہودیوں کے لیے رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر وہ یہودی جو امریکہ میں رہتا ہے کم از کم ایک خفیہ تنظیم کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہوتا ہے۔ آج کل اس یہودی تنظیم نے اپنا نام بدل کر ''عالمی یہودی کانفرنس'' رکھ دیا ہے۔

دور حاضر میں صیہونیت اپنے قدیم طور سیاست کے ساتھ تمام میدانوں میں فعالیت انجام دے رہی ہے۔ اس قدیم سیاست کے مطابق کسی صیہونی کو صف اول میں کھڑا نہیں ہونا چاہئے بلکہ پس پردہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر صیہونی معاملات میں سب سے اونچے مقام پر ہوں اور کھل کر صیہونیت کی مدد کریں تو اس سے وہ دیگر اقوام کی نظروں میں آ جائیں گے۔ جبکہ مخفی اور پس پردہ رہ کر کام کرنے سے کسی بھی جگہ پر صیہونیوں پر الزام نہیں آتا اور یوں صیہونی اپنے مقاصد تک پہنچ جاتے ہیں۔

حکمران کیسے ہوں؟

پاکستان میں آج تک خالص جمہوریت نہیں آسکی؟ لیاقت علی خان کو شہید کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس ملک پر کبھی نہ ختم ہونے والا قبضہ کیا جا سکے۔ یقیناً پاک فوج کے جوانوں نے پاکستان کے لیے جانوں کے نذرانے دیے ہیں اور پاکستان کے لیے ان کی بے انتہا خدمات ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جتنا فوج نے اس وطن کو دیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ لیا بھی ہے دور کوئی سا بھی ہو در پردہ فوج کی ہی حکومت ہوتی ہے۔

ہماری بربادی میں فوج، سیاستدان، ملا اور عدلیہ سب برابر کے شریک ہیں۔ کیسے برابر کے شریک ہیں؟ آیئے اسکا جائزہ لیتے ہیں۔

فوجی جرنیل، انٹیلی جنس ادارے اور بیوروکریسی یہ سب وہ ادارے ہیں جو اس ملک کے اصل مالک ہیں اور ان سب کو ملا کر ہی اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے، کبھی یہ سامنے آکر حکومت کرتے ہیں اور کبھی پیچھے رہ کر حکومت کرتے ہیں، سامنے آکر حکومت کرنے کی صورت میں یہ اپنے کسی ایک مہرے کو استعمال کرتے ہیں اور دنیا کے سامنے دکھاوے کے لیے کٹھ پتلی سیاستدانوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو انکی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ سیاستدانوں کو بناتے بھی یہی لوگ ہیں اور ضرورت ختم ہو جانے کی صورت میں یا جب کوئی سیاستدان ان کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے مرواتے بھی یہی لوگ ہیں۔ بھٹو سے لے کر زرداری تک آج تک جتنے بھی سیاستدان اور جتنے بھی نام نہاد مذہبی رہنما آئے وہ سب انہی کی پیداوار ہیں، بھٹو نے سرکشی اختیار کی اور امریکی مفادات کے

خلاف بات کی تو ضیاالحق کے ذریعے اس کا عدالتی قتل کروادیا گیا۔

پاکستان سے پیپلز پارٹی کا اثر رسوخ ختم کرنے کے لیے پنجاب میں نواز شریف پر ہاتھ رکھا گیا، سندھ میں ایم کیو ایم اس وقت ابتدائی مراحل میں تھی تو اسے بھی پنپنے دیا گیا تا کہ سندھ کے شہری علاقوں میں پیپلز پارٹی کا زور توڑا جا سکے۔ضیاالحق کی موت کے بعد ایم کیو ایم پاکستان کی واحد جماعت تھی جس نے اپنی شرائط پر اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ معاملات طے کیے، جب اسٹیبلشمنٹ نے دیکھا کہ ایم کیو ایم اس کے قابو میں نہیں آ رہی تو ایم کیو ایم میں سے ہی کچھ لوگوں کے آپسی اختلافات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آفاق احمد پر ہاتھ رکھ دیا گیا اور یوں ایم کیو ایم حقیقی بنادی گئی۔

ایم کیو ایم نے طاقت پکڑی اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قتل و غارت گری شروع کر دی۔ جب یہ جماعت ہاتھ سے نکلنے لگی تو 1992 میں ایم کیو ایم کے خلاف ریاستی آپریشن شروع کر دیا گیا۔ایم کیو ایم تقریباً آٹھ سال تک اسٹیبلشمنٹ سے لڑتی رہی۔ بالا آخر اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ ٹراؤٹ مچھلی کی طرح پانی کے بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بہتری اس ہی میں ہے کہ باقی جماعتوں کی طرح فوج سے ہاتھ ملا لیا جائے، جب مشرف دور میں ایم کیو ایم نے فوج سے ہاتھ ملایا تو وہ محب وطن بھی ہوگئی اور غداری اور جناح پور جیسے لیبل بھی ہٹا دیئے گئے۔اسٹیبلشمنٹ کے زیر سایہ کچھ اور نام نہاد مذہبی جماعتیں بھی بنائی گئیں جن میں سپاہ صحابہ، سنی تحریک، اور آئی ایس او سرفہرست ہیں۔ان جماعتوں کو کراچی سمیت ملک بھر میں کھلی چھوٹ دے دی گئی۔کراچی میں جب ایم کیو ایم نے تھک ہار کر فوج سے ہاتھ ملا لیا تو اسکا پہلا مطالبہ ہی یہی تھا کہ کراچی سے حقیقی نام کی مصنوعی جماعت کو جڑ سے ختم کیا جائے۔اسٹیبلشمنٹ نے ایم کیو ایم کا یہ مطالبہ کسی حد تک تو مانا مگر مکمل طور پر نہیں کہ آج بھی فوج نے آفاق احمد کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے تا کہ ایم کیو ایم کو لگام رہے۔

سپاہ صحابہ اور آئی ایس او جیسی جماعتیں اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے ہی پھلی

پھولیں، تاہم جب یہ عناصر ریاستی قوتوں کے ہاتھ سے نکل کر طالبان اور القاعدہ سے وابستہ ہوئے تو انہیں کالعدم قرار دے دیا گیا۔ سنی تحریک کا بھی یہی حال ہے۔ جس وقت اس کا کردار ختم ہوگا تو اس یہ جماعت بھی کالعدم قرار پائے گی۔

جماعت اسلامی ان تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ عقلمند رہی اور اس نے ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کے افتتاحی بلے باز کا کردار ادا کیا۔ جب کسی کی حکومت گرانی ہوتی ہے تو جماعت اسلامی کو ٹاسک دے دیا جاتا ہے کے وہ بدامنی کا پرچار کرے اور دھرنے اور احتجاج کر کے لوگوں کو یہ باور کروائے کے اب حکومت کی تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔

یہ فوج اور اسٹیبلشمنٹ کا ہی کمال ہے کہ (ق) لیگ اور ایم ایم اے جیسی جماعتیں راتوں رات بنائی جاتی ہیں اور وہ راتوں رات اتنی زیادہ سیٹیں بھی جیت جاتی ہیں کہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں آجائیں، ایم ایم اے اسٹیبلشمنٹ نے اس لیے بنائی کہ امریکہ کو یہ باور کروایا جاسکے کے تم جو جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگائے رہتے ہو اگر پاکستان میں جمہوریت آ گئی تو پھر یہ مذہبی انتہاپسند لوگ برسر اقتدار آجائیں گے۔ ایم ایم اے نے پورے پانچ سال بیک وقت حکومت اور اپوزیشن کے مزے لوٹے اور پس پردہ پرویز مشرف کی ہر طرح سے حمایت کر کے اسٹیبلشمنٹ سے نمک حلالی کا ثبوت دیا، جن لوگوں نے ایم ایم اے بنوائی تھی کام نکل جانے کے بعد انہی لوگوں نے اسکے حصے بخرے بھی کر دیئے، یہ ہی وجہ ہے کے جماعت اسلامی نے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا تھا کیوں کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے بغیر پورے پاکستان سے چار سیٹیں بھی نہیں جیت سکتی۔

چونکہ اب عوام پیپلز پارٹی اور نواز شریف دونوں سے ہی نالاں ہو چکے ہیں تو ایسے میں اسٹیبلشمنٹ کو کوئی نیا چہرہ درکار تھا جو اسے عمران خان کی صورت میں مل گیا ہے۔ پاکستان کی نام نہاد جمہوریت کا یہ حال جس کے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں افسر شاہی، فوج اور یہ ایجنسیاں ہی ہوتی ہیں، یہ سیاستدان اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں وقت آنے پر

خود بھی پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے بھی جی بھر کے مزے کرواتے ہیں۔ رہ گئے عوام تو وہ ان سب کی ترجیحات میں نہ پہلے کبھی تھے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہونگے۔ یہی وجہ ہے کے یہ سب ہماری بربادی میں برابر کے شریک ہیں۔

ایک اور کردار پاکستان میں حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا ذمہ دار ہے جسے ہم امریکہ کی صورت میں جانتے ہیں۔ امریکہ نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے تمام سیاستدانوں، فوج اور ان نام نہاد مذہبی جماعتوں کو خرید رکھا ہے، عمومی طور پر امریکہ فوج سے ہی ڈیل کرتا ہے پھر فوج اور امریکہ مل کر طے کرتے ہیں کہ پاکستان میں حکومت کرنے کے لیے اب کس کی باری لگانی ہے۔

جہادی تنظیمیں بنانا اور پھر انہیں مٹانا، یہ سب خارجہ پالیسی کا حصہ ہوتا ہے کہ کس سے کس وقت کیا کام لینا ہے، کہاں امریکہ کو بلیک میل کرنا ہے کہاں بھارت کو منہ دینا ہے، کہاں سعودی عرب کو خوش رکھنا ہے۔

یہ اسٹیبلشمنٹ ہی ہے جو پہلے بناتی اور پھر کام نکل جانے کے بعد مختلف کرداروں کو اپنے ہاتھوں ختم بھی کر دیتی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ نقصان میں صرف عام عوام رہتے ہیں جو کبھی لسانیت کے نام پر دھوکہ کھاتے ہیں کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی جہاد کے نام پر بیوقوف بن جاتے ہیں۔ پاکستانی عوام سے بڑا بیوقوف شاید ہی کوئی اور ہو جو ہر بار ان سب کے جھانسوں میں آجاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بربادی کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ کب تک یونہی چلتا رہے۔ لیکن یہ طے ہے کے ایسا ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ خدا پاکستان کو ایک اور سقوط ڈھاکہ سے محفوظ رکھے۔

راحیل شریف اور پاکستان

جنرل راحیل شریف پاکستان آرمی کے ایسے چیف ہیں جن کے جانے کے بعد

ان کے کئی ایسے کارنامے یادگار بن جائیں گے جو پاکستان کی گزشتہ (اور غالباً آئندہ) سیاسی اور عسکری تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ قدرت نے ان کو ایک ایسے وقت میں پاکستان آرمی کی کمانڈ عطا کی جو انتہائی نازک اور مشکل تھا۔ تین سال کا عرصہ نہایت مختصر مدت ہے لیکن فطرت بعض ایسی شخصیات بھی پیدا کر دیتی ہے جن کا کردار تعمیر ملک و قوم کے لئے یادگار بن جاتا ہے۔ کسی فارسی شاعر کا شعر ہے کہ:

عاقبت منزلِ ما وادیء خاموشان است
حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

''اگر انسان کی آخری منزل موت ہے تو پھر زندگی خواہ چار دن کی ہو یا چار گھڑی کی، گنبدِ افلاک میں زلزلے ڈال دینے چاہئیں''

سماجی اور سیاسی زلزلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی زلزلہ نما اور زلزلہ انگیز اقدامات ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ قوم دہشت گردی اور خودکش حملوں سے عاجز آ چکی تھی، ملک کا شمال مغربی حصہ اور واحد بندرگاہ جو پاکستان کی تجارتی شاہ رگ بھی تھی اپنوں کی غداریوں اور بیگانوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب بظاہر ایک نا قابلِ تسخیر چیلنج بن چکے تھے۔

ایسے میں ضرب عضب لانچ کرنا کسی باہمت آرمی چیف کا کام ہی ہو سکتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ فاٹا کے ایسے بہت سے علاقے تھے جو خود آرمی کے اربابِ اختیار نے بھی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ان کے قرب و جوار میں کوئی چھاؤنی نہیں تھی، کوئی عسکری تنظیم صف بند نہیں تھی، کوئی ہوائی اڈہ یا ایئر سٹرپ موجود نہ تھی ور ایسے لاجسٹک مسائل تھے جن کے ہوتے ہوئے کوئی بڑا کلیئرنس آپریشن ممکن نہ تھا۔ اس لئے ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جب یہ آپریشن (ضربِ عضب) لانچ کیا گیا تو اس میں پاک آرمی کا کتنا جانی نقصان ہوا۔ بعض عاقبت نا اندیش یہ سوچتے ہیں کہ فوج ہوتی ہی اس کام کے لئے ہے کہ ملک کی بقاء کی خاطر جانوں کی قربانیاں دیتی رہے۔ یہ بات کہنا جتنا آسان ہے، کرنا اتنا ہی مشکل ہے اور پھر یہ چیلنج خارجی

نہیں، داخلی تھا۔ اس گھر کو گھر ہی کے چراغ نے آگ لگادی تھی، اس لئے اس کو بجھانا بیرونی دشمن سے نبرد آزما ہونے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل تھا اور جرات آزمائی مانگتا تھا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا ضربِ عضب کی سو فیصد تکمیل ہو چکی ہے تو اس کا جواب ہنوز نفی میں ہوگا۔ اب بھی وادیءشوال کے بعض علاقے جو اگرچہ رقبے کے لحاظ سے زیادہ بڑے اور وسیع وعریض نہیں لیکن دہشت گردوں سے ان کی کلیئرنس اب بھی جان کے نذرانے مانگتی ہے اور پاک فوج کے آفیسر اور جوان یہ نذرانے پیش کررہے ہیں۔ جو علاقے تخریب کاروں اور دہشت گردوں سے صاف ہو چکے ہیں ان میں مواصلاتی انفراسٹرکچر کھڑا کرنا اور ان کو مستقبل میں کسی ضربِ عضب دوم کی ضرورت سے بے نیاز کرنا، ایک اور بڑا چیلنج ہے۔ سویلین حکومت بھی ان منصوبوں کی تکمیل میں شریک کار ہے لیکن یہ کام ایسا ہے کہ اس میں فوج کی ضرورت ترجیحات میں شامل ہے۔

پاکستان کے شمالی اور شمال مغربی حصوں میں دہشت گردی کا چیلنج اتنا خوفناک اور اتنا بڑا تھا کہ اس کا تانا بانا پاکستان کے دوسرے پُرامن علاقوں تک بھی پھیل گیا تھا۔ دہشت گردوں نے جو اودھم فاٹا میں مچایا ہوا تھا، وہی ان پُرامن علاقوں میں بھی مچانے کا پروگرام بنایا جا چکا تھا۔ جنوبی پنجاب اور کراچی ان میں پیش پیش تھے۔ کراچی کا حال احوال سب کو معلوم ہے لیکن سندھ کے اندرونی علاقے اور جنوبی پنجاب کے وہ دور افتادہ مقامات جہاں آبادیاں کم تھیں، ریگستان تھے یا دریا کے کچے کے علاقے کہلاتے تھے، وہ یکا یک جاگ اٹھے۔ دتہ خیل اور شوال کی جگہ اب راجن پور اور کچے کے علاقوں نے لے لی۔ چنانچہ وہاں بھی اب ایک منی ضربِ عضب جاری کیا گیا۔

جنرل راحیل شریف کا دوسرا کارنامہ جس کے اثرات پاکستان کی آئندہ نسلوں تک محسوس کئے جائیں گے، وہ سی پیک (CPEC) کی تعمیر وتشکیل اور سیکیورٹی میں ان کی ذاتی دلچسپی ہے۔ جنرل راحیل شریف کا کہنا ہے کہ پاکستان میں جو دشمن انٹیلی جنس

ایجنسیاں ملک کو عدم استحکام کا شکار کرنے میں پیش پیش ہیں، ان میں بھارت کی ''را'' کا کردار سب سے زیادہ گھناؤنا ہے۔ سی پیک کو دنیا کی سبھی بڑی اقوام نے ایک ایسا پراجیکٹ تسلیم کیا ہے جو نہ صرف پاکستان اور چین بلکہ دنیا بھر کے کمرشل کینوس کو وسیع کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ متعدد مواقع پر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ خطے کے بعض ممالک سی پیک کا خوش آئند مستقبل دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو رہے ہیں اور ان میں بھارت نے تو تمام بین الاقوامی مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس پراجیکٹ کو سبوتاژ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔ لیکن آرمی چیف نے انتباہ کیا کہ سی پیک ہی نہیں، پاکستان کے کسی بھی حصے کو عدم استحکام کا شکار کرنے والی ہر کوشش ناکام بنادی جائے گی۔ ہر کسی کو محاذ آرائی کا راستہ چھوڑ کر باہمی تعاون کی راہ اپنانا ہوگی۔ اقتصادی راہداری کے اس پراجیکٹ سے نہ صرف بلوچستان بلکہ بحر ہند کے ساحلوں پر واقع تمام ممالک اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں سی پیک کی تعمیر و سیکیورٹی میں آرمی انجینئرز کی شراکت اور دو انفنٹری ڈویژنوں کی تشکیل، جنرل راحیل شریف کی ذاتی دلچسپی کے کھلے ثبوت ہیں۔

راحیل شریف کا تیسرا مثبت اور یادگار کارنامہ فوج کو سیاست میں ملوث نہ کرنے کے عزمِ صمیم کا نام ہے۔ تاحال ان کی جانب سے ایسا کوئی اشارہ دیکھنے کو نہیں ملا جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہ سیاست میں عملی کردار ادا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ طویل عرصہ کے بعد شاید پاکستان کو پہلا آرمی چیف میسر آیا ہے جو ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر قومی مفاد کو آگے بڑھا رہا ہے۔ تاہم اگر انہوں نے سیاست میں فعال کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کے تمام سابقہ کارناموں پر پانی پھر سکتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ گزشتہ دو اڑھائی برس میں یکے بعد دیگرے کئی مواقع ایسے آئے جب کئی لوگوں نے امپائر کی انگلی اٹھنے کا اشارہ دیا، کئی بار ملک کی آبادی کی اکثریت سیاستدانوں سے بددل ہوئی، ان کے خلاف سکینڈل سامنے آئے (اور آرہے ہیں) لیکن

پاک آرمی یہ سارے تماشے دیکھ کر بھی وہ کچھ نہیں کر رہی جس کی توقع بعض لوگ لگا کر بیٹھے ہوئے تھے (اور بیٹھے ہیں)

اگر تاریخ کی کیسٹ کو ریورس کر کے دیکھیں اور سنیں تو جاری حالات میں فوج کا دخل درمعقولات نہ دینے کا فیصلہ بڑا عجیب وغریب سا لگتا ہے۔ بعض ناسمجھ طرح طرح کی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ کوئی یہاں تک کہہ رہا ہے کہ فوجی اور سویلین قیادت اندر سے ایک ہے۔ سب اندر سے ملے ہوئے ہیں۔ وگرنہ ابھی تک کوئی نہ کوئی ''فیصلہ'' ہو گیا ہوتا۔ کوئی یہ دلیل لاتا ہے کہ مارشل لاء لگنے کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ یہ میڈیائی دور ہے۔ اس میں مارشل لاء جیسی ''فضولیات'' کا کوئی چانس نہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ میڈیا کے ایک ڈیڑھ عشرہ کے مختصر سے دور کو قبل از مشرف دور میں لے جانا، فوج کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن پاک فوج اس قسم کی مہم جوئی کا فاضل اور فضول بوجھ اٹھانے کو تیار دکھائی نہیں دیتی۔ عوام کو یہ اندازہ نہیں کہ فوج کی جواں سال آفیسرز کلاس کے صبر کا پیمانہ بعض اوقات اتنا لبالب ہو جاتا ہے کہ چھلکنے کے لئے ذرا سی جنبش درکار ہوتی ہے۔ لیکن عین وقت پر ساقی اپنی صراحی مضبوطی سے زمین پر ٹکا دیتا ہے، مے خانہ بڑھا دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ سارے جام و سبو زمین پر انڈیل دیئے جائیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی آرمی چیف نے ایک سال قبل ہی یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی مدتِ ملازمت میں کسی توسیع کا طالب نہیں اور تین سال پورے ہونے کے بعد ''حسبِ قاعدہ'' ریٹائر ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے دور میں جو معیار صداقت و دیانت و امانت قائم کئے ہیں آنے والا جانشین ان کی لازماً پیروی پر مجبور ہوگا۔ وہ اگر نہ بھی چاہے گا تو نہ صرف پاکستانی عوام اور میڈیا بلکہ فوج کے چھوٹے بڑے قیادتی طبقات بھی اسے ٹریک سے ہٹنے نہیں دیں گے۔

جنرل راحیل شریف دوٹوک فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ آپریشن ضرب عضب کا فیصلہ ہو یا پھر کراچی آپریشن پر عملدرآمد، ان کا ہر فیصلہ دوٹوک ہوتا ہے۔ جنرل

راحیل شریف نے کچھ ہی عرصہ قبل ایک تازہ اور دوٹوک فیصلہ کراچی کے امن کیلیے کیا تھا جس کے اثرات واضح ہو کر سامنے آچکے ہیں۔

راحیل شریف نے اس کارروائی کے آغاز سے قبل کہا تھا کہ کراچی کو دہشت گردوں سے پاک کرنے، پرامن رکھنے اور خوف سے پاک معمولات زندگی کے لیے کسی بھی حد تک جائیں گے۔ آرمی چیف نے حکم دیا کہ کراچی میں سیاسی ولسانی دہشت گردوں کے نیٹ ورکس کو تباہ کرتے ہوئے ان کے ٹھکانوں اور رابطوں کو ختم کیا جائے۔

کراچی میں ایک طرف تو دہشت گرد ہیں تو دوسری طرف وہ جرائم پیشہ عناصر نظر آئیں گے جو سٹریٹ کرائم، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، بنک ڈکیتی، کار چوری اور دوسرے جرائم میں ملوث ہیں جنہیں ایم کیوایم سمیت دیگر جماعتوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان تمام جرائم پیشہ عناصر کو ختم کرنے کیلیے رینجرز کو کراچی آپریشن کے نام سے ایک ٹارگٹڈ آپریشن دیا گیا ہے۔ رینجرز کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق 2015ء میں 2410 آپریشن کیے گئے ان آپریشنز کے دوران 69 رینجرز مقابلے ہوئے، ان مقابلوں میں 152 انتہائی خطرناک دہشت گرد مارے گئے۔ جبکہ ان آپریشنز کے دوران 12 رینجرز اہلکاروں نے جام شہادت نوش کیا اور 20 زخمی ہوئے۔ 4074 مشتبہ افراد کو حراست میں لیا گیا۔ ملزموں سے مختلف اقسام کے ہزاروں ہتھیار برآمد کیے گئے جن میں بھاری اسلحہ بھی شامل ہے جس سے ان عناصر کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

کراچی کے عوام تین دہائیوں سے ایم کیوایم جیسی جماعت کی بربریت کے نشانے پر تھے۔ تاہم جنرل راحیل شریف کے مدبرانہ فیصلے کی بدولت اس جماعت کی دہشت گردانہ کارروائیاں دم توڑ چکی ہیں۔ اگر آج آپ کراچی کے ایک عام شہری سے بات کرینگے تو وہ یہ ہی کہے گا کہ حالات پہلے سے بہتر ہیں اور کراچی تیزی سے دوبارہ پرامن اور روشنیوں کا شہر بن رہا ہے۔

میرے نزدیک جنرل راحیل شریف کا یہ کارنامہ ایک ایسا یادگار کارنامہ ہے جو کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ جنرل راحیل کے پیشرو ''سب سے پہلے پاکستان'' کا صرف نعرہ لگاتے رہے۔ ان کے دورِ قیادت کا موازنہ اگر موجودہ آرمی چیف کے دور سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگانا سب سے زیادہ آسان تھا اور اس پر عمل کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا اور مشکل ہے! عسکری قیادت کی دیکھا دیکھی اگر سویلین قیادت بھی جنرل راحیل کی سوچ پر گامزن ہو جائے تو کیا عجب پاکستان کی تقدیر بدل جائے اور ہمیں اچھے مستقبل کا کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

شہباز شریف

پاکستان کے موجودہ حکمرانوں میں وزیر اعلیٰ شہباز شریف ملکی ترقی کے حوالے سے اپنی منفرد سوچ کے باعث نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پایاں صلاحیتوں سے مالا مال کر رکھا ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ بلاشبہ دیگر سیاست دانوں کی طرح مخالفین انہیں بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں لیکن عوامی فلاح و بہبود کے لیے ان جیسے کام بھی کوئی کر کے نہیں دکھاتا۔ شہباز شریف پنجاب میں تعمیر و ترقی کے حوالے سے بہت تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ان کے انقلابی اقدامات کے باعث صوبہ ترقی کی جانب گامزن ہے۔

پسماندہ علاقوں میں دانش سکولوں کا قیام، شہریوں کو پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے جا بجا فلٹریشن پلانٹس کی تنصیب، ٹرانسپورٹ کی بہتر اور جدید سہولیات کی فراہمی، چائلڈ لیبر کا خاتمہ، غریبوں کے لیے مفت تعلیم کی فراہمی، آشیانہ ہاؤسنگ سکیم اور تقریبات میں ون ڈش ان کے بہت سے انقلابی اقدامات کی مثال ہیں۔ پنجاب میں بیروزگاری ایک اہم مسئلہ ہے جس کے حل کے لیے شہباز شریف کی ذاتی کاوشوں سے نوجوانوں کو فنی تعلیم کی فراہمی کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن اینڈ ووکیشنل ٹریننگ اتھارٹی (ٹیوٹا)

کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس سے نوجوانوں کی بڑی تعداد کے لیے روزگار کے مواقع کھل گئے ہیں۔ یہ ادارہ سالانہ دو لاکھ سے زیادہ نوجوانوں کو فنی تعلیم دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو اندرون اور بیرون ملک روزگار کی فراہمی کے لیے جدید ڈویلپمنٹ بیورو بھی قائم کیا گیا ہے۔

مہذب معاشروں میں مواصلات کا جدید نظام ریاست کی بنیادی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی کامیابی کمیونیکیشن کے جدید اور سستے نظام کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ کا جدید نظام بھی شہباز شریف کا ایسا کارنامہ ہے جس سے صوبے کے کروڑوں عوام کی زندگی میں بے پناہ آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک سالانہ اربوں روپے غریب عوام کی ٹرانسپورٹ پر سبسڈی کی صورت میں خرچ کرتے ہیں۔ ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے پاکستان کو بھی سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کے اچھے نظام کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت میٹرو بس سروس اور اورنج ٹرین جیسے منصوبوں کے ذریعے پوری ہو رہی ہے۔ میٹرو کی تکمیل کے بعد اورنج لائن ٹرین منصوبہ شہباز شریف کے غریب عوام کو سفر کی جدید، سستی، محفوظ اور آرام دہ سہولت کی فراہمی کے عزم کا اظہار ہے۔

لاہور میں جدید طرز کی میٹرو بس سروس کا اجرا شہباز شریف کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ اس منصوبے کے ذریعے شہریوں کو جدید ٹرانسپورٹ کی سہولت فراہم کر کے لاہور کو بھی استنبول سے مشابہت دے دی گئی ہے۔ لاہور میں یہ منصوبہ جات اس امر کی منہ بولتی تصویر ہیں کہ شہباز شریف نے عوام کو جدید ٹرانسپورٹ فراہم کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ انتہائی مختصر عرصے اور سخت مخالفت کے باوجود پایہ تکمیل تک پہنچا۔ میٹرو بس کا منصوبہ ہمارے برادر اسلامی ملک ترکی کے اشتراک اور تعاون سے پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ ملتان مس میٹرو بس منصوبے کا آغاز امر کا ثبوت ہے کہ شہباز شریف کی ترجیحات صرف لاہور نہیں بلکہ پورا پنجاب ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں میڈیکل کالج اور یونیورسٹی جیسے منصوبے اس کا بین

ثبوت ہیں۔صوبے کے دیگر شہروں میں بھی ترقیاتی کام تیزی سے جاری ہیں۔

اس کے علاوہ پنجاب حکومت اور چینی و ترک کمپنیوں کے مابین ٹرانسپورٹ، انفراسٹرکچر، توانائی، ہاؤسنگ، کان کنی، صنعت، مینوفیکچرنگ اور دیگر شعبوں میں 150 معاہدوں پر کام جاری ہے جو یقینی طور پر غیر ملکی سرمایہ کاروں کا پنجاب اور خصوصاً وزیراعلیٰ شہباز شریف پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہے۔پاکستان اور قطر کے مابین حال ہی میں طے پانے والا ایل این جی کی درآمد کا معاہدہ بھی توانائی کے شعبے میں پاکستان خصوصاً پنجاب کی قسمت بدل سکتا ہے۔

اس معاہدے کے نتیجے میں ملک کے صنعتی، زرعی، کاروباری اور گھریلو صارفین کے لیے گیس سے پیدا ہونے والی بجلی کی پیداوار میں قریباً دو ہزار میگاواٹ اضافہ متوقع ہے۔اس معاہدے پر عملدرآمد سے توانائی منصوبوں، صنعتوں اور گھریلو صارفین کے لیے ارزاں ترین گیس کی بلاتعطل فراہمی ممکن ہو سکے گی جس سے ایک طرف عام لوگوں پر گیس کے بھاری بلوں کا بوجھ کم ہوگا تو دوسری طرف لوڈشیڈنگ میں بھی کمی آئے گی۔

شہباز شریف کے ویژن کے تحت پنجاب میں تعلیم سب کے لیے اور چائلڈ لیبر کے خاتمے کیلیے غریب بھٹہ مزدوروں کے بچوں کو مفت تعلیم کی فراہمی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں پنجاب حکومت کے پہلے مرحلہ میں بھٹہ مزدوروں کے بچوں کی سکولوں میں داخلہ مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

پنجاب حکومت نے تعلیم، صحت اور دیگر سماجی شعبوں کی بہتری کیلئے انقلابی اصلاحات کی ہیں جس کے دوررس نتائج سامنے آرہے ہیں اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کیلئے شرح ترقی میں اضافے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے نیز حکومت شہری و دیہی علاقوں کی متوازن ترقی کی پالیسی پر گامزن ہے اور پسماندہ علاقوں کی ترقی پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔جنوبی پنجاب کے اضلاع کیلئے آبادی کے تناسب سے زیادہ وسائل مختص کیے گئے ہیں

جبکہ محکموں کی کارکردگی بہتر بنانے کیلئے انفارمیشن ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ پنجاب اور ورلڈ بینک کے درمیان مختلف شعبوں میں مثبت اشتراک کار جاری ہے جس کے بہترین نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ ورلڈ بینک پنجاب کے تعلیم، صحت، سکل ڈویلپمنٹ اور توانائی کے منصوبوں میں بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ پنجاب میں ورلڈ بینک کے تعاون سے لینڈ ریکارڈ مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم کے منصوبے پر کام کیا گیا ہے۔ مفاد عامہ کا یہ انقلابی منصوبہ صوبے میں شفافیت اور کرپشن فری کلچر کی جانب اہم اقدام ہے۔

پنجاب کے عوام کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں شہباز شریف جیسا انتھک، محنتی، متحرک اور عوام کے لیے درددل رکھنے والا وزیراعلیٰ ملا ہے۔ امید ہے کہ ان کی قیادت میں صوبہ ترقی کی راہ پر مزید تیزی سے آگے بڑھے گا۔

آگے کیسے بڑھنا ہے؟

روزِ اول سے ہی میری یہ خواہش ہے کہ پاکستان دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی قطار میں شامل ہو جائے، ایسا کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے جہالت کو ختم کرنا ہوگا۔ ہر شہری کے لئے بامقصد تعلیم کا حاصل کرنا لازمی ہوگا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر لاکھوں سکول کھولنے ہوں گے۔ اس کے بعد قانون سازی کی بدولت قوم کے بچوں کو 100 فیصد درس گاہوں میں داخل کرنا ہوگا۔ دفاع کے بعد تعلیم کو اولیت مل جائے گی۔ قومی بجٹ کا کم از کم 7 فیصد تعلیم کی مد پر خرچ ہوگا۔ اساتذہ کو زندگی میں اعلیٰ مقام دیا جائے گا۔

تمام شہریوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ اساتذہ کا دل کی گہرائی سے احترام کریں گے۔ اُن کی تنخواہوں اور دیگر مراعات میں معقول اضافہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں تمام اساتذہ کو ''وی آئی پی'' کا مقام عطا کیا جائے گا۔ ایسا کرنے سے ہی قوم کے بہترین دماغ محکمہ تعلیم میں شامل ہونے پر فخر محسوس کریں گے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ہماری قوم ترقی کی منزل کی طرف چل پڑے گی۔ اس قسم کے کام ہمیں کم از کم پانچ سال میں مکمل کرنا ہوں گے اور اسی صورت ہم اپنی منزل حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم پہلے ہی اپنا انتہائی قیمتی وقت ضائع کر چکے ہیں۔ ہمارا مزید وقت ضائع کرنا خودکشی کے برابر ہوگا۔

چین، کوریا، سنگاپور، ترکی اور ملائیشیا کی شاندار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تمام تر مشکلات کے باوجود ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کو وسیع پیمانے پر حاصل کرنا ہوگا۔ ان جدید علوم کو حاصل کئے بغیر ہم کبھی بھی کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکیں گے

اور ہمیشہ کے لیے تاریکی میں پڑے رہیں گے۔ایک دوسرے کا قتل عام کرتے رہیں گے۔ اپنے ملک اور قوم کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتے چلے جائیں گے۔آخر کار ہماری آزادی کو بھی بے شمار خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ یہ کام ہمیں قومی تحریک کی شکل میں مکمل کرنا پڑے گا۔

1947ء میں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔انتہائی قلیل تعداد میں سکول اور کالج تھے۔صرف ایک پنجاب یونیورسٹی تھی۔آج پاکستان میں تعلیمی اداروں کا جال بچھ چکا ہے، اس کے باوجود ابھی تعلیم کے میدان میں بہت کام کرنا باقی ہے۔ ہمارے گاؤں تعلیمی سہولتوں سے محروم ہیں۔آئندہ پانچ برسوں میں ہمیں تعلیم کے میدان میں 100 فیصد ہدف حاصل کرنا ہوگا۔آج کے معاشرے میں بامقصد تعلیم اسی طرح ضروری ہے، جس طرح انسان کے لئے ہوا، پانی ،لباس اور خوراک وغیرہ ضروری ہوتے ہیں۔

آج ہم ایک دوسرے کے قتل عام میں مصروف ہیں۔کیا ہمارے لیے قتل و غارت کا کام کرنا ہی باقی رہ گیا ہے؟ ہم سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔سرزمین پاکستان ہم سب کی مشترکہ جائیداد ہے۔اس جائیداد کی حفاظت کرنا ہم سب کا مقدس فرض ہے۔ ہر پاکستانی کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اچھی سے اچھی زندگی بسر کرے۔اس کی زندگی، جان، مال،عزت کی حفاظت کرنا حکومت کا سب سے بڑا فرض ہوتا ہے۔حقِ زندگی ہر شہری کو دینا ہی پڑے گا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ امیر امیر تر اور غریب،غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔غربت اور جہالت ہی ہمارے سب سے بڑے مسائل ہیں۔ان مسائل کو حل کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا اور ضرورت ہے۔ہمیں اپنے قومی مفاد کو سامنے رکھنا ہوگا۔دنیا کے کسی اور ملک کو قطعی طور پر ہمارے اندرونی کاموں میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔ہمیں بیرونی دباؤ کو مسترد کرنا پڑے گا۔ ہم دنیا کی ایک آزاد قوم ہیں۔ہمیں آزاد قوموں کی مانند اپنے مسائل کو حل کرنا ہوگا۔ہمیں اپنے اندر اتحاد و اتفاق کا شاندار مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ جب ہم سب ایک ہو جائیں گے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت ہمارے اندرونی

معاملات میں مداخلت کی جرات نہیں کر سکے گی۔

تعمیر و ترقی کے راستے پر ہمیں اپنے ترقی یافتہ دوست ممالک کے ساتھ اپنے روابط مزید مضبوطی سے استوار کرنا ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے تجربات سے سیکھنا بھی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس ضمن میں یہاں میں چند ایسے ممالک اور شخصیات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم ملک وقوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین

پاکستان اور چین کے درمیان باقاعدہ تعلقات کا آغاز 1950ء میں ہوا۔ پاکستان اسلامی دنیا کا پہلا اور غیر کمیونسٹ ممالک میں تیسرا ملک تھا جس نے 1950ء کے تائیوان چین تنازعے کے فوراً بعد چین کو آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کیا۔ تاہم دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات 31 مئی 1951ء کو قائم ہوئے۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں نمایاں گرم جوشی 1962ء کی چین بھارت سرحدی جنگ کے بعد پیدا ہوئی۔ بھارت کو اپنا روایتی دشمن سمجھنے والی پاکستانی قیادت نے چین سے تعلقات بڑھاتے ہوئے اسے خطے میں ایک متبادل طاقت کے طور پر اُبھرنے میں مدد فراہم کی تاکہ بھارتی اثر ورسوخ کا راستہ روکا جا سکے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھی چین نے پاکستان کو خاصی مدد فراہم کی جس کے بعد دونوں ممالک کے درمیان فوجی اور اقتصادی رابطوں میں مزید شدت آئی جبکہ 1966ء میں فوجی تعاون کا آغاز ہوا۔ چین پاکستان کو دفاعی پیداوار میں اپنے پاؤں پر کھڑا کر رہا ہے۔ چین سے ملنے والا اسلحہ سستا ہوتا ہے جو مغرب سے نہیں ملتا۔ اگر کوئی چیز نہیں ملتی تو دونوں (پاکستان اور چین) مشترکہ طور پر تیار کرتے ہیں۔

بھارت کے خلاف دونوں جنگوں میں چین نے ہمارے بڑے بھائی کا قابل ستائش کردار ادا کیا۔ پاکستان نے بھی ہمیشہ چین کی خیر سگالی کا مثبت جواب دیا ہے۔

پاکستان نے چین اور امریکہ کے مابین سفارتی تعلقات قائم کرنے اور اقوام متحدہ میں اس کی رکنیت بحالی کرنے کے لیے بھرپور سفارت کاری کی۔ 1970ء میں پاکستان کی انتھک کوششوں سے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے خفیہ دورہ بیجنگ کے انتظامات ممکن ہوئے۔ اس طرح چین اور مغربی دنیا کے درمیان براہِ راست رابطے ممکن ہو سکے اور پاکستان ہی کی بدولت 1972ء میں امریکی صدر رچرڈ نکسن نے چین کا سرکاری دورہ کیا۔

1978ء میں چین اور پاکستان کے درمیان واحد زمینی راستے قراقرم ہائی وے کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ 1984ء میں پاکستان اور چین کے درمیان جوہری توانائی کے میدان میں تعاون کے سمجھوتے پر دستخط کیے گئے۔ دونوں ممالک کے درمیان فوجی تعاون کے اہم منصوبوں میں 2001ء میں الخالد ٹینک، 2007ء میں لڑاکا طیارے ''جے ایف۔ 17 تھنڈر''، 2008ء میں ایف۔ 22 پی فریگیٹ اور کے 8۔ پی قراقرم جدید تربیتی طیاروں کی تیاری اور دفاعی میزائل پروگرام میں قریبی اشتراک شامل ہے۔ دونوں ممالک کی افواج کئی مشترکہ فوجی مشقیں بھی کر چکی ہیں۔

چینی صدر شی چن پنگ نے 2015ء میں اپنے دو روزہ دورہ پاکستان کے دوران پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا۔ اس دورے میں دونوں ممالک کے مابین 46 ارب ڈالر مالیت کے توانائی اور انفراسٹرکچر کے منصوبوں پر مشتمل معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ ان منصوبوں میں خنجراب کی سرحد سے لے کر گوادر تک سڑکوں اور ریل روٹ کی تعمیر کے علاوہ بجلی پیدا کرنے کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ 10400 میگا واٹ بجلی، 832 کلومیٹر شاہراؤں کی تعمیر، 1736 کلومیٹر ریلوے لائن کی تعمیر اور گوادر کی بندرگاہ پر متعدد ترقیاتی اور تعمیراتی منصوبے بھی اس تعاون کا حصہ ہیں۔ یہ معاہدے درحقیقت دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو مستحکم بنانے اور دونوں ملکوں کے عوام کی ترقی و خوشحالی کے راستہ کو مزید ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوں گے اور ان کے نتیجے میں آنے والے ماہ و

سال میں پاکستان کی تقدیر بدل جائے گی۔

پاکستان اور چین ایک دوسرے کے بڑے اتحادی ہیں۔ یہ اتحاد دفاعی پہلوؤں سمیت اقتصادی پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ پاکستان اور چین کے درمیان سیاسی بندھن اٹوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان کاروباری تعلقات ہمیشہ نمو پذیر رہے ہیں۔ چینی صدر شی چن پنگ کے دورہ کا ایک مقصد دوطرفہ اسٹریٹجک تعلقات کو ہمیشہ قائم رکھنا بھی ہے۔ چینی صدر کے اس دورے میں وزیر اعلیٰ شہباز شریف کا بھی اہم ہاتھ ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد شہباز شریف کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کار اپنا سرمایہ یہاں لگائیں۔ آج پاکستان چین سے سرمایہ کاری حاصل کرنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے۔ دونوں کے مابین 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کے معاہدے طے پا گئے ہیں اور آئندہ پانچ سال میں چین صرف توانائی کے منصوبوں میں 32 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا۔ آج کی دنیا میں چین تیزی سے بڑی طاقت کے طور پر ابھرا ہے اور آنے والے وقت میں ممکنہ طور پر یہ امریکا کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے چین جیسا ہمسایہ میسر آیا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ چین کی اقتصادی اور فوجی اعانت سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی کے عمل کا بھی بغور مشاہدہ کریں اور پاکستان میں بھی انہی روایات اور طریقہ ہائے کار کو فروغ دیں جن کی بدولت آج چین دنیا کی بڑی طاقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

مہاتیر کا ملائشیا

آج ملائشیا اسلامی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں کسی بھی ترقی یافتہ مغربی ملک کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تاہم چند دہائیاں پہلے ملائشیا ایسا نہیں تھا۔ اس ملک کی ترقی میں جہاں اس کے عوام کی انتھک محنت کا عمل دخل ہے وہیں

اس کا کریڈٹ ملائشیا کے عظیم رہنما مہاتیر محمد کو بھی جاتا ہے جنہوں نے مختصر وقت میں اپنی قوم کو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے قابل بنا دیا۔

رہنما یا لیڈر کسی بھی ملک کا وہ اثاثہ ہوتے ہیں جن پر اُس ریاست یا ملک کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ تاریخ حتمی طور پر ہمیں سمجھاتی ہے کہ کسی بھی قوم کا رہنما مختلف طریقوں سے اُس کا نصیب بنتا ہے۔ کبھی حالات ایک انسان کو خود بخود بلندی پر لے جاتے ہیں اور کبھی ایک شخص حالات کو اس طرح تراشتا ہے کہ وہ کسی قوم کی رہنمائی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں اُس ریاست کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھتا ہے۔ دنیا میں بالعموم اور اسلامی ممالک میں بالخصوص یہ واقعہ بہت ہی کم پیش آتا ہے۔ یقین فرمایئے عرصے دراز سے اتنا اندھیرا ہے کہ اب روشنی سے ڈر لگتا ہے۔ سامنے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ہمارے حالات بہت زیادہ دگرگوں اور پیچیدہ ہیں۔ ہم بحیثیت قوم بلندی سے گر کر ایسی پاتال میں گر چکے ہیں جسکی کوئی تہہ نہیں اور دوسرا ہمیں اپنے نقصان کا بھی صحیح اندازہ نہیں۔ کیا کریں اور کیا شکوہ کریں؟

ملائشیا اس حوالے سے خوش قسمت ملک ہے کہ اسے مہاتیر محمد جیسا رہنما نصیب ہوا جس نے اپنی قوم کو وہ مقام دلایا جس کی بہت سے ملک صرف خواہش ہی کر سکتے ہیں۔ مہاتیر محمد 1925 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک سکول میں استاد تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سنگاپور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ اپنے قصبے میں واپس چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں کامیابی کی بلندیوں کو چھولیا۔ وہ اپنی نسل میں پہلے ڈاکٹر تھے۔ اپنے ملک کے خراب حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سیاست میں بھی متحرک کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مہاتیر محمد سیاسی میدان میں آ کر اپنے ملک کو ان پالیسیوں سے نجات دلانا چاہتے تھے جنہوں نے ملائشین قوم کو ترقی کی راہ پر آنے سے روک رکھا تھا۔

1964ء میں مہاتیر محمد نے الیکشن لڑا اور پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کر لی۔ مہاتیر اپنی قوم کے حق میں بھرپور آواز اٹھاتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی قوم تعلیم اور کاروباری طور پر چینی نژاد لوگوں سے بہت پیچھے ہے اور کسی صورت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ لوگوں کو بتا رہے تھے کہ یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں اور ان میں فساد ہوگا۔ جلد ہی سنگاپور کو ملائشیا سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس وقت کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمان مہاتیر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ 1969ء کے الیکشن میں نہ صرف وہ ہار گئے بلکہ انہیں پارٹی سے بھی نکال دیا گیا۔

1969ء میں چینی نژاد لوگوں اور ملایا قوم میں زبردست خونریزی ہوئی اور ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ڈاکٹر مہاتیر صحیح وقت پر لوگوں کو آنے والے خطرے کے متعلق آگاہ کر رہے تھے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی پہلی کتاب لکھی جو ''ملایا قوم کا المیہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ آگے بڑھنے کے لیے قوم کو شدید محنت کرنی چاہیے۔ مہاتیر محمد نے اس کتاب میں وزیر اعظم پر شدید تنقید کی جس کے نتیجے میں کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔ تاہم مہاتیر کے خیالات نے انہیں ملک بھر میں مقبولیت دلا دی۔

اب مہاتیر محمد کے سامنے سیاست کی دنیا کا وسیع میدان تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر الیکشن میں کامیابی حاصل کی جس کے بعد انہیں وزیر تعلیم بنایا گیا۔ انہوں نے درسگاہوں کو ہر طرح کی سیاست سے پاک کر دیا اور ان طلباء کو وظائف دینا شروع کیے جو سیاست سے دور رہتے تھے۔ 1981ء میں مہاتیر ملائیشیا کے وزیر اعظم بن گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف 56 سال تھی مگر یہ ان کے کیریئر کے مشکل ترین دور کی ابتداء تھی۔

ملائیشیا میں ملک کا سربراہ چند سلاطین میں سے ایک ہوتا تھا۔ ان سلاطین کے اختیارات بے پناہ تھے، جیسا کہ وہ ملک میں ایمرجنسی لگا سکتے تھے، کسی بھی قانون کو رد کر سکتے تھے اور وہ قانون کی گرفت سے بالاتر تھے۔ مہاتیر نے ان کے اختیارات اور طاقت کو بتدریج کم کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس پر رضامند نہیں تھے۔ مہاتیر نے سب سے پہلے ان

سے پارلیمنٹ کے کسی بھی پاس شدہ قانون کو رد کرنے کا اختیار واپس لے لیا۔ سلطان وقت نے اس پر بھر پور ردعمل کا اظہار کیا۔ مہاتیر وزیر اعظم کے طور پر یہ معاملہ سڑکوں پر لے آئے۔ ہنگامے، جلسے اور جلوس تقریباً پانچ ماہ جاری رہے اور آخر میں سلطان کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ملائیشیا میں ایسی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی۔

مہاتیر نے ملایا قوم کے لیے تعلیم اور کاروبار کے دروازے کھول دیے اور تمام نوجوانوں کو یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے ترجیح دینے کا قانون بنادیا۔ وہ جانتے تھے کہ ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک اقتصادی طور پر ترقی نہ کرے۔ چنانچہ سرکاری اداروں کی نج کاری کا عمل انتہائی برق رفتاری سے طے کیا گیا۔ سال میں 50 کے لگ بھگ سرکاری ادارے نجی شعبہ میں جانے لگے۔ اس میں ہوائی کمپنیاں، ٹیلی کمیونیکیشن کے ادارے اور سروسز سیکٹر پیش پیش تھے۔ مٹسوبیشی کمپنی کے ساتھ حکومتی شراکت داری سے کاروں کا ایک بہت بڑا کارخانہ لگایا گیا۔ یہاں تیار ہونے والی ''پروٹون'' کار پورے ملک میں سب سے زیادہ بکنے والی کار بن گئی۔

اسلامی انتہا پسندی ملائیشیا کے چند حصوں میں بہت مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ مہاتیر نے تعلیمی درسگاہوں کے ذریعے اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ تمام اسلامی سیاسی جماعتوں کو الیکشن میں بھر پور شکست دی گئی۔ جن لوگوں نے حکومت کو بلیک میل کرنے کی تھوڑی سی بھی کوشش کی، مہاتیر نے ان کو مکمل طاقت سے کچل کر رکھ دیا۔

1990ء میں مہاتیر نے اپنا اقتصادی پروگرام ''وژن'' پیش کیا۔ انہوں نے قوم سے وعدہ کیا کہ 2020ء تک وہ ملائیشیا کو مکمل ترقی یافتہ ملک بنا دیں گے۔ یہ وعدہ انہوں نے بہت پہلے پورا کر دیا۔ نوے اور اس کے بعد کی دہائی میں ملائشیا میں ترقی کی شرح 7% اور 9% کے درمیان رہی۔ غریب کو اتنی سہولتیں دی گئیں کہ ملک میں غربت تقریباً ختم ہو گئی۔ مہاتیر نے ایک سوپر کوریڈور بنایا جو کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ایک نیا مسکن تھا۔

1997ء میں ملائیشیا بدترین اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا۔ سٹاک مارکیٹ 75% تک گر گئی۔ رنگٹ بے قدری کا شکار ہو گیا۔ مگر اقتصادی بحالی کے لے مہاتیر نے آئی ایم ایف کے نسخے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مہاتیر نے حکومتی ترقیاتی پروگرام جاری رکھا اور اپنے رنگٹ کی قدر میں اضافہ کیا۔ ملائیشیا آئی ایم ایف کی کسی شرط کو مانے بغیر اقتصادی بحران سے باہر نکل آیا۔ بیرونی دنیا سے مہاتیر نے بہت عزت اور برابری کی سطح پر تعلقات قائم کیے۔ اپنے ملک کو ترقی کی منزل کی طرف گامزن کر کے مہاتیر نے نوے کی دہائی کے آخر میں ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ مہاتیر کی داستان سے ثابت ہوتا ہے کہ لیڈر قوم کو بہت آگے پہنچا سکتا ہے۔

آج ہمیں بھی مہاتیر محمد جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ملائشیا ہمارے سامنے ایک ایسی مثال ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم بھی اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں۔ تاہم اس مقصد کے لیے عوام کا خواندہ اور باشعور ہونا لازمی ہے۔ مہاتیر محمد اس حقیقت کو بہت جلد سمجھ گئے تھے۔ نجانے ہمارے حکمران اسے کب سمجھیں گے۔

اردوآن کا ترکی

ترکی مسلم دنیا کا وہ ملک ہے جس کی حدود بیک وقت یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ترکی کی آبادی تقریباً ساڑھے سات کروڑ ہے۔ ترکی میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی 2002 سے اب تک برسرِ اقتدار ہے۔ طیب اردوآن ترکی کے موجودہ صدر ہیں اور اس سے پہلے وہ ملک کے وزیرِاعظم بھی رہ چکے ہیں۔

اردوآن کی سیاسی جماعت ''جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی'' کو مغربی قوتوں اور ان کے ہم نوا عناصر کی طرف سے اسلامسٹ یعنی اسلام پسند کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ترکی میں 'اسلامسٹ' پارٹی کا برسرِاقتدار آنا خطرناک امر ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ اور مغربی قوتیں اس حکومت سے ناخوش ہیں حالانکہ ترکی نیٹو کا رکن بھی ہے۔ اس کی وجوہات

بالکل واضح ہیں کہ ترک حکومت پوری دنیا میں امت مسلمہ کے مسائل پر جرات مندانہ موقف اختیار کرتی اور ظلم کیخلاف کھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ غزہ کی حمایت میں جانے والا فلوٹیلا اور اس کے نتیجے میں اسرائیل کی غنڈا گردی سبھی کو یاد ہے۔ اہلِ غزہ اپنے ترک بھائیوں کے اس جرات مندانہ اقدام اور قربانیوں پر آج بھی ان کی تحسین کرتے ہیں۔

مارچ 2003ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو ترکی سے اپنی فوج کی نقل و حرکت کیلئے زمینی راستہ مانگا جس سے ترک حکومت نے انکار کر دیا۔ امریکہ نے 10 ارب ڈالر امداد کی بھی پیشکش کی جو مصلحت پسندوں کے نزدیک اس زمانے میں ترکی کی بیمار معیشت کیلئے نسخہ شفا تھا۔ تاہم جسٹس پارٹی کی غیرت مند قیادت نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ امریکہ نے ہوائی راستہ مانگا تو حکومت نے اس سے بھی معذرت کر دی۔ کوئی مسلمان ملک آج کے دور میں ایسی جرات مندانہ مثال قائم نہیں کر سکتا۔

جسٹس پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اس صدی کے آغاز میں ترک کرنسی (لیرا) بالکل بے وقعت ہو گئی تھی۔ عام آدمی کیلئے روٹی کا حصول بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ کوڑیوں سے ہلکی کرنسی کی وجہ سے ترکی کی معیشت دنیا کے کمزور ترین ممالک میں شمار ہونے لگی تھی۔ موجودہ حکومت کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ اس نے اپنی معیشت کو سنبھالا دیا۔ غیر ضروری اخراجات ختم کیے، کرپشن اور بدعنوانی کے ناسور پر قابو پایا، درست انداز میں منصوبہ بندی کی اور امور خارجہ، بیرونی تجارت نیز ملکی صنعت کو نئے سرے سے منظم کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک لیرا نصف امریکی ڈالر کے برابر ہو گیا۔

ترک حکمرانوں کا انداز حکومت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ شام ہو یا فلسطین، ترک حکمران نہایت یکسوئی کے ساتھ مظلوموں کے حق میں آواز اٹھا رہے ہیں۔ مصر میں جنرل سیسی کی ناجائز حکومت کو اگر کسی نے آئینہ دکھایا ہے تو وہ صرف ترکی ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں مظالم کیخلاف سفارتی سطح پر چند مسلمان ممالک نے جو آواز اٹھائی ہے، اس

میں سب سے توانا آواز ترکی ہی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اسرائیل، امریکہ اور ان کے حواری ترکی کو خطرے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ترک حکومت بڑی حکمت اور جرات کے ساتھ اندرونی اور بیرونی ہر محاذ پر مثبت پیشرفت کر رہی ہے۔ عرب بہار کے بعد جس طرح عرب ملکوں میں ابھرنے والی اسلامی تحریکوں کی کامیابی شیطانی قوتوں کے ہاتھوں ناکامی میں بدل گئی ترکی کے بارے میں بھی اسلام دشمن یہی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

دنیا میں بلاشبہ ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کریے کریے اور کونے کونے سے پاکستان کے ساتھ محبت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ ترکی میں آپ کو کسی اور تعارف کی ضرورت نہیں پاکستان کا نام ہی کافی ہے آپ نام لیں اور پھر محبت کی پھوار سے مسحور ہوتے رہیں۔

ان قابلِ احترام ترک ماؤں کو سب پاکستانیوں کا سلام جو بچوں کے کانوں میں خالق کائنات کے نام کے بعد پاکستان سے پیار کی اذانیں دیتی ہیں۔ کیوں دیتی ہیں؟ اس کا جواب ترکی کی دس سالہ بچی مروبیضا نے 2010ء میں صدرِ پاکستان کو خط لکھ کر دے دیا تھا۔ انہوں نے اس خط میں لکھا تھا کہ:

> ''مسٹر پریذیڈنٹ! میں بہت چھوٹی ہوں مگر پاکستان میں سیلاب کی خبریں سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ میرے ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے مشکل وقت میں ہماری مدد کی تھی۔ اس لیے اب ہماری باری ہے کہ ہم سیلاب میں آپ کی مدد کریں۔ میں یہ خط یہ بتانے کیلئے لکھ رہی ہوں کہ ہمیں آپ کی تکلیف کی خبر مل گئی ہے۔ امداد کے طور پر میں فوری طور پر ایک سال کی جمع کردہ پاکٹ منی بھیج رہی ہوں میں مزید بھی بھیجتی رہوں گی یہ چھوٹی سی رقم قبول کرنے سے انکار نہ کیجئے کیونکہ ہم آپ کے سب سے بہترین دوست ہیں۔'' انہی دنوں انقرہ میں سفیر پاکستان کو ایک اور خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا

کہ "میرا نام خالدہ وردل ہے میں دو بچوں کی ماں ہوں اور ہم انقرہ کے نواحی علاقے میں رہتے ہیں رات کو میں کھانا بنا رہی تھی کہ ٹی وی پر دیکھا کہ پاکستان کے ہزاروں لوگ سیلاب کا شکار ہو کر بے گھر ہو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ہمارے ان تباہ حال بہن بھائیوں کے تو گھر نہیں رہے انہوں نے کھانا کیسے کھایا ہوگا مجھے شرم محسوس ہوئی کہ ہمارے ہزاروں بہن بھائی بغیر کھانا کھائے پڑے ہوں اور ہم کھانے کھائیں لہٰذا میں نے اور میرے بچوں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ماضی میں مشکل وقت میں آپ نے ہماری مدد کی تھی اب ہماری باری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس صرف ایک انگوٹھی اور کانوں کی دو بالیاں ہیں وہ میں فوری طور پر بھیج رہی ہوں گھر کی کچھ چیزیں بیچ کر مزید پیسے بھی جلد بھیجوں گی"

مندرجہ بالا دونوں مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عام ترک شہری ہم پاکستانیوں سے کس قدر پیار کرتے ہیں۔ پاکستان اور ترکی کے گہرے مضبوط اور لازوال دوستانہ تاریخی تعلقات ہیں جو دونوں ممالک کے عوام کے لئے کسی قیمتی اثاثے سے کم نہیں۔ یہ تعلقات لگ بھگ دو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں جنہیں علامہ محمد اقبالؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کی شاعری نے ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔ ترک آج بھی اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ سو سال پہلے مشکل وقت میں جب پوری دنیا ان پر حملہ آور اور سلطنت عثمانیہ کو تباہ کر لے پر تلی ہوئی تھی تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں (قیام پاکستان سے قبل) نے ہی ترکی کا ساتھ دیا تھا۔ پاکستان اور ترکی کے لازوال دوستانہ تعلقات آج کی بات نہیں بلکہ یہ تعلق سو سال پرانا ہے۔ اگر چہ دنیا بھر کے مسلمان باہم برادرانہ تعلق میں جڑے ہیں مگر ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں میں اسلامی رشتے کے علاوہ ایک خاص تعلق

اور بھی ہے جس کی ابتدا20 ویں صدی کے اوائل میں ہمارے اجداد نے کی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ترک قوم پر براوقت آیا تو یہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان ہی تھے جنہوں نے خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور اپنے ترک بھائیوں کی مدد کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اگر آج پاکستانی قوم کے دل ترکی کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور ہم ترک بھائیوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتے ہیں تو یہ اچھنبے کی بات نہیں۔ سو سال پہلے ہمارے اجداد نے ہمیں جس راہ پر چلنے کا حکم دیا تھا ہم اسی حکم کی پیروی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

عالم اسلام اس وقت ابتلا کے جس دور سے گزر رہا ہے اس میں مسلم امہ کا اتحاد ہی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہو سکتا ہے۔ روز اول سے اہل یہود مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے اور انہیں نیچا دکھانے کے لیے کوشاں ہیں اور ہماری کوتاہیوں کے سبب انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ تاہم آج کی دنیا میں پاکستان اور ترکی ہی ایسے ممالک ہیں جو اسلامی دنیا کی قیادت کرتے ہوئے اسے یہودی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہی دو ملک اسلام دشمن قوتوں کا خاص نشانہ ہیں اور ترکی میں پیش آنے والے حالیہ واقعات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔

مسئلہ کشمیر اور مسئلہ قبرص کے بارے میں دونوں ممالک ایک دوسرے کے موقف کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے حل میں مددگار ہونے اور اسے بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اجاگر کرنے میں جتنا بھرپور ساتھ ترکی نے ہمارا دیا ہے وہ کسی دیگر ملک نے نہیں دیا۔ ترکی نے بھارتی ناراضگی کی پروا کیے بغیر دنیا کے ہر فورم پر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ اسی طرح قبرصی ترک جو 1974 کی قبرص جنگ میں تنہا رہ گئے تھے صرف پاکستان نے ہی اپنے ترک بھائیوں کی طرف سے شمالی قبرص ترک جمہوریہ کا بیورو آفس کھولتے ہوئے دوستی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ اسی کی دہائی میں ترکی میں دہشت گردی کی کارروائیوں کا عروج تھا۔ مغربی ممالک دہشت گردوں کو اسلحہ سمیت ہر طرح کی امداد فراہم

کرر ہے تھے ایسے دگرگوں حالات میں پاک فوج نے ترک افواج کی بھرپور امداد کی اور اسے اسلحہ سمیت ہر طرح کا فوجی ساز وسامان پہنچایا۔

آج ترکی اور پاکستان میں سیکڑوں شعبہ جات میں بھرپور تعاون جاری ہے۔ خاص طور پر پنجاب میں وزیراعلیٰ شہباز شریف نے ترکی کے تعاون سے بہت سے منصوبے شروع کرر کھے ہیں۔موٹروے ہو یا پھر میٹرو بس سروس، ان کے انفراسٹرکچر میں ترک ہنر مندوں کی کاوشیں ہر جگہ جھلکتی نظر آئیں گی۔لاہور شہر کی صفائی کے شعبہ سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کی ذمہ داریاں بھی ترک کمپنیوں کے سپرد ہیں۔حالیہ معاہدوں کی روشنی میں ترک ماہرین ہماری صنعت کو اپنے پاں پر کھڑا کرنے میں مدو تعاون ثابت ہوں گے۔

مستقبل میں ترکی کے تعاون سے ٹیکسٹائل کو دنیا میں مزید وسعت دی جائے گی۔انرجی سیکٹر میں ترکی پہلے ہی خاصی امداد فراہم کرر ہا ہے۔ ترک تاجر آئندہ تیل وگیس کی تلاش، ہاؤسنگ کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر آئل ریفائنریز کے قیام، زراعت اور ڈیری کے شعبے میں سرمایہ کاری کریں گے جس سے پاکستان میں پڑھے لکھے طبقے سمیت ہنرمند اور پاکستانی مزدوروں کو روزگار ملے گا۔ پاکستانی حکومت ترکی کے کم لاگت کی تعمیر کے ہاسنگ منصوبے جیسے پراجیکٹس بھی پاکستان میں شروع کرنے کی متمنی ہے تاکہ آئندہ پانچ سالوں میں کم آمدنی والے 5 لاکھ خاندانوں کو چھوٹے گھر مہیا کئے جاسکیں۔غرضیکہ کہ فی الوقت دونوں ممالک مختلف شعبہ جات میں ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کرر ہے ہیں۔

پاک ترک تعلقات میں مزید مضبوطی لانے اور دونوں اقوام کو مزید قریبی بندھن میں باندھنے کے لیے ان میں باہم خونی رشتوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔اس سلسلے میں دونوں ممالک کے نوجوانوں میں باہمی شادیوں کو رواج دیا جانا چاہیے جس سے دونوں اقوام مذہبی اور قومی دوستی سے بڑھ کر ایک قوم میں تبدیل ہو جائیں گی اور یہ ایک ایسی قوم ہو گی جسے دنیا کی کوئی طاقت کسی محاذ پر شکست نہیں دے سکے گی۔اس سلسلے میں حکومتی سطح پر

پہل کی ضرورت ہے اور دونوں ممالک کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ سرکاری سطح پر ایسی مہم کا اہتمام کریں جس کے نتیجے میں ترکی اور پاکستان میں رشتے قائم ہوں اور انہیں مزید فروغ مل سکے۔ مسلمان ہونے کے ناطے دونوں اقوام پہلے ہی بھائی چارے کے رشتے میں بندھی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ رشتہ مزید مضبوط ہو جائے۔

سیاسی میدان میں بھی ہمیں ترکی کی مثال مدنظر رکھنا ہوگی۔ آج اسلامی دنیا کے کروڑوں باشندوں کی نظریں کسی شخصیت کی جانب اُٹھتی ہیں تو وہ طیب اردوآن ہے۔ جن کا عوامی انقلاب کے بعد انقرہ کے تقسیم سکوائر میں قوم کے ہیرو اور نجات دہندہ کی طرح استقبال ہوا۔ اب عرب دنیا کے نوجوان اور دانشور امریکہ اور روس کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ وہ ترکی اور اسکے مقبول ترین وزیراعظم اردوآن کو اپنا رول ماڈل سمجھتے ہیں۔

طیب اردوآن اوائل عمر سے ہی مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہیں وہ نوجوانی میں قومی سطح کے فٹ بالر تھے مگر ملکی ٹیم میں اسلیئے شامل نہ ہو سکے کہ انہوں نے اسوقت داڑھی منڈوانے سے انکار کر دیا تھا۔ 1994 میں وہ استنبول کے میئر منتخب ہوئے تو میٹروپولیٹن میونسپلٹی کے ذمے دو ارب ڈالر کا قرضہ تھا۔ انہوں نے قرضہ اُتارنے کے بعد چار ارب ڈالر شہر کی ترقی پر خرچ کر کے استنبول کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ پانی کی کمیابی کا مسئلہ سینکڑوں کلومیٹر نئی پائپ لائنیں بچھا کر حل کیا۔ گندگی اور ویسٹ میٹریل اٹھانے کیلیئے دنیا کی بہترین ری سائیکلنگ سہولت مہیا کر دی، فضائی آلودگی کو ختم کیا، ماحولیاتی آلودگی ختم کرنے کیلیئے سڑکوں پر گیس سے چلنے والی ہزار ہا نئی بسیں اتار دیں۔ آبادی کے اژدھام کے باعث کئی کئی گھنٹوں ٹریفک جام معمول بن چکا تھا۔ خدمت کے جذبوں سے سرشار اردوآن نے صرف استنبول میں پچاس نئے پل اور درجنوں نئی شاہراہیں بنا دیں۔ بے داغ کردار کے حامل میئر نے کرپشن کو کنٹرول کیا اور اپنی دیانت، محنت اور حکمت سے استنبول جیسے مشکل شہر کو دُنیا کے بہترین اور اور خوبصورت ترین شہروں کے برابر لا کھڑا کیا۔ 2002ء میں قومی قیادت منتخب

کرنے کا مرحلہ آیا تو قوم نے قیادت کا تاج طیب اردگان کے سر پر سجا دیا۔ انکی پارٹی اے کے پی 550 کے ایوان میں 363 نشستیں لیکر جیت گئی۔

2002ء میں 34%، 2007ء میں 41% اور 2011ء میں 50% ووٹ لے کر طیب اردوآن نئے جذبوں اور ولولوں کے ساتھ قیادت اور خدمت کے سفر پر گامزن ہیں۔ انسانی تاریخ اور مشرق و مغرب کے فلسفوں پر نظر رکھنے والے دانائے راز اقبال نے سو سال پہلے کہا تھا کہ سیاست سے دین کا عمل دخل ختم ہوگا تو چنگیزی اور درندگی رہ جائیگی اسلئے کہ صرف آسمانی تعلیمات ہی ہماری حیوانی جبلتوں کو لگام دیتی ہیں۔

طیب اردوآن کا ترکی آج یورپ کی چھٹی اور دنیا میں چین کے بعد سب سے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرتی ہوئی معیشت ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اسلئے ہے کہ وہ ایک سجدہ جسے ہم گراں سمجھتے ہیں باقی تمام سجدوں اور غلامیوں سے نجات دلا دیتا ہے صرف ایک مالک کی اطاعت انسانوں میں خودی اور خودداری پیدا کرتی ہے اور یہی خودداری انہیں منزل کا پتہ دیتی اور سمت کا تعین کرنے میں راہنمائی کرتی ہے۔ یہ اسلئے بھی ممکن ہوا کہ ترکی کی سیاسی قیادت اخلاص اور دیانت کے اوصاف سے مالا مال ہے۔ طیب اردوآن آج بھی ایک عام سے فلیٹ میں رہتے ہیں، ان کا کسی غیر ملک میں سرمایہ نہیں ہے اور ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترکی مسلم دنیا کی قیادت کا حقدار اور طیب اردگان بلاشبہ عالم اسلام کے قائد تسلیم کیے جاتے ہیں۔

حال ہی میں ترک قوم نے اپنے جذبہ جمہوریت کے ذریعے اپنے مُلک میں فوجی بغاوت کی کوشش ناکام بنا دی ہے، عوام ایسے وقت میں جانوں کی پروا کئے بغیر صدر طیب اردوآن کی اپیل پر سڑکوں پر نکل آئے جب صورتِ حال واضح نہیں تھی، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ بغاوت کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے، باغی فوجی صدر طیب اردوان کے بہت قریب پہنچ گئے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ عوام کے پہنچنے سے پہلے صدر کو حراست میں لے کر اُن کے

بارے میں کوئی ایسا جذباتی فیصلہ کردیتے جس کا ازالہ ممکن نہ ہوتا اور جس کا نتیجہ کچھ بھی برآمد ہوسکتا تھا۔ ایسی صورت میں تاریخ ایک دوسرا موڑ مڑ جاتی تاہم جب عوام تک طیب ایردوآن کی آواز پہنچ گئی اور مساجد سے اذانیں دی جانے لگیں جو مصیبت کی گھڑی کا اشارہ تھا تو عوام نے اپنے رہنما کی آواز پر لبیک کہنے میں دیر نہیں لگائی اور لمحوں میں اپنا مضبوط ردعمل اِس انداز میں ظاہر کردیا کہ پانسہ باغیوں کے خلاف پلٹ گیا۔

فوج کے جن عناصر نے بغاوت کی تھی اُن کے ارادے کیا تھے اور کیا ہونے چاہئے تھے اِس بارے میں تو کوئی ابہام نہیں، وہ ہتھیار بند بھی تھے، ایک تصویر میں عوام ایک باغی فوجی پر قابو پانے کے بعد پتلون کے ساتھ پہنی جانے والی بیلٹ اُتار کر اُسے پیٹتے دکھائے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عوام کسی تیاری اور کسی متوقع مقابلے کے احساس کے بغیر محض لیڈر کی کال پر باہر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں جس چیز نے فتح دلائی اُسے جذبے کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ وہ ٹینکوں کے مقابلے خالی ہاتھ گھروں سے نکلے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ طیب ایردوان تسلسل کے ساتھ الیکشن جیتنے کے بعد ایک مضبوط لیڈر کے طور پر اُبھرے ہیں اور مُلک میں اُن کے حامیوں اور پیروکاروں کا ایک وسیع حلقہ ہے تاہم اُن کے مخالفین کی بھی کمی نہیں اور مخالفین بھی وہ ہیں جو اُن کے خلاف پُرتشدد مظاہرے کرکے اپنی قوت کا اظہار بھی کرچکے ہیں اور اُن کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کا موقع بھی ضائع نہیں کرتے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فوجی بغاوت کی خبر پاکر ایردوان کی اپیل پر جو لوگ سڑکوں پر آئے اُن میں اُن کی مخالف سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے جمہوریت اور جمہوری نظام کے حق میں اپنا کردار ادا کیا، وہ ایردوآن کے حامی نہ بھی ہوں جمہوری نظام کے حامی ضرور ہیں اور سیاست میں فوج کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ معروضی حالات میں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ طیب اردوان کے حامیوں اور مخالفوں نے مل کر جمہوریت کو بچانے میں اپنا تاریخی کردار ادا کیا

ہے۔آج پاکستان کو جن حالات کا سامنا ہے ان میں سیاست دانوں کو باہمی اختلاف بھلا کر ترک قوم کی طرح اکٹھے ہونا ہوگا اور اسی صورت میں ہم کامیاب ٹھہریں گے۔

اس وقت ترک قوم ایک مرتبہ پھر اپنی تاریخ کے ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے اور اسے بحرانی کیفیت سے نکلنے کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔ ایسے میں پاکستان ہی اس کا واحد ایسا دوست ملک ہے جو موجودہ مشکل حالات سے نکلنے میں اس کی مدد کرسکتا ہے۔ میں حکومت پاکستان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نا صرف اس خاص موقع پر بلکہ عمومی حالات میں بھی ترکی کے ساتھ معاشی، تجارتی، سماجی، فوجی اور خونی رشتوں کو فروغ دینے کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔ خاص طور پر اس وقت ترکی کو خوراک کی قلت کا سامنا ہے اور اقتصادی حالات دگرگوں ہونے کے باعث اسے آنے والے وقت میں اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کے لیے بھرپور معاشی تعاون کی ضرورت ہے جس کے لیے پاکستان کو کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھنا چاہیے۔ آج ترکی کو ہماری ویسی ہی ضرورت ہے جیسی سو سال پہلے تھی۔ اس موقع پر ہمارے آباواجداد نے دامے درمے سخنے ترک قوم کی مدد کی اور تحریک خلافت کی صورت میں پورے برصغیر میں مسلمانوں کو اپنے ترک بھائیوں کی مدد کے لیے متحرک کر دیا تھا۔ اگر آج ہم ترکی کی مدد کریں گے تو یہ ہمارا ان پر احسان نہیں ہوگا بلکہ ہم اپنے اجداد کے احکامات اور تعلیمات پر عمل کر رہے ہوں گے۔

ترکی کے ساتھ قریبی تعاون کو مزید فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کامیاب قوم سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اگر ہم ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ترکی سے بڑی مثال اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس قوم نے زوال کی گہرائیوں سے نکل کر جس طرح ترقی کی منازل طے کیں اور آج کے پرآشوب میں جس طرح مضبوطی سے قائم ہے اس میں ہمارے لیے بہت سے اسباق پوشیدہ ہیں۔

☆......☆☆☆......☆

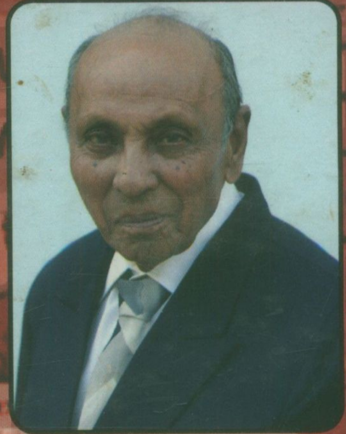
حوالہ:

اس کتاب کے پانچویں باب میں لیاقت علی خان کی شہادت سے متعلق بیان میں بی بی سی اردو کی جاری کردہ معلومات سے استفادہ کیا گیا جبکہ تیرہویں باب میں پاک امریکا تعلقات کی تاریخ میں بعض واقعات ڈان ڈاٹ کام میں شائع ہونے والے مضمون سے ماخوذ ہیں۔

The Tribune

BANGLADE[SH]

UNCONDITIONAL SURRENDER BY PAK TROOPS



غالب احمد یار خان آزادی سے قبل راجستھان میں پیدا ہوئے اور اوائل بچپن میں پاکستان ہجرت کی۔ عنفوانِ شباب لاہور میں گزرا، رسمی تعلیم اور علم و ادب سے رغبت اسی شہر میں پائی۔ ملک و قوم کی ترقی کے لیے ہر ممکن کردار ادا کیا اور صنعتی شعبے میں نمایاں مقام و احترام کے حامل ٹھہرے۔ زیرِ نظر کتاب میں پاکستان کی 70 سالہ سیاسی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ پیش ہے۔

15 PAK TANKS DESTROYED

فکشن ہاؤس

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

e-mail:fictionhouse2004@hotmail.com

ISBN 978-969-562-463-0

